الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کردی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں۔ پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں، ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:- اس کتاب میں مولانا کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدا کی قسموں کا عمود سورہ (دینونتہ) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے۔ اسی ضمن میں تمام امم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موقع عبور اور طریقۂ عبور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "خلق" سے معاد اور "خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں انکی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت:- ۸ر (باقی سرورق صفحہ ۳ پر ملاحظہ ہو)

جلد ۲ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۷ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

شذرات

یاد ہوگا، مارچ کے الاصلاح میں، پنجاب کے ایک رسالہ پر، جو قربانی سے متعلق تھا چند لفظوں میں ہم نے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ اسکی نسبت سندھ سے ایک "طالب حق" نے، جو مسلمان ہیں اور ماشاء اللہ عربی۔ اے پاس، ہم کو ایک خط لکھا ہے۔ موصوف کو شکایت ہے کہ رسالہ مذکور پر ہماری تنقید نہایت غیر تشفی بخش تھی، اس سے غلط فہمیاں رفع نہیں ہوئیں ہمیں چاہیے کہ اس مضمون کی مفصل تردید لکھیں اور رسالہ مذکور کے مصنف نے جو دلائل قائم کیے ہیں، قرآن سے ان کے جوابات دیں۔

موصوف کے لمبے چوڑے خط کا یہ ایک اجمالی خلاصہ ہے، جو ہم نے اپنے لفظوں میں بیان کردیا ہے، باقی اصل خط میں بہت کچھ ہے۔ وہ اگر شائع کیا جائے تو بہت پر لطف ہوگا۔ اسمیں طعن و تشنیع ہے۔ اشارہ و کنایہ ہے، ظرافت و مزاح ہے، بلاغت و انشا ہے، غرض سبھی کچھ ہے اور ساتھ ہی اسمیں صاحب خط نے اپنی مذہبی واقفیت اور علمی وسعت نظر کے ثبوت میں بعض ایسے نوادر و غرائب بھی جمع کر دیئے ہیں جن پر وہ پوری طرح داد و تحسین کے مستحق ہیں۔

بلائے جاں ہے غالب اسکی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

لیکن ہم بالقصد اس کو نظر انداز کرتے ہیں کہ الاصلاح کے صفحات اگر اسطرح کی چیزوں سے آلودہ نہ ہوں تو اچھا ہے۔

فاضل موصوف نے اپنے خط میں بعض سوالات بھی قائم کر دیئے ہیں اور ہم سے ان کے جوابات کا مطالبہ کیا ہے انشاء اللہ آیندہ کسی فرصت میں، ان سوالات پر ہم تفصیل کے ساتھ لکھینگے۔ اسوقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ رسالہ قربانی پر ہم نے جو کچھ لکھا تھا وہ محض دو لفظوں میں اظہار رائے تھا، کوئی تردیدی یا تحقیقی مقالہ نہ تھا جسکے متعلق تشفی بخش یا غیر تشفی بخش ہونیکا سوال

پیدا ہو۔ اور سچ یہ ہے کہ وہ مضمون اس سے زیادہ توجہ کا مستحق تھا بھی نہیں۔ اسمیں ایک بات بھی ایسی نہ تھی جسکو آپ "استدلال یا ثبوت" کے لفظ سے تعبیر کر سکیں۔ اسکی غلطیاں بالکل کھلی ہوئی تھیں، اور ایک شخص جسمیں نقد و نظر کی معمولی صلاحیت بھی ہو بے تکلف اسکی تمام کمزوریوں کو پکڑ سکتا تھا۔ لیکن ہمارے فاضل دوست کہتے ہیں کہ "چونکہ اسمیں قرآن مجید، احادیث شریف اور اقوال متقدمین سے استدلال کیا ہے اور تراجم بھی مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہم ترجموں کے دیئے ہیں اسلئے ....۔" حالانکہ ہم نے پورا مضمون پڑھا ہے اسمیں ایک بات بھی اس قسم کی نہیں ہے۔ سرسید مرحوم نے، اللہ انکو معاف کرے، اپنے زعم اجتہاد میں ایک فضول سی بات لکھ دی تھی اسی کو لیکر مضمون نگار نے اس پر اپنی تحقیقات کا روغن چڑھا دیا ہے۔ باقی اس کے علاوہ اسمیں کوئی بات ایسی نہ تھی جو قابل اعتنا ہو۔ رہے قرآن مجید کے ترجمے تو یہ تو ایسی چیز ہے جسکو فاضل موصوف خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سرسید اور ان کے بعض اندھے مقلدین کے علاوہ وہ کسی ایک ہی مترجم کا نام بتادیں جس نے اپنے ترجمہ یا تفسیر میں ان مزخرفات کی تائید کی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ لکھا ہے، ہمیشہ اردو میں لکھا ہے، آپ خود دیکھ لیں کہ انکی کس تحریر سے وہ نتائج نکلتے ہیں جو رسالہ "تحقیق قربانی" کے لکھنے والے نے نکالے ہیں۔ آپ کو مذہبی تحقیقات کا کچھ ذوق ہے تو للہ کچھ زحمت بھی اٹھائیے، یہ کیا کہ جس نے جو بکواس کر دی اس سے غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے اور پھر علماء کے جبس تقلید پر خطبہ دینے لگے۔

ہر شخص کو اپنے دائرہ کے اندر رہکر کام کرنا چاہیئے۔ مذہب کے متعلق آپ کو خود اعتراف ہے کہ آپ کو کوئی علم و واقفیت نہیں ہے ایسی حالت میں مذہبی معاملات میں آپکے لیئے مامون راہ یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کی کتابیں اور تحریریں پڑھیں جنکو مذہبی معاملات پر غور کرنے اور سوچنے کا کچھ حق ہے۔ خواہ مخواہ کو اپنے تئیں فتنوں اور آزمائشوں میں نہ ڈالیں۔ آپ کی مذہب سے بےخبری کا یہ عالم ہے کہ آپ قرآن مجید کی ایک چھوٹی سی آیت، جو ہر مسلمان بچہ کو یاد ہوگی، صحیح نہیں لکھ سکتے، پھر آپسے کس نے کہا کہ آپ قربانی کے اسرار و فلسفہ کی تحقیقات میں سرگرداں ہوں۔ اور اس کے متعلق عہد حاضر کے محققین کی فتنہ انگیز تحریروں کا مطالعہ فرمائیں۔ جب آپکے والدین نے آپ کو دینی تعلیم نہیں دلائی اور آپ بھی بدقسمتی سے اسکی طرف متوجہ نہ ہوسکے تو آپ

کیلئے اور ان تمام دوستوں کیلئے جو آپ کی سی حالت رکھتے ہوں، ہمارا ناچیز مشورہ یہی ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں قناعت اور پیروی سلف کی راہ اختیار کریں اور زیادہ تحقیق و تجسس میں نہ پڑیں۔ اگر پڑیں تو اس مشکل کو کسی قابل اعتماد رہنما کی رہنمائی میں طے کریں خود حل کرنے کا حوصلہ نہ کریں، ورنہ دل کی کوئی خلش دور تو کیا ہوگی، البتہ بہت سے نئے کانٹے اور چبھ جائیں گے، اور یہ حالت پہلی حالت سے بھی زیادہ افسوسناک ہوگی۔ معاف کیجئے گا، اس سے آپ کو تکلیف ہوگی، اور اس تقلید کی دعوت سے خود ہم کو بھی روحانی اذیت ہے لیکن کیا کیجئے کہ اس کے سوا کوئی راہ نہیں۔ دو برائیوں میں سے جو ہلکی ہے دانشمندی یہی ہے کہ اسی کو اختیار کیجئے۔

وبعض الشر اھون من بعض

قربانی کا مقصد محض یہ قرار دینا کہ وہ مکہ معظمہ میں حجاج کے کھانے کھلانے کیلئے ہے، قرآن و حدیث سے انتہائی بیخبری ہے۔ اور یہ بات صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جس نے قرآن مجید کی روشنی میں قربانی کے معاملہ پر ایک دن بھی غور نہ کیا ہو۔ قرآن مجید میں جن مقامات میں قربانی کا ذکر آیا ہے ان سب کو جمع کر کے سامنے رکھ لیجئے تو معاملہ کی اصل نوعیت آشکارا ہو کر در اصل قربانی کیا چیز ہے۔ اور ہماری اسلامی زندگی کے تحفظ و بقا میں اس کو کونسا مقام حاصل ہے۔ اسوقت آپ کو یہ بات نظر آئیگی کہ جس چیز کو آپ اس کا اصلی مقصد قرار دے رہے ہیں، وہ اس کے بیشمار ضمنی فوائد میں سے ایک چھوٹا سا فائدہ ہے اور قرآن مجید کے الفاظ اس حقیقت کا صاف صاف پکار کر اعلان کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ قربانی کے مخالفین یا تو قرآن کی صدائیں سنتے نہیں یا سنتے ہیں تو سمجھتے نہیں اور نتیجہ کے لحاظ سے دونوں حالتیں یکساں افسوسناک ہیں۔

جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے انھوں نے نہ صرف یہ کہ قرآن کا سمجھکر مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ قربانی کی قدیم تاریخ اور اس کی نسبت عام ارباب فکر و نظر کے آراء و افکار کو بھی کبھی جاننے کی خواہش نہیں کی ہے۔ ورنہ قربانی کے متعلق یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ دین کے ان احکام و اوامر میں ہے جو خدا اور بندہ کے مابین مخصوص ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں غالب پہلو روح کی تطہیر و تزکیہ کا ہوتا ہے، مادی فوائد و مصالح انمیں بالکل ضمناً و تبعاً ہوتے ہیں۔ اس بات کو وضاحت سے سمجھنے کیلئے نماز اور زکوٰۃ کی مثال فرض کیجئے۔ یعنی ایک تو وہ احکام ہیں جو از قبیل نماز ہیں یعنی بندے کو خدا سے جوڑتے ہیں اور دوسرے وہ احکام ہیں

جو از قبیل زکوٰۃ ہیں اور بندے کو بندے سے جوڑتے ہیں۔ یہ بات بلحاظ غالب پہلو کے کہی گئی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نماز میں بندوں کو بندوں سے جوڑنے کے مصالح نہیں ہیں یا زکوٰۃ بندہ کو خدا سے نہیں جوڑتی ہے، منشا محض اسقدر ہے کہ دین کے تمام احکام دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں جنکا رخ بندوں کی طرف ہے دوسرے وہ ہیں جنکا جھکاؤ خدا کی طرف ہے۔ اب غور کرنا چاہئے کہ قربانی کا شمار ان دونوں قسم کے احکام میں سے کس قسم میں ہے؟ مختلف مذاہب کے اہل تحقیق نے قربانی کی تاریخ اور مختلف ادوار میں اس کی مختلف اشکال و صور پر غور کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ یہ دین کے ان احکام میں سے ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان مخصوص ہوتے ہیں۔ پس عام مادی فوائد کا لحاظ اس میں اصلاً نہیں ہے۔ محض ضمناً و تبعاً ہے۔ کاہن اس کا گوشت کھالیں، ہیکل کے خدام اس کی کھال سے فائدہ اٹھالیں، حجاج و زائرین، اس پر سوار ہولیں، اس کا دودھ پی لیں اور بقدر حاجت اس کے گوشت سے متمتع ہولیں۔ یہ باتیں جائز ہوں گی لیکن یہ نہیں کہا جائیگا کہ بس یہی چیزیں قربانی کا اصل مقصد ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو بالکل غلط سمجھتا ہے۔ اسوقت یہ مجمل حقیقت پیش نظر رکھئے ان شاء اللہ بہت جلد اس کی تفصیلات آپکے سامنے آئیں گی

آپ کو شاید اس حقیقت سے انکار نہ ہو کہ قوموں کی زندگی میں اصلی عامل ان کے عقائد و افکار ہیں، انہی سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں، انہی سے دبتی اور ابھرتی ہیں اور انہی سے مرتی اور جیتی ہیں۔ اگر کوئی قوم پست ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس کے عقائد و تخیلات پست ہیں۔ اگر کوئی قوم بلند ہے تو اسکی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسکے تصورات و افکار بلند ہیں۔ مذہب نے تو تصور و عقیدہ کو اس درجہ اہمیت دی ہے کہ بغیر اسکے اسکے نزدیک زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی دونوں کی بنا اور روح عقیدہ کی برتری اور بلندی کو سمجھتا ہے۔ ہم اور آپ مذہب کے بلند مطمح نظر سے اتر کر اگر تھوڑی دیر کیلئے انفرادی زندگی کو ایک ایسی چلتی پھرتی چھاؤں فرض بھی کریں جو عقیدہ اور نصب العین کی روح سے خالی ہو، تو اجتماعی زندگی کے اندر تو یہ چھاؤں بھی نظر نہیں آسکتی۔ اس دائرہ کے اندر تو زندگی کی نمود اسوقت تک ناممکن ہے جبتک عقیدہ یا نصب العین یا تخیل کے نام سے کوئی چیز وجود میں نہ آئے۔ اس بحث کو چھوڑ دیجئے کہ وہ عقیدہ یا تخیل اچھا ہے یا برا، بلند ہے یا پست، نافذ اور طاقتور ہے یا عاجز و مغلوب، وسیع و ہمہ گیر ہے یا تنگ اور محدود۔ کسی طرح کا ہو، کسی نوعیت کا ہو، اسمیں ایمان کی پاکی نہ ہو، نہ سہی، شرک و کفر کی آلودگی ہی ہو

جو کچھ ہو، مگر ہو ضرور، بغیر اسکے اجتماعی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ اجتماعی زندگی کی بنیادی اینٹ تخیل اور نصب العین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر تخیل بلند و برتر ہوگا تو اسکی بنیادوں پر ایک وسیع عمارت تیار ہو جائیگی۔ اور اگر پست اور گھٹیا ہوگا تو اس پر صرف ایک چھوٹا سا جھونپڑا تعمیر ہو سکے گا۔ قومی زندگی اس چیز کی اس درجہ محتاج اور بھوکی ہے کہ اگر آپ اسکو کوئی صحیح چیز نہ دینگے تو کوئی غلط ہی چیز اٹھا لیگی، اگر اسکو خدا نہ ملے گا تو شیطان ہی سے دل لگا لیگی۔ اگر اسکے پیش نظر دنیا کی عالمگیر محبت کا مطمح نظر نہ ہوگا تو اپنی گز بھر زمین کو، جسکا نام اس نے وطن رکھ چھوڑا ہے معبود بنا لیگی۔ غرض اسکے بغیر وہ صبر نہیں کر سکتی۔ وہ یا تو تندرست ہوگی یا بیمار۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل نہیں ہے۔

اجتماعی زندگی کا یہ پہلا قدم ہوا۔ اس راہ کا دوسرا قدم یہ ہے کہ اس نصب العین اور عقیدہ کیلئے قوم میں فدویت اور قربانی کا جذبہ ہو ..... یہی جذبہ ہے قومی زندگی کی اصلی روح ہے۔ یہ جذبہ قوم کے اندر جسقدر پرجوش اور طاقتور ہوگا اسیقدر قوم بڑھیگی اور پھیلیگی، جب یہ جذبہ مضمحل ہو جائیگا، قوم مضمحل ہو جائیگی، جب دب جائیگا قوم دب جائیگی، جب مردہ ہو جائیگا، قوم مردہ ہو جائیگی۔ اور اسی ترتیب کے ساتھ جس درجہ اور کیفیت میں یہ جذبہ زندہ ہوگا زندہ بھی ہو جائیگی۔ غرض قومی زندگی کی موت وحیات کا انحصار صرف قربانی کے جذبہ اور ولولہ پر ہے۔ اس کا تلاطم بند ہوا اور حیات ملی کے تمام سوتے خشک ہوئے، دنیا کی تمام قومیں اسی جذبہ سے زندہ رہی ہیں اور آئندہ اسی سے زندہ رہیں گی۔ یورپ ہو یا ایشیا، برطانیہ ہو یا فرانس، ٹرکی ہو یا ایران، چین ہو یا جاپان اور پھر اسلام ہو یا نصرانیت سب کی زندگی اسی سے ہے۔ اور چونکہ زندگی اسی سے ہے اسلئے یہ زندگی سے زیادہ عزیز ہے اور قومیں اسکے حاصل کرنے کیلئے بڑی بڑی قیمتیں دیتی ہیں، اسکو یاد رکھنے کیلئے تہوار مناتی ہیں، جو لوگ اس جذبہ کے زندہ رکھنے کیلئے جانبازیاں اور سرفروشیاں کرتے ہیں، ان کے کارناموں کی یاد میں، یادگاریں اور اسٹیچو قائم کرتی ہیں اور پھر ان کے بت بنا کر پوجنے لگتی ہیں اور مال و دولت تو کیا چیز ہے اپنے دل کا ایمان و اعتقاد جس سے بڑھکر اس آسمان کے نیچے کوئی چیز نہیں، ان کے حوالہ کر دیتی ہیں چنانچہ آپنے سنا ہوگا کہ "اسٹالین روس کا وہ سورج اور دیوتا ہے جس سے پورا روس روشنی اور زندگی حاصل کرتا ہے"۔

یہ گفتگو عمومی حیثیت سے تھی، باقی رہا اسلام تو اپنے تخیل اور طریق عمل ہر چیز میں پاکی اور بلندی کے آخری نقطہ پر ہے۔ اس کا

تخیل اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے بعد کوئی وسعت نہیں، اور اس کا طریق عمل اتنا پاکیزہ ہے کہ اس میں آمیزش کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے نہ صرف پچھلی غلطیوں کی اصلاح کی بلکہ آئندہ غلط فہمیوں کے دروازے بھی بند کر دیئے۔ ایک مسلم کا نصب العین یہ ہے کہ "انی وجہت وجہی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین"۔ اور پھر اس نصب العین کیلئے اس کی فداکاری اور جاں نثاری کا عالم یہ ہے کہ "ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔" ہماری اجتماعی وانفرادی زندگی کے دونوں مرحلے ایک ہی آیت نے بتا دیئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ ہماری مجازی آنکھیں چاہتی تھیں کہ اس حقیقت کی کوئی مجازی تمثیل بھی ہو جس کے اندر ہم اس حقیقت کو مشہود دیکھ لیں۔ تو ہمارے خدائے عزیز و علیم نے اس کی تمثیل کیلئے اس آسمان کے نیچے کا وہ ایک ہی واقعہ منتخب کر لیا جس سے بڑھ کر کوئی واقعہ نہ تھا۔ یعنی فلما اسلما وتلہ للجبین والا واقعہ جس میں ایک مقدس زندگی نے اسلام یعنی گردن نہادن بطاعت کی پوری حقیقت دنیا کو دکھا دی تھی، پس تقدیر الٰہی کا فیصلہ یوں ہوا کہ ایک ایسی امت وجود میں آئے جس کی تعمیر اس قربانی کے خون سے ہوئی ہو، جس کا ہر فرد اس قربانی کی ایک مجازی تمثیل ہو۔ جس کے ہر وجود کی زندگی اور موت خدا کیلئے ہو۔ جو ہمیشہ اس قربانی کو یاد رکھے، اور اپنی طرف سے ایک محبوب جاندار کی قربانی کر کے یہ اقرار ہمیشہ تازہ رکھے کہ "اے پروردگار ہماری جانیں، ہماری ملکیت نہیں ہیں، تیری ملکیت ہیں۔ ہم آج ہی ان پر چھری چلا دیتے لیکن تیرے حکم سے اس محبوب جانور کے بدلے ہم آج ان کو چھڑا لیتے ہیں۔ لیکن جب تیرا حکم ہوگا ان کو تجھ سے دریغ نہ رکھیں گے"۔

خدارا اس قربانی پر غور کیجئے۔ کیا یہ ہماری اسلامی زندگی کی بنیاد نہیں ہے؟ کیا اس کے بغیر بھی ہم دنیا میں زندہ رہ سکتے ہیں؟ اور پھر انصاف سے فرمایئے کہ ہم اپنی اس مادی زندگی کی عیاشیوں کو باقی رکھنے اور زبان کے چٹخاروں کے لئے تو جانوروں کے ذبح کرنے اور ان کی کھالیں ادھیڑنے کو عین حق و ثواب سمجھیں اور کہیں کہ اس سے ہماری زندگی کا بقا ہے۔ لیکن جب وہی جانور ہماری قومی و اجتماعی زندگی کی اصلی روح اور حیات کو اپنے خون سے سیراب کرنے کیلئے ذبح کئے جائیں تو آپ پکار اٹھیں کہ یہ بیلک الانس میں داخل ہے۔ بتایئے اس عہد کی ابلہ فریبیوں پر کوئی روئے یا ہنسے! کیسی دردانگیز صورت حال ہے کہ اگر کروڑوں جانوروں کو کاٹ کر ہم اپنے ان پیٹوں میں بھر لیں جن میں ایمان اور خدا پرستی کی ایک کرن بھی نہیں گذرتی۔ اور جن کے پیدا کئے ہوئے خون میں ایک قطرہ بھی ہمارے خدا اور دین کا نہیں ہے تو وہ تو حق و ثواب ٹھہرے لیکن اگر یہی جانور ہمارے روح و دل کی زندگی، ہمارے عہد کے اقرار، ہمارے ایمان و اسلام کی تعمیر، ہمارے اصلی

مغضوب علیہم کی تذکیر کیلئے ذبح ہوں تو بربادی اور خسارہ ہے ۔ یا للعجب

آپ کہیں گے کہ اس قربانی کے اگر یہ مقاصد ہیں تو مسلمان بام ثریا پر کیوں نہیں پہنچ جاتے ؟ لیکن انصاف سے غور کیجئے تو آپ کا اعتراض کسقدر بیجا ہے ۔ بلاشبہ قربانی کے مقاصد یہی ہیں لیکن آپ قربانی کرتے کب ہیں ، آپکے ہاتھ میں تو قصائی کی چھری ہے آپ اسے ایک گائے کی گردن پر رکھ دیتے ہیں ۔ حالانکہ قربانی کیلئے شرط یہ ہے کہ سینہ میں براہیم کا دل اور پنجوں میں اسمٰعیل کی چھری ہو ۔ ایک مرتبہ یہ قربانی کر کے دیکھئے اور پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے !

قربانی ہی کی کیا خصوصیت ہے ۔ اسلام کے تو تمام احکام بلندیوں ہی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ، ان میں سے ایک بھی نہیں جو مسلمانوں کو موجودہ حضیض ذلت میں پہنچانیوالا ہو پھر یہ کیوں ہے کہ مسلمان برابر گرتے ہی جارہے ہیں ؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلام یکسر غلط ہے اور اس کی جگہ کوئی نیا دین اختیار کرلیا جائے ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر غفلت وذہول کا دور ہے ۔ ان کا خزانہ ان کے پاؤں کے نیچے دبا ہوا ہے اور وہ اس پر کھڑے ہوئے بھیک مانگ رہے ہیں ۔ انتظار کیجئے کہ ان کی آنکھوں کی پٹی کوئی کھول دے ۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ یہی قربانی جس کو آج مہلک النسل میں داخل سمجھتے ہیں ، قومی زندگی کا سرچشمہ بن گئی ہے ۔

آپ نے ازراہ طعن الاصلاح کے ایک مضمون کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں جاپانیوں کے جذبہ قربانی کے بعض واقعات بیان ہوئے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے آپ جاپانی قوم سے بھی بالکل ناواقف ہیں جب آپ جاپان کے حالات پڑھیں گے تو آپ پر عجیب عجیب حقیقتیں روشن ہونگی ۔ جاپان کی تمام زندگی کا راز درحقیقت چند توہمات ہیں ، جن پر آپ جیسے عقلاء ہنسیں گے لیکن جاپانی قوم باہمہ علم وعرفان تمام توہمات کو باقی رکھنا چاہتی ہے کیونکہ بغیر ان توہمات کے قوم کے اندر قربانی کا جذبہ زندہ رکھنا ناممکن ہے ۔ یہی ہندوستان میں ہندو بھی کر رہے ہیں ۔ البتہ آپ لوگوں پر افسوس ہے کہ آج گہر کو پھینکینگے اور کل پشیز کو طرہ فخر بنائیں گے ۔ باتیں بہت سی کہنی تھیں ، گنجائش نہیں باقی رہی ، انشاء اللہ آئندہ ۔

معارف القرآن

تفسیر سورۃ الشمس

۳

تالیف:- استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رح

ترجمہ:- امین احسن اصلاحی

قریش اور ثمود

۷- دوسری فصل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں قریش کے لئے ایک عام انذار و تخویف ہے اور روئے سخن خصوصیت کے ساتھ ابولہب کی طرف ہے۔ اب تھوڑی دیر توقف کر کے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ قریش اور ثمود میں مناسبت کیا ہے؟

یہ معلوم ہے کہ قریش تمام عرب کے سردار تھے اور ان کے منصب کی عظمت اور ان کی عام ذہنی بلندی نے پورے ملک میں انکو ایک نہایت نمایاں تفوق اور برتری کی جگہ دے دی تھی اور عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی حیثیت کسی زمانہ میں ثمود کو بھی حاصل تھی۔ ثمود عاد کے بقایا میں سے ہیں اور ان کی تمدنی اور صنعتی برتری اس درجہ مسلم تھی کہ عرب ان کے تمدنی تفوق کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ خود قرآن مجید ان کا ذکر ایسے انداز سے کرتا ہے جس سے ہمارے بیان کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُودَاْ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ

اور ہم نے ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور تم کو انکی بستیاں معلوم ہیں اور شیطان نے انکی نگاہ میں ان کے عملوں اچھا کر دکھایا تھا پس روک دیا اُن کو اللہ کے راستہ سے حالانکہ وہ بڑے کاردان تھے۔

سورہ فجر کی تفسیر میں ہم ان کی تمدنی ترقیوں کے بعض دلائل کلام عرب کی تائید اسنا کے ساتھ نقل کر آئے ہیں۔ جو مناسبت قریش اور ثمود میں ہے، اس سے زیادہ گہری مناسبت ان دونوں قوموں کے سرداروں میں ہے۔ قریش کے ابولہب اور ثمود کے قدار کے حالات پر غور کرو تو تم کو نظر آئے گا کہ بالکل ایک ہی چیز دو بھیسوں میں دو جگہ نمودار ہو گئی ہے۔ یہ دونوں بدبخت ترین خلائق تھے۔ دونوں اپنی اپنی قوموں کے سردار تھے اور بالآخر دونوں نے اپنی جماعتوں کو ہلاکت کے گڑھے میں گرایا۔

عرب میں سیادت و قیادت کی تمام عظمت خانہ کعبہ کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس کی تولیت ابوطالب کے بعد ابولہب کو منتقل ہوئی۔ اور اس طرح تمام عرب کی قیادت کی باگ اس کے قبضہ میں آئی۔ اس نے بیت اللہ پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے بنیادی مقاصد، دعوت توحید اور ہمدردی فقرا و ضعفا بالکلیہ برباد کر دیئے۔ یتیموں کو دھکے دینے لگا، مسکینوں کو دھتکارنے لگا، نماز اور ذکر الٰہی جس سے اس گھر کی اصلی رونق و آبادی تھی ختم کر ڈالی، اور سرکشوں اور نافرمانوں کے جتھہ کا سردار بن بیٹھا۔

پھر جب اسے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم نے اس کی بدعات اور شرارتوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ تو اس کو اپنی سرداری کے زوال کا خطرہ محسوس ہوا، اور بجائے اس کے کہ اپنی اصلاح کرتا، اس نے آنحضرت صلعم سے جنگ پرخاش شروع کر دی اور قریش کے تمام سرکشوں کو آپ کی عداوت پر متحد کر لیا۔ سورہ لہب اور سورہ ماعون کی تفسیر میں ہم اس کی بعض خصوصیات بیان کر چکے ہیں۔ یہاں زیادہ تفصیل

کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ گونا گوں مناسبتیں تھیں جن کی وجہ سے قرآن نے ثمود اور ان کے سردار قدار کو، قریش اور ان کے سردار ابولہب کے سامنے بطور مثال اور نمونہ عبرت کے پیش کیا۔ تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ جو راہ وہ چل رہے ہیں وہ بعینہ وہی راہ ہے جو ان سے پہلے دوسری گمراہ قومیں چل چکی ہیں اور جس کا انجام بالآخر تباہی ہے۔ اسی مقصد سے قرآن نے امم سابقہ میں سے اور بہت سی قوموں کے حالات قریش کو سنائے ہیں تاکہ وہ ان حالات کے اندر خود اپنے حالات و انجام کو دیکھ لیں اور اسی کے ساتھ ان کو یہ بات بھی بتا دی گئی کہ اب وہ خدا کے عذاب کے پوری طرح مستحق ہو چکے ہیں لیکن نبیؐ اور مومنین کے ایمان کی برکت کی وجہ سے ابھی وہ اس کی زد سے محفوظ ہیں۔ جس روز یہ امان اٹھ جائیگی یعنی پیغمبر اپنی جماعت کے ساتھ ان کو چھوڑ کر ان سے الگ ہو جائے گا، عذاب الٰہی آدھمکیگا چنانچہ فرمایا ہے:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

اور اللہ کو زیبا نہ تھا کہ وہ ان کو عذاب دیتا درانحالیکہ تم ان کے اندر موجود تھے اور نہیں تھا اللہ ان کو عذاب دینے والا درانحالیکہ وہ اپنے

پس امت کے اندر سے ایک جماعت کا استغفار بھی عذاب کو دفع کرتا رہتا ہے۔ اور جبتک جماعت اطاعت براءت کر کے علیحدہ نہ ہو جائے، اس کی برکت پوری قوم پر سایہ افگن رہتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مجادلہ کا جو واقعہ قرآن نے سنایا ہے اس سے اس دعویٰ کا ثبوت ملتا ہے۔ بالکل یہی صورت حالات قریش کے معاملہ میں بھی تھی۔ قریش عذاب کے مستحق ہو چکے تھے۔ لیکن پیغمبرؐ اور مومنین کی موجودگی نیز بیت اللہ کی برکت اور مکہ کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا، مانع عذاب تھی۔ یہاں تک کہ مومنین مکہ سے ہجرت کر گئے اور پیغمبر کی امان اٹھ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین مطہر کو کفر و شرک اور نافرمانوں سے پاک کر دیا اور مومنین کے لئے ہجرت کے بعد "فرقان" کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا کیا اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ بیت اللہ کی حرمت کو کوئی بٹہ نہیں لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

اس کے متعلق جو دعا فرمائی تھی وہ ہر حال میں مستجاب رہی۔ اس معاملہ کے بعض پہلوؤں کی تفصیل تفسیر سورۃ النمل اور تفسیر سورۃ الکافرون میں ملے گی۔

ایک لطیف اشارہ

• ثمود کی سرکشی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کو صرف جھٹلانے پر بس نہیں کیا۔ ناقہ کو کاٹ ڈالنے کے بعد، انھوں نے پیغمبر کو قتل کرنے کا بھی ارادہ کرلیا۔

قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ	انھوں نے کہا آؤ آپس میں خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم
ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا	شبخون کے وقت صالح اور اس کے گھر والوں
مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۔	پر چھاپہ ماریں گے پھر ہم اس کے وارث سے کہہ دینگے
وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ	کہ اس کے اہل مارے جانے کے وقت تو ہم موجود بھی
لَا يَشْعُرُوْنَ۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ	نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔ اور وہ ایک داؤ چلے اور
عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ	ہم بھی ایک داؤ چلے اور ان کو کچھ خبر نہیں تھی پس
اَجْمَعِيْنَ (النمل)	دیکھو ان کے داؤ کا انجام کیسا ہوا۔ ہم نے ان کو

اور ان کی قوم سب کو ہلاک کر دیا

اسی کے ساتھ دیکھو قریش نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اور یاد کرو جب کافر تم پر داؤ چلا رہے تھے کہ تم کو
لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ	قید کریں یا قتل کر ڈالیں، یا جلاوطن کردیں
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ	اور وہ اپنا داؤ کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر
الْمٰكِرِيْنَ۔ (الانفال)	کر رہا تھا۔ اور اللہ بہترین تدبیر کرنیوالا ہے۔

یہ دونوں واقعات کس قدر مشابہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ایک ہی واقعہ دو طرح تعبیر کر دیا گیا ہے۔

صرف الفاظ کا فرق ہے۔ قریش کے معاملہ کی اٹھان بالکل ثمود کے معاملہ کے انداز پر تھی اسلئے معلوم ہوگیا کہ ان کی سرکشی بالآخر کس نتیجہ تک منتہی ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ نے ثمود کے حالات کی ایک تصویر ان کے سامنے رکھ دی تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جس طرح ثمود نے حضرت صالح کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا اسی طرح قریش بھی اپنے پیغمبر کو قتل کرنے کی سازشیں کریں گے۔ اور جس طرح ثمود اپنی ان شرارتوں کی پاداش میں ہلاک ہوئے اسی طرح بالآخر قریش بھی پارہ پارہ کر دیئے جائیں گے۔ ثمود نے اونٹنی کو قتل کرکے چاہا کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے ان کا خیال تھا کہ اگر صالح کی بات سچی ہے تو عذاب فوراً آ جائے گا اور اگر عذاب نہ آیا تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب صالح کی زبانی دھمکیاں ہیں اور پھر ہم اسکو بے دریغ تہ تیغ کر دینگے۔ لیکن خدا نے ان کو مہلت نہ دی قبل اس کے کہ وہ اونٹنی کے قتل کے بعد پیغمبر کے قتل کا ارادہ کریں، عذاب الٰہی نے ثمود کو آ پکڑا اور ان کی ساری سازشیں درہم برہم کر دیں۔

پس یہ واقعہ یہاں اس لئے سنایا گیا کہ قریش اپنے آغاز و انجام کی پوری حکایت پہلے سے سن رکھیں اور اگر اس سے عبرت حاصل کرنا چاہیں تو عبرت حاصل کریں۔ اور قرآن نے جیسا کہ اس کا طریقہ ہے واقعہ کی پوری تفصیل نہیں بیان کی ہے۔ بلکہ جس طرح عبرت و موعظت کے واقعات وہ بیان کرتا ہے اسی طرح اس کی بعض اہم جزئیات کی طرف اشارے کر دیئے ہیں مثلاً هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ، فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ، بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ، وَاللَّهُ مِن وَرَائِهِم مُّحِيطٌ

لیکن پڑھنے والوں کو انہی اشارات کی مدد سے ذہن میں پوری تصویر تیار کر لینی چاہیئے۔ اور جو لوگ اس طرح ثمود کے واقعہ پر غور کریں گے وہ بے تکلف اسی نتیجہ تک پہنچ جائیں گے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں۔ یعنی اس میں قریش کے عزائم و اعمال اور ان کے احوال و نتائج کی طرف نہایت لطیف تعریضات ہیں

اس طرح کے اجمالی اشارات کسی واقعہ کے متعلق اس کے ظہور سے پہلے اس لئے کر دئے

جاتے ہیں کہ جب وہ واقعہ ظہور میں آئے تو یہ غیبی پیشینگوئیاں مومنین و منکرین دونوں کے اندر اس امر کا یقین پیدا کریں کہ اللہ کے وعدے بالکل سچے ہیں اور وہ ضرور پورے ہوں گے۔

قرآن مجید اور اگلے صحیفوں میں، تنبیہات و بشارات کے سلسلہ میں اس نکتہ کی طرف اشارات کردئے گئے ہیں۔

ایک اشارہ امت مرحومہ کے باب میں

۹ اگرچہ ہماری اس کتاب کا مقصد اشارات و لطائف کی جستجو نہیں ہے لیکن ایک ایسی بات کا ذکر انشاء اللہ ناموزوں نہ ہوگا جو سرکشی اور نفس کی مطلق العنانی کے انجام کو ہمارے سامنے کردے کیونکہ یہ چیز اس درجہ اہم ہے کہ اگرچہ اللہ تعالے نے امت مرحومہ کو کبھی ہلاک نہیں فرمایا لیکن اسی چیز کی بدولت وہ بارہا ہلاکت کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور پھر اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں پچھلی قوموں کے جو اتفاقات اور مثلیں بیان کی ہیں ان سے سبق حاصل کرنا اصلی علم ہے۔

انبیاء کے صحیفوں اور قرآن میں یہود کی سب سے بڑی شرارت یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے انبیاء اور صلحاء کو قتل کیا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	اور ماردی گئی ان پر ذلت اور مسکنت اور وہ لوٹے
وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ	اللہ کا غضب لیکر، یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیات
بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ	کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ	تھے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور
ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ	حد سے بڑھ جاتے تھے۔

یعنی انھوں نے سرکشی اور عدوان کی وجہ سے انبیاء کو قتل کیا۔

سورہ بقرہ ہی میں دوسری جگہ ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى	کیا جب جب تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری
اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ	خواہشوں کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا تم اکڑ بیٹھے
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا	پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کرتے رہے
غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ	اور کہتے ہیں ہمارے دل محفوظ ہیں، بلکہ اللہ نے
فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ	ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر دی ہے پس

یعنی ان کے کفر اور استکبار کی وجہ سے جس نے ان کو انبیاء کی تکذیب اور قتل پر آمادہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان پر گمراہی کی لعنت کر دی

یہی مضمون سورہ آل عمران میں وارد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور
وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ	اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان کو قتل
الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ	کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل کا حکم دیتے ہیں
النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری پہنچا دو وہی
اُولٰۗئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ	ہیں کہ جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ڈھ گئے
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَھُمْ	اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہے
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ	

اس آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ فرمادیا ہے کہ صلحاء اور عدل و قسط کا حکم دینے والوں کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر انبیاء کے قتل کے ذکر کے بعد فرمایا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس معصیت کا محرک درحقیقت وہ

عصیان و عدوان ہے جو انبیاء کے قتل کا باعث ہوا اور جس کا ذکر اس باب کے اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھکر ایک اور حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ چند افراد یا اشخاص کے کسی جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ پوری قوم پر اپنا غضب نہیں نازل کرتا مگر اس وقت جبکہ ان کے ہاتھوں سے عدل و قسط کا کوئی بنیادی قانون ٹوٹ رہا ہو اور دوسرے خاموشی سے اس تباہ افعال کا تماشہ دیکھیں اور مجرموں کا ہاتھ نہ پکڑیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدل و قسط کا قیام اس پورے نظام کائنات کے بقا و قیام کے لئے ناگزیر ہے پس ضروری ہے کہ جب اس کو کوئی صدمہ پہنچے تو سب اس کے لئے دردمند اور غمگین ہوں اور اللہ تعالیٰ کے قانون کی حفاظت کے لئے جوش اور غضب سے بھر جائیں۔ جو ایسا نہ کریں گے وہ درحقیقت مجرموں کے شریک حال اور معاون متصور ہونگے۔ اسی بنیاد پر قرآن نے ان لوگوں کو نہایت سخت الفاظ میں ملامت کی ہے جو جنگ و جہاد کے مواقع پر گھروں میں بیٹھے رہے اور حمایت حق و عدل کے جوش نے ان کو بےچین نہیں کیا۔ قرآن نے جہاں امت کو اللہ و رسول کی کامل اطاعت کا حکم دیا ہے وہاں اس امر کی تصریح کر دی ہے۔

سورہ انفال میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا	اے ایمان والو اللہ کا حکم مانو اور رسول کا (واللہ رسول میں واؤ بیان
لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ	کیلئے ہے کیونکہ رسول اللہ ہی کی اطاعت کیطرف بلاتا ہے) جبکہ وہ تمکو بلاتا
لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ	ہے ایسی چیز کیلئے جو تم کو زندگی بخشیگی اور یاد رکھو کہ اللہ آدمی اور اسکے دل کے بیچ
يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَ	میں حائل ہو جاتا ہے (یعنی آدمی کے دل کے بھیدوں کو قبل اس کے کہ آدمی خود
أَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ وَاتَّقُوا	انکا احساس کرے اللہ تعالیٰ جان لیتا ہے) اور اسی کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے:
فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا	(پس جو کچھ تم نے چھپا رکھا ہے اور جو کچھ ظاہر کیا ہے سب کا حساب ہوگا کیونکہ وہ
مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا	تمہارے ظاہر و باطن سے باخبر ہے) اور اس فتنہ سے بچو جو خاص ان لوگوں کو

إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○	نہیں پہنچے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے (یعنی صرف
وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ	وہی لوگ ماخوذ عذاب نہ ہوں گے جنھوں نے پیغمبر کی نافرمانی کی ہے
فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ	کیونکہ بقیہ لوگوں پر یہ فرض تھا کہ وہ نافرمانوں کو روکتے اور پیغمبر
النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ	ساتھ ہمدردی کرتے) اور یاد رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے
وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ	اور یاد کرو جب تم زمین میں تھوڑے اور کمزور تھے۔ ڈرتے تھے کہ
تَشْكُرُونَ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا	لوگ تم کو اچک لیجائیں۔ پس اللہ نے تم کو پناہ دی اور اپنی مدد سے
لَا تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا	تمہاری تائید کی اور تم کو پاک روزی دی تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اے ایمان والو
أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ	اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت

(انفال ۲۵-۲۷)

ان آیات میں صاف　　بیان فرما دیا کہ اگر کسی قوم کے چند افراد کسی جماعتی معصیت کا ارتکاب کریں اور باقی سب خاموش رہیں، ان کے ہاتھ نہ پکڑیں، تو ان کے جرم کی پاداش میں پوری قوم ماخوذ ہوگی، کیونکہ انھوں نے حق وعدل کو، جو سب کی متاع مشترک تھا، تنہا چھوڑ دیا۔ ثمود کے واقعہ کی بالکل یہی نوعیت تھی، اور یہی سبب ہے کہ ان کے اندر سے ایک بدبخت نے جو کچھ کیا اسکے وبال میں پوری قوم گرفتار ہوئی۔ چنانچہ دیکھو قرآن نے اس ایک شخص کے فعل کے لئے "عقروھا" کا لفظ استعمال کیا، یعنی جمع کا صیغہ، اور اونٹنی کے کاٹ ڈالنے کے جرم کو پوری قوم کی طرف منسوب کیا کیونکہ قوم نے اس جرم پر خاموشی اختیار کرکے درحقیقت اپنی پسندیدگی اور رضا کا اظہار کر دیا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ بات عقلاً بھی بالکل صحیح ہے کیونکہ گناہ درحقیقت قلب کی ایک صفت ہے، ظاہری اعمال و افعال تو محض اس کے آثار ہیں۔ پس اگر کوئی شخص کسی گناہ پر راضی ہے اور اسکو اچھا سمجھ رہا ہے تو یقیناً وہ اس شخص کے برابر ہے جس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا بہت سے اعمال و افعال یہود کی طرف ایسے منسوب کئے ہیں جن کی اصلی ذمہ داری

"درحقیقت ان کے آباء و اجداد پر عائد ہوتی تھی لیکن چونکہ انھوں نے بھی ان افعال کو پسند کر لیا اسلئے جائز ہوا کہ وہ ان کی طرف منسوب کئے جائیں۔ باپوں کے جرم میں بیٹے جو پکڑے جاتے ہیں تو اس میں بھی یہی راز ہے۔ اور اسمیں ایک اور دقیق نکتہ بھی ہے جس کو ہم نے سورہ نوح کی تفسیر میں بیان کیا ہو وہ اس کے لہمات مطالب میں سے ہے۔

قوموں کے مواخذہ کا قانون

۱۔ کوئی قوم جب نافرمانی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً تباہ نہیں کر دیتا۔ اس کے بہت سے گناہوں سے درگذر کرتا ہے، اور مہلت دیتا ہے تاکہ جو توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کریں اور جو ہلاک ہونا چاہیں وہ پورے طور پر عذاب کے مستحق ہو جائیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ	اور اللہ لوگوں سے انکے ظلم پر فوراً مواخذہ کرتا تو روئے
مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَّلٰكِنْ	زمین پر کسی جاندار کو زندہ نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو مہلت
يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى	دیتا ہے ایک مدت متعینہ تک۔

چنانچہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں پر بار بار سزا تو دی لیکن اسوقت تک جب تک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زعم کے مطابق انھوں نے قتل کر کے اپنا پیمانہ لبریز نہیں کر لیا اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے نہ تو اپنی شریعت ان سے چھینی اور نہ ان سے اپنا رشتہ کاٹا۔ البتہ جب انھوں نے اپنے خیال کے مطابق اس تیسرے خون کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تو وقت آگیا کہ خدا کا عذاب ان کو تباہ کر دے۔ اس تمہید کے بعد دو اہم باتوں کا خاص طور پر خیال رکھو۔

(۱) قرآن مجید سے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کے برے اعمال کے نتائج فوراً نہیں ظاہر فرماتا بلکہ اس کی حکمت متقضی ہوتی ہے کہ لوگوں کو مہلت دے یہاں تک کہ وہ عذاب کے پوری طرح مستحق ہو جائیں۔

(۷) نویں فصل میں ہم نے بتایا ہے کہ انبیاء، صلحاء اور عدل و قسط کی دعوت دینے والوں کا قتل شدید ترین معصیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑھکر کوئی جرم نہیں۔

اب ہم گذشتہ امتوں میں سے ایک امت اور اس امت مرحومہ کی تاریخ کے چند واقعات کی روشنی میں بعض ایسے نتائج و احوال کی طرف رہنمائی کریں گے جو ماضی میں واقع ہوچکے ہیں اور ضرور ہے کہ آیندہ بھی واقع ہوں اور یہ بھی منجملہ اس سنت الٰہیہ کے ہے جس کی نسبت قرآن حکیم میں وارد ہے کہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤگے۔ اور اس سے مراد سرکشوں اور مفسدوں کی گرفت کا وہ قانون ہے جو اٹل ہے اور ہمیشہ بے لاگ ظہور میں آتا ہے کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا۔

امت مرحومہ میں ناقۃ اللہ کی مثال

۱۔ ثمود نے اللہ کی اونٹنی کو قتل کرکے سرکشی کی جو مثال مشئوم قائم کی تھی یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کرکے بعینہ اس مثال کی تقلید کی گویا یہود کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود گرامی ناقۃ اللہ کی مثال تھا۔ یہ مثال محض ہماری طبع زاد نہیں ہے، قرآنی اشارات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ناقۃ کے متعلق معلوم ہے کہ وہ ایک آیۃ اللہ تھی، بعینہ یہی بات قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی ملتی ہے، سورہ انبیاء میں ان کی نسبت وارد ہے۔ وجعلنھا وابنھا آیۃ للعالمین اور ہم نے اس کو (مریم) اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو دنیا والوں کے لیے نشانی بنایا۔ یعنی ان کا وجود خود ایک آیت تھا، چنانچہ اس جرم کی پاداش میں یہود ثمود کی طرح پامال کردیئے گئے اور نعمت نبوت ان سے چھین لی گئی۔

بعینہ اس کے مشابہ واقعہ امت مرحومہ میں پیش آیا۔ اس امت کے اندر ناقہ کی مثال

حضرت علیؓ تھے، چنانچہ ان کے قتل کے بعد اس امت سے خلافت چھین لی گئی، اور خلفاء کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کے بعد جو لوگ مسند خلافت پر متمکن ہوئے وہ خلفاء نہ تھے، ملوک و سلاطین تھے۔ (الا ماشاء اللہ) جو مال و جائداد کی طرح بادشاہت کو وراثت میں پاتے تھے اور بادشاہوں کی طرح فرمانروائی کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اس انقلاب کی پیشینگوئی فرمادی تھی۔ اور اس دور کو "ملک عضوض" کے لفظ سے تعبیر فرمایا تھا۔ بعض روایات میں ان تمام امور کی طرف اشارات ملتے ہیں ایک مرتبہ آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:۔

اے ابو تراب (علیؓ) کیا میں تمہیں بدبخت ترین خلائق احمر ثمود کی خبر نہ دوں جس نے ناقہ کو قتل کیا اور جو تم کو اس پر (سر پر) مارے گا۔ اور اس سے یہ (داڑھی) تر ہو جائے گی۔

(باقی)

قرآن مجید بحر ناپیدکنار ہے

قرآن نے صاف طرح پر اعلان کر دیا کہ "اس دریا سے بقدر اپنے ظرف کے پانی لے لو۔ تمام دریا کو اپنی کٹھیا میں بھرنے کی ہوس نہ کرو" صحابہؓ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر کسی جگہ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو خواہ مخواہ اسے الجھتے نہ تھے۔ یہ اس لئے تھا کہ بقدر ہدایت قرآن نہایت کھلا تھا۔ دریا سے عبور کر کے اپنی منزل مقصود کو پہنچتے تھے مگر اس کی تمام وسعت کو ناپنے کی تمنا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے غیر محدود اور ناپید کنار جان گئے تھے۔ ہاں ہر شخص بقدر اپنے فہم اور قوت فکر کے اس سے جواہر نکالتا تھا اور عام شاہراہ سے ادھر ادھر جو دلکش جزیرے واقع تھے، ان کا انکشاف کرتا تھا۔ جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ " اس دریا کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے"۔

(فراہیؒ)

تدبر قرآن

از

امین احسن اصلاحی

بعض طلبہ جو قرآن مجید پر تدبر کر رہے ہیں اور نظم کے طالب ہیں معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مطالعہ قرآن میں کن آداب و امور کا لحاظ ضروری ہے۔ ان کی رہنمائی کے لئے فی الحال یہ چند سطریں لکھی جاتی ہیں اور چونکہ یہ سوال تدبر قرآن کی کلید ہے اس لئے اس پر آیندہ ان صفحات میں مفصل بحثیں آئیں گی۔ اس وقت صرف بعض امور اہمہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

مطالعہ قرآن میں اصلی چیز نیت اور ارادہ کی تصحیح ہے۔ نیت اور ارادہ کی تصحیح کا جو مفہوم بالعموم سمجھا جاتا ہے ہم نے اس سے کسی قدر وسیع مفہوم پیش نظر رکھا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ چند لفظوں میں اس کی تشریح کردیں۔

موجودہ زمانہ میں علوم کے تدبر و مطالعہ کا ایک خاص نہج ہے۔ جس کی ایک اعلیٰ ترین اور مقبول عام شکل وہ ہے جس کو ہم "ریسرچ" کے نام سے جانتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ چیز کچھ اس زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر زمانہ میں اہل علم و تحقیق کی راہ یہی رہی ہے لیکن ہماری موجودہ حالت نے ہمتیں اس قدر پست کردی ہیں کہ ہمارے اندر نہ اپنی قدیم اولوالعزمیوں کے لئے کوئی احترام باقی رہ گیا ہے نہ وقت کی نئی راہوں میں ہمت آزمائی کا حوصلہ۔ ایسی حالت میں لوگوں کو یہ سمجھانا کہ قرآن مجید کا مطالعہ موجودہ زمانہ کی ادعائی "ریسرچ" کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہے، ایک انوکھی اور عجیب بات ہوگی لیکن چونکہ حقیقت حال یہی ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ یہ عجیب بات لوگوں کے

کانوں تک پہنچا دی جائے کہ اب انتظار کی فرصت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ بلاشبہ آج لوگ سنیں گے اور ہنسیں گے لیکن کیا عجب کہ کل سنیں اور ہمت و ارادہ کا کوئی قدم اٹھا دیں۔

جہانتک کہ قرآن مجید کے محل فکر و تدبر ہونے کا سوال ہے، اس پر ان صفحات میں مفصل مباحث گذر چکے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے لئے صرف اسی قدر ضروری نہیں ہے کہ اس پر فکر و تدبر کیا جائے بلکہ اس فکر و تدبر کے کچھ خاص شرائط و آداب ہیں جن کی تقدیم اور جنکا اہتمام اس راہ میں ضروری ہے۔ اور اگر یہ نہ کیا جائے تو یہ تدبر عموماً رائگاں جاتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں باوجودیکہ تدبر قرآن کا ذوق روز بروز بڑھ رہا ہے، ہمارے حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہو رہی ہے، بلکہ اگر غور کیجئے تو نظر آئے گا کہ امید کی وہ ہلکی سی روشنی جو کبھی کبھی ہماری عام مایوسیوں کے اندر نظر آجاتی تھی آہستہ آہستہ وہ بھی غائب ہو رہی ہے اور وہ تاریکی جو افق کے صرف ایک گوشہ میں نمودار ہوئی تھی، رفتہ رفتہ تمام مطلع پر چھا رہی ہے۔ اور انتہائی بدقسمتی یہ ہے کہ آج جتنے فتنے اٹھ رہے ہیں وہ زیادہ تر قرآن ہی کے نام سے اٹھ رہے ہیں، حالانکہ قرآن فتنوں کو مٹانے کے لئے آیا تھا، فتنوں کو ابھارنے اور ان کو غذا دینے کے لئے نہیں آیا تھا۔

پھر کیسا عجیب معاملہ ہے کہ دنیا کی ہر بات کی طرح یہ بات بھی کچھ اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کے ہر دور میں یہی حال نظر آتا ہے۔ ہر فتنہ قرآن مجید ہی کی آڑ پکڑ کر نمودار ہوا، خوارج قرآن مجید ہی کے سہارے ابھرے، باطنیوں کے تمام استدلالات کی بنیاد قرآن مجید ہی پر ہے۔ بابیوں اور بہائیوں نے جو کچھ کہا، اپنے زعم کے مطابق، قرآن مجید ہی سے کہا، قادیانیوں کی نبوت کی اساس اُن کے ادعا کے مطابق قرآن مجید ہی ہے۔ اور چکڑالوی تو قرآن کے سوا کچھ بولتے ہی نہیں۔ اور یہ تو ہزاروں فرقوں اور گروہوں میں سے صرف چند کے نام لئے گئے۔ تاریخ اسلام کے تمام فرقوں کے حالات اور اساسی

متعددات معلوم کیجئے تو قرآن مجید ہر ایک کے ہاتھ میں نظر آئے گا۔ پھر ایسا کیوں ہے بعد از مجید تو ہدایت اور رہنمائی کی روشنی ہے، ضلالت و گمراہی کی تاریکی کو اس سے کیا تعلق؟ ہونا تو یہ تھا کہ جو اسکو دیکھتا اور پڑھتا اس کو ٹھیک راہ مل جاتی۔ سیدھا راستہ نظر آجاتا۔ وہ ہدایت و ایمان سے معمور ہو جاتا۔ ہر گوشہ میں وحدت و یکجہتی کی شاہراہ اس پر کھل جاتی، اختلاف و تفرق کے تمام پیچ پیچ نکل جاتے اور اس کی تعلیم و دعوت کی ہم آہنگ، غیر مبہم، نافذ اور پر قوت صدائیں سے اس کے دل و دماغ اس طرح بھر جاتے کہ اسکے علاوہ نہ وہ کچھ سوچ سکتا نہ سمجھ سکتا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ اس کو ایک تلوار کی طرح دوست اور دشمن دونوں استعمال کر رہے ہیں۔ مومن اسی کو لیکر حق و عدل کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ اور منافق اسی کے ذریعہ سچائی اور حقیقت کو مغلوب کرلینا چاہتا ہے۔ آخر قرآن ہر ایک پر کیوں نہیں کھل جاتا۔ اس کی صاف اور واضح تعلیمات ہر ایک کے دل کو کیوں نہیں پکڑ لیتی ہیں۔ اس کی اصلی تعریف تو یہی ہے کہ وہ ہر قسم کے کج پیچ سے پاک، اپنی تعلیمات و توضیحات میں بالکل غیر مشتبہ اور غیر مبہم ہے اور اس کے ہر گوشہ میں کامل توافق اتحاد، ہم آہنگی، اور وحدت نمایاں ہے۔ پھر اس کے مختلف پڑھنے والے مختلف راہوں میں کیوں نکل جاتے ہیں؟ وہ سب کو کھینچ کر ایمان و عقیدہ کی ایک ہی شاہراہ پر کیوں نہیں کھڑا کر دیتا؟

تدبر قرآن کیلئے اولین شرط

ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے کچھ خاص آداب و قواعد ہیں جن کی رعایت و اہتمام ضروری ہے، ان کے بغیر قرآن کی راہ نہیں کھل سکتی، اور ان میں سب سے مقدم ارادہ اور نیت کی تصحیح ہے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اور خلق کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے اس لئے سب سے مقدم شے یہ ہے کہ انسان بالکل خالی الذہن ہو کر اس کو طلب ہدایت کے لئے پڑھے۔ اپنے قلب و دماغ کو بالکلیہ اس کے حوالہ کر دے

اپنے دل کی باگ اس کے ہاتھ میں دیدے۔ تمام خیالات و معتقدات سے خالی ہو کر اپنے تئیں اس امر کے لئے آمادہ کرے کہ اس کے اندر اپنی خواہشات کے لئے سند جواز، اپنے معتقدات کے لئے حیلے، اور اپنے نفس کے لئے جائے پناہ نہیں تلاش کریگا، کج بحثیاں اور اعتراضات نہیں ڈھونڈھیگا، تشفی اور طمانیت تلاش کریگا اور اس کی روشنی جس طرف رہبری کرے گی، اس طرف قدم بڑھائیگا لیکن اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے، اس کا مقصود طلب ہدایت نہ ہو، اعتراض و کج بحثی ہو، اور اس کی خواہشوں نے اس کے دل میں جو وسوسے پیدا کر دئے ہوں قرآن مجید کو ان سے ہم آہنگ کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے قرآن مجید میں بالکل محرومی ہے۔ قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خود اشارہ کر دیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ	وہی ہے جس نے اتاری تم پر کتاب جس میں
مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ	سے کچھ آیات محکمات ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں
وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ	اور دوسری متشابہات ہیں تو جن لوگوں کے
فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ	دلوں میں کجی ہے تو وہ قرآن کی متشابہات
مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ	کے پیچھے پڑتے ہیں، فتنہ چاہنے کے لئے اور
وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ	اس کی اصلی حقیقت دریافت کرنے کے لئے
فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ	حالانکہ اس کی حقیقت نہیں معلوم ہے مگر اللہ
عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا	کو، اور جو علم میں راسخ ہیں، وہ کہتے ہیں ہم
الْاَلْبَابِ	اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف
. . . .	سے ہے اور نہیں سمجھتے مگر وہ جو عقل والے ہیں۔

اجمالاً اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو طرح کی آیات ہیں، محکمات

متشابہات۔ محکمات اپنے مفہوم و منطوق میں بالکل واضح ہیں، ان میں کسی جہت سے کسی طرح کا اشتباہ نہیں ہے۔ ان کا تعلق ہماری عملی و اعتقادی زندگی کے اساسی مسائل سے ہے اس لئے ہم ان کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ اور منطق و استدلال کی تمام کسوٹیوں پر جانچ کر ان کی نسبت اپنے قلب کو ہر طرح مطمئن کر سکتے ہیں۔ متشابہات کا حال ان سے کچھ مختلف ہے۔ اصولی حیثیت سے تو وہ عقل و استدلال کی نہایت محکم بنیادوں پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے ان پر اجمالاً ایمان لانے اور یقین کرنے میں عقل کو ذرا بھی الجھن نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کا تعلق اس عالم محسوسات سے ماوراء حوادث و امور سے ہوتا ہے اس لئے ان کی تفصیلات ہماری عقل و منطق کے دائرہ میں نہیں سماتیں۔

پھر جس طرح قرآن مجید کی آیتوں کی دو قسمیں ہیں اسی طرح قرآن مجید کے پڑھنے والوں کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ لوگ ہیں جو اپنے ارادہ اور نیت کی تصحیح کر کے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور ان کا مقصود طلب رشد و ہدایت ہوتا ہے۔ قرآن مجید فوراً ایسے لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنی تربیت میں لے لیتا ہے۔ وہ اسکی محکمات میں روح و قلب کے لئے پوری آسودگی اور اپنی عملی و اعتقادی زندگی کے لئے پوری رہنمائی پاتے ہیں اور ایک مدت کی گم گشتگی اور ہرزہ گردی کے بعد ان کو محسوس ہوتا ہے گویا سکون قلب و طمانیت عقل کی بہشت میں پہنچ گئے ہیں۔ ان کے دل کی تمام خلشیں دور ہو جاتی ہیں اور شبہات و شکوک کے تمام کانٹے ایک ایک کر کے نکل جاتے ہیں۔ متشابہات سے ان کے دل میں کوئی وحشت نہیں پیدا ہوتی کیونکہ اصولی طور پر وہ بالکل عقل و حکمت پر مبنی ہوتی ہیں اور اجمالاً ان پر ایمان لانے میں عقل کو کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، صرف ان کے جزئیات کے متعلق کوئی تفصیلی تصور عقل کی گرفت میں نہیں آتا تو یہ ایسی چیز نہیں جو موجب انکار و اعتراض ہو۔ اگر ہمارے پاس ۹۹ روپے موجود ہیں تو بہتر ہوگا اگر پورے سو

ہوجائیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو کیا ہم اپنی جیب کے ۹۹ پھینک دیں گے؟ پس وہ اس طرح کی آیات کے باب میں خدا کی طرف تفویض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امنا بہ کل من عند ربنا، ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی اتاری ہوئی ہیں، ور ان کا یہ کہنا بیوقوفی اور ناسمجھی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ عقل ودانش اور رسوخ علم کی معراج ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کو الراسخون فی العلم کے عظیم الشان لقب سے پکارا کہ درحقیقت ان کا آیات متشابہات کے متعلق یہ اعتراف کمال عقل وحکمت اور انتہائے فکر وتدبر اور رسوخ فی العلم کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے معاملہ کو جہاں تک اس کی اصل بنیاد کا تعلق ہے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس کے متعلق ان کو کسی طرح کا تذبذب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ صرف اس کے بعض گوشوں کے متعلق ان کو شرح صدر کا انتظار ہے سو اس کے لئے وہ امیدوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد تشفی وطمانیت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ اور اگر کبھی یہ شکوک غلجان اور پریشانی کا سبب ہونے لگتے ہیں اور قلب کی طمانیت میں کچھ فتور نظر آتا ہے تو فوراً وہ دعا ان کی زبان پر جاری ہوجاتی ہے جو اسی آیت کے بعد ہی وارد ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ	اے ہمارے رب ہم کو ہدایت دینے کے
هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ	کے بعد ہمارے دلوں کو ڈانواں ڈول
رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ	نہ کر، اپنے پاس سے ہم کو رحمت بخش،
(آل عمران)	تو بڑا بخشنے والا ہے۔

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو اپنے ارادہ ونیت کی اصلاح کئے بغیر محض اپنے اغراض وا ہوا کی حمایت ڈھونڈنے کے لئے قرآن پڑھتے ہیں، اور بجائے اسکے کہ اپنی باگ قرآن کے ہاتھ میں دیدیں، چاہتے ہیں کہ قرآن کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو جس طرف چاہیں پھیر دیں

ان کا مقصود طلب رشد و ہدایت سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی قرار دادہ مسلک کی تائید کیلئے اس میں دلیلیں تلاش کریں۔ یا جن سے ان کو اختلاف ہے ان کو چپ کرنے کے لئے اس میں سے اعتراضات اور کج بحثیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ جب قرآن مجید پڑھیں گے، وہ محکمات پر نہیں ٹکیں گے کہ وہ ان کے مطلب کی چیز نہیں۔ ان کو نہ کسی طمانیت یا عمل و اطاعت کی راہ مطلوب نہیں ہے کہ اس کو پا کر مطمئن ہو جائیں۔ ان کو سوکار ان کی اغراض کی تلاش ہے اس لئے پورے قرآن میں صرف وہ بات، ان کو پسند آئیگی جس سے اپنی خواہشوں کو خوش یا اپنے مخالفوں کو چپ کر سکیں۔ اور اس خواہش کے ساتھ یقیناً محکمات کے ساتھ دوستی باقی نہیں رہ سکتی۔ ضرور وہ متشابہات کی طرف بڑھیں گے اور جن باتوں کا اجمالاً مان لینا ان کے لئے کافی ہوتا، اور جن پر ایمان و یقین کے لئے قرآن کی عقلی رہنمائیاں کافی تھیں، ان کی جزئیات و تفصیلات کے پیچھے ادھیڑیں گے اور بالکل یہود کی طرح، جنھوں نے دوزخ کی آگ میں درخت کے وجود پر اعتراض کرکے، اپنے اوپر ہدایتِ قرآن کے دروازے بند کر لئے تھے۔ یہ بھی طرح طرح کے شبہات و شکوک اور نئی نئی تاویلوں کے دروازے کھولیں گے۔ اور ابدی شقاوت کی تمام محرومیاں اپنے لئے جمع کر لیں گے۔

یہی لوگ ہیں جو قرآن کی ہدایت و حکمت سے محروم رہتے ہیں اور اللہ کی سب سے بڑی نعمت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تئیں عقل و دانش کا پتلا سمجھتے ہیں، لیکن قرآن نے مندرجہ صدر آیت میں ان کو احمق اور بے عقل قرار دیا ہے اور ان سے بڑھکر بیوقوف کون ہو سکتا ہے جن کی سب سے بڑی آرزو یہ ہو کہ وہ پورے قرآن میں کوئی ایسی بات پالیں جو ان کی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھل سکے یا جس کو بنیاد قرار دے کر وہ قرآن پر اعتراضات کر سکیں۔ یہ وہ محروم القسمت گروہ ہے جس نے حکمت و دانش کے ۹۹۹ نوسو ننانوے اصولوں کو اس لئے ٹھکرا دینا چاہا ہے کہ اس کے ہزارویں اصول کی تمام جزئیات پوری طور پر اسکی گرفت میں

نہیں آتیں۔ اس "پورے طور پر" کے لفظ کو خوب یاد رکھئے کیونکہ متشابہات عقل اور ادراک سے ماورا نہیں ہوتی ہیں، عقل و ادراک کے دائرہ کے اندر ہوتی ہیں۔ البتہ ان کی جزئیات کی تفصیل ہم نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ہمارے علم و مشاہدہ کی تمام معلومات ان کی مثالیں فراہم کرنے سے قاصر ہوتی ہیں

یہ اصلاً تو ان محرومین کا بیان ہے جو عہد نزول قرآن میں موجود تھے لیکن اگر غور کیجئے تو اس آیت نے ہر دور کے راسخون فی العلم اور ارباب زیغ کی حقیقت آئینہ کر دی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں قرآن کے پڑھنے والے انہی دو گروہوں میں تقسیم رہے ہیں۔ ایک راسخون فی العلم اور اولو الالباب کا۔ دوسرا طالبین فتنہ و تاویل کا - ایک گروہ کا اصلی مطمح نظر قرآن کا وہ حصہ رہا جو محکمات سے متعلق ہے کیونکہ اس کا مقصود طلب رشد و ہدایت تھا۔ اس نے قرآن سے فیض پایا اور صراط مستقیم کی ہدایت حاصل کی۔ دوسرا گروہ ارباب زیغ و تاویل کا تھا، اس نے قرآن کی طرف ہدایت کے لئے نہیں بلکہ شرارت کے لئے قدم بڑھائے۔ ان کی نیتیں فاسد اور ارادے برے تھے اس لئے قدرتاً یہ قرآن کے اس حصہ کی کھوج کرید میں مشغول ہو گئے جو متشابہات سے متعلق ہے اور جس میں عقل انسانی اگر سنبھل کر نہ چلے اور ہر گام پر خدا کی توفیق شامل حال نہ ہو، تو طرح طرح کی ٹھوکریں لگ سکتی ہیں۔

قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عمل کی تعلیم اور قلب و روح کے تزکیہ و تطہیر کے لئے اتارا ہے، دماغی عیاشیوں اور کج بحثیوں کیلئے نہیں اتارا ہے اس لئے اس کا فیض صرف انہی کو پہنچ سکتا ہے جو اس کے پاس پاک دل یا آگاہ اور ہوشیار کان لیکر حاضر ہوں۔ جنگجو دماغ اور الجھانیوالی عقل لے کر نہ آئیں۔ سورہ قٓ میں فرمایا ہے ان فی ذٰلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔ اور سورہ صافات میں قلب کے متعلق یہ تصریح فرمائی کر

وہ سلیم ہو۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ پر سورہ ق میں آیا
وجاء بقلب منیب یعنی خدا کے دربار میں یا خدا کے کلام کے استماع کے لئے جو آئے قلب سلیم اور
قلب منیب لیکر آئے، متکبر و جبار کا قلب لیکر نہ آئے کہ ایسے دلوں پر اللہ کی مہر ہوتی ہے وہ خدا
کی باتوں کے فہم و ادراک سے قاصر ہوتے ہیں الذین یجادلون فی اٰیٰت اللہ بغیر سلطان
اتاھم، کبر مقتا عند اللہ و عند الذین اٰمنوا، کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار
قرآن کے تدبر کے بعد سب سے پہلے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کی طرف
صرف ایمان و عمل کے حصول کیلئے بڑھا جا سکتا ہے، اس ایک خواہش کے علاوہ اگر کسی دوسری
خواہش کا کوئی ادنی شائبہ بھی پایا گیا تو بس قرآن کا دروازہ اس کے لئے بند ہے اور پھر انسانی
سعی و کاوش کی کوئی کلید بھی اس بند دروازہ کو نہیں کھول سکتی۔ بات کو سنو اور فوراً اس کی طرف
عمل اور پیروی کا قدم بڑھا دو تو قرآن خوش ہے اور پھر درجہ بدرجہ ایمان اور عمل کی راہوں
میں جسقدر استوار اور مضبوط ہوتے جاؤ گے اسی قدر اس کی برکتیں تمھارے لئے بڑھتی جائیں گی۔ لیکن
اگر ایسا نہیں ہوا، تم قرآن کی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہو مگر ہمت عمل نہیں رکھتے، یا اپنی خواہشوں کو
اس کے احکام کے آگے ترک نہیں کر سکتے، یا محض اس لئے اس کو پڑھنا چاہتے ہو کہ تم کو "تحقیق" اور
"ریسرچ" کا مذاق ہے۔ یا تمھارے کچھ اپنے خیالات ہیں جنکو قرآن کے سانچہ میں ڈھالنے کے
آرزومند ہو تو قرآن ایسوں کو اپنے دروازے پر پھٹکنے نہیں دیتا۔ وہاں بار صرف وہی پاتے ہیں
جو سنیں اور پیروی کریں۔ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین
ھداھم اللہ و اولئک ھم اولوا الالباب (زمر)

(باقی آیندہ)

مُذاکرہ

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیہِ

(۲)

از جناب مولوی بدر الدین صاحب اصلاحی

سورہ مائدہ کی آیت وکیف یحکمونک الخ سے آپنے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ "آنحضرت صلعم کے عہد تک یہود کے پاس اصل توراۃ موجود تھی" حالانکہ اس آیت کے لفظوں سے یہ بات کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتی۔ سب سے الگ ہوکر خود قرآن کے لفظوں کی رہنمائی میں غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بطور الزام کے فرمایا ہے کہ یہود آپکو حکم بنانے کیوں آتے ہیں؟ ان کے پاس توراۃ ہے اور اس میں (اس قضیہ کے متعلق) اللہ کا حکم موجود ہے پھر اس کو کیوں نہیں مانتے۔ وکیف یحکمونک وعندھم التوراۃ فیھا حکم اللہ ثم یتولون من بعد ذلک معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نیتوں میں کھوٹ ہے، اگر کھوٹ نہ ہوتا تو جو حکم ان کی کتاب میں موجود تھا اس پر عمل کرتے لیکن اسے چھوڑ کر ادھر ادھر حیرا ہیں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی بات کو ماننے والے نہیں ہیں۔ وما اولٰئک بالمومنین اس آیت کے لفظوں سے بظاہر اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ جس معاملہ میں یہود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنانا چاہتے تھے اس معاملہ کے متعلق ان کے صحیفون میں حکم الٰہی موجود تھا۔ اس سے یہ کسی طرح نہیں ثابت ہوتا کہ آنحضرت کے عہد تک یہود کے پاس اصل توراۃ بھی موجود تھی۔

کسی مجموعہ میں اگر دس پانچ باتیں صحیح ہوں اور باقی غلط تو کیا اس سے پورے مجموعہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائیگا عہد رسالت کے صحیفوں کی کیا خصوصیت ہے، آج بھی دنیا میں صحف قدیمہ کا جو دفتر موجود ہے اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سراپا محرف ہے اور اس میں حق کی دس پانچ باتیں بھی محفوظ موجود نہیں ہیں؟ لیکن کیا حق کی انہی چند باتوں کی بنا پر ہم ان صحیفوں کے متعلق یہ دعویٰ بھی کر سکتے ہیں کہ یہ وہی اصل صحیفے ہیں جو صاحب شریعت پر خدا کی طرف سے اترے تھے؟! اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر آیت دکیف یحکمونک سے توراۃ کے متعلق اس سے زیادہ کا اور کیا ثبوت دیا جا سکتا کہ اسمیں اس خاص معاملہ کے متعلق اللہ کا حکم موجود تھا اور بس لیکن کسی ایک حکم کے وجود ہونے سے پورے مجموعہ کو تو صحیح نہیں کہا جا سکتا؛ چنانچہ ہمارے محترم تنقید نگار نے بھی اس حقیقت کو محسوس فرمایا ہے اور آگے چلکر قرآن کی تصدیق و شہادت کو صحف سماوی کے اسی حصہ تک محدود سمجھ لینے کی دعوت دی ہے جتنا صحیح ہو فرماتے ہیں کہ "اگر یہ کہا جائے کہ کچھ حصہ صحیح حال میں تھا اور کچھ محرف ہو چکا تھا تو قرآن کی تصدیق و شہادت کو اسی حد تک محدود سمجھ لینے میں کیا مضائقہ ہے"۔ لیکن گذارش یہ ہے کہ ایسا سمجھ لینے میں نہ صرف یہ کہ مضائقہ ہوگا بلکہ ایک آیت کی تمام وسعت برباد ہو جائے گی۔ اور پھر اس اہتمام خاص کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر قرآن کی آیتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلعم کے عہد تک یہود کے پاس اصل توراۃ موجود تھی تو پھر کسی کے کہنے سے اس کے حصے بخرے کیوں کیجیے؟ اور قرآن کی تصدیق و شہادت کو ایک محدود حد تک سمجھنے کی دعوت کیوں دیجیے؛ اس تفریق سے خود پتہ چلتا ہے کہ آپ کے نزدیک بھی عہد رسالت میں صحف قدیمہ کے صحیح اور اصل نسخے موجود نہ تھے۔ چنانچہ اور آگے چلکر سورہ بقرہ کی آیت ایمان کے ذیل میں آپ نے اس حقیقت کا اعتراف فرمایا کہ "نزول قرآن کے زمانہ میں اگلی کتابیں صحیح حال میں نہ موجود تھیں اور نہ پیش کیجاتی تھیں"۔ یہی مقصود ہمارا بھی تھا۔

بہر حال اس تسلیم کے بعد کہ عہد رسالت میں اگلی کتابیں صحیح حال میں موجود نہ تھیں، ہمارے اور آپ کے اختلاف کا ایک حصہ طے ہو جاتا ہے۔ اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ جب کتابیں صحیح حال میں نہ تھیں تو پھر قرآن نے کس کتاب کی تصدیق کی؟ آپ فرماتے ہیں کہ "قرآن نے اصل کتاب کی تصدیق کی ہے یعنی قرآن اس کتاب کا مصدق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی، عہد رسالت میں جو محرف صحیفے تھے ان کا مصدق نہیں ہے۔" بہت اچھا! ہم کو اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی تامل نہیں ہے آپ مصدقا لما بین یدیہ، کا یہ ترجمہ کر سکتے ہیں کہ قرآن اگلے صحیح صحیفوں کا مصدق ہے کیوں کہ قرآن مجید میں اگر بین یدیہ کے معنی سامنے کے آتے ہیں تو خود قرآن ہی نے اس کو ماسبق اور ماقبل کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں فرمایا:

هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ	وہی ہے جو باران رحمت سے آگے آگے
بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (۷: ۵۷)	ہوا اڑا کر بھیجتا ہے۔

سورۃ السبا میں آیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ	نہیں ہے یہ تمہارے لئے مگر ایک ڈراوا
عَذَابٍ شَدِيدٍ (۳۴-۴۶)	ایک سخت عذاب سے پہلے

سورہ مجادلہ میں فرمایا گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ	مسلمانو! جب تم کو پیغمبر کے کان میں کوئی
الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ	بات کہنی ہو تو کان میں عرض مطلب
نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَكُمْ	کرنے سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو یہ تمہارے لئے
وَأَطْهَرُ (۵۸: ۱۲)	بہتر ہے اور نہایت پاکیزگی کی چیز ہے۔

اس لئے اگر بین یدیہ کے معنی ماقبل و ماسبق کے لیجئے تو مصدقا لما بین یدیہ

میں قرآن کی تصدیق و شہادت کا ایک صحیح پہلو پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ ہر وحی، دوسری وحی کی مصدق ہوتی ہے اس لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن بھی اگلی وحیوں کا مصدق ہے۔ سورہ یوسف میں شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ (۱۲: ۱۱۱) لیکن جہاں مصدقا کا لفظ 'ما معکم' کے ساتھ آیا ہے وہاں دقت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ 'ما معکم' کے معنی ماسبق وماقبل کے نہیں آتے۔ پھر کیا 'ما معکم والی' آیتوں میں قرآن کو عہد رسالت کے محرف صحیفوں کا مصدق قرار دیا جائے گا؟ دشتان بینہما

اصل میں یہ تمام زحمتیں محض اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ خواہ مخواہ کے لئے مصدقا کو تصدیق و شہادت ہی کے معنی میں استعمال کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے ورنہ اگر لفظ کو اس کے دوسرے معنی کسی کو اس کی امید و خیال کے مطابق سچا ثابت کر دینا میں استعمال کر دیا جائے تو یہ زحمتیں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ اس صورت میں قرآن، ما انزل کا بھی مصدق ہو سکتا ہے۔ ما بین یدیہ کا بھی مصدق ہو سکتا ہے، اور ما معکم کا بھی مصدق ہو سکتا ہے اور حتی کہ آج جو آسمانی صحیفے دنیا میں موجود ہیں، ان کا بھی مصدق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن کے نزول کی پیشین گوئیاں اصل صحیفوں میں بھی تھیں، قرآن کے سامنے جو صحیفے تھے ان میں بھی تھیں، عہد رسالت میں یہودیوں کے پاس جو کتابیں تھیں ان میں بھی تھیں اور آج بھی صحف سماوی کا جو سرمایہ موجود ہے ان میں بھی ہیں اور قرآن ٹھیک ٹھیک انہی پیشنگوئیوں کے مطابق ہے پھر نہیں سمجھ میں آتا کہ اگر لفظ کو دوسرے معنی میں استعمال کرنے سے جس کی نظیریں خود قرآن اور کلام عرب میں بکثرت موجود ہیں۔ تمام کڑیاں ایک سلسلہ سے جڑ جاتی ہیں تو کیوں خواہ مخواہ کے لئے اس کی وسعت کو تنگ کیا جائے؛ وہ بات اپنی جگہ پر رہے اور یہ بات اپنی جگہ پر تو اس میں کیا دشواری پیدا ہوتی ہے؟

اس کے علاوہ یہ بات بھی دقت نظر کے ساتھ دیکھنے کی ہے کہ اس فقرے کا موقعہ استعمال

کس تاویل کو چاہتا ہے؟ یقیناً وہی تاویل اقرب الی الصواب ہوگی جو نظم کلام کے مقتضی کے مطابق ہو، نظم کلام کو چھوڑ کر ہر آیت پر الگ الگ غور کرنا اور ہر آیت سے علٰحدہ علٰحدہ نتائج کا استنباط کرنا قرآن کے حقائق کو ضائع کرنا ہے۔ اس لئے قرآن کے طالب علم کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ نظم کے سررشتہ کو کبھی ہاتھ سے نہ دے۔ سیاق وسباق سے چھین کر جو تاویل اختیار کیجاتی ہے وہ حقیقت میں شاخ بریدہ کے مانند ہوتی ہے۔ اس لئے آئیے نظم قرآن کی روشنی میں ایک سرسری نظران تمام مقامات پر بھی ڈال لیں جہاں جہاں مصدقاً کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپکے بقیہ استدلالات کا جواب بھی آجائے گا۔ اور شاید کہ خاتمہ بحث کسی ایسے نتیجہ پر پہنچا دے جس پر اتفاق کیا جاسکے۔ وباللہ التوفیق۔

قرآن مجید میں سب سے پہلے یہ لفظ سورہ بقرہ کی آیت ۴۱ میں ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کرکے فرمایا کہ: اے بنی اسرئیل! ہمارے وہ احسانات یاد کرو جو ہم تم پر کرچکے ہیں یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم۔ اور تم اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے ہم سے کیا ہے، ہم اس اقرار کو پورا کریں گے جو ہم نے تم سے کیا ہے اور ہم ہی سے ڈرتے ہو۔ واوفوا بعھدی اوف بعھدکم وایای فارھبون۔ وہ عہد کیا تھا جس کے پورا کرنیکا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مطالبہ فرمایا ہے؟ اس کو تفصیل کے ساتھ سورہ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ میقات کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں نہایت تضرع وزاری کے ساتھ یہ دعا فرمائی کہ پروردگارا دنیا وآخرت دونوں جہان کی بہتری ہمارے نام لکھ دے ہم تیری ہی طرف رجوع ہوے واکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ انا ھدنا الیک تو بارگاہ الٰہی سے یہ جواب آیا کہ ہمارا جو عذاب ہے اس کو ہم جس پر چاہتے ہیں نازل کرتے ہیں اور ہماری جو رحمت ہے وہ اہل نااہل سب کو شامل ہے، ہمارا خزانہ رحمت

وقف عام ہے۔ قال عذابی اصیب بہ من اشاء ورحمتی وسعت کل شیء تو اپنی رحمت کو ہم خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ دیں گے جو پرہیزگاری اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے فساکتبہا للذین یتقون ویؤتون الزکوٰۃ والذین ہم بآیتنا یؤمنون وہ لوگ جو ہمارے نبی امی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں گے، جن کی بشارت کو اپنے ہاں توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو اچھے کام کرنے کا حکم دیں گے، برے کاموں سے روکیں گے اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کریں گے، اور سخت احکام کے بوجھ جو ان پر لدے ہوئے ہیں اور پھندے جو ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان سب کو اتار پھینکیں گے الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندہم فی التوراۃ والانجیل یامرہم بالمعروف وینہٰہم عن المنکر ویحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث ویضع عنہم اصرہم والاغلال التی کانت علیہم پس جو لوگ اس پیغمبر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے، ان کی حمایت کی، اور ان کو مدد دی اور جو نور ہدایت یعنی قرآن ان کے ساتھ بھیجا گیا اس کی اتباع کی تو یہی لوگ کامیاب ہیں۔

فالذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ہم المفلحون اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اسی ایمان بالقرآن کے عہد کو پورا کرنے کا مطالبہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فقرہ مابعد میں بھی اس معاہدہ کی مختصر توضیح موجود ہے فرمایا کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل فرمایا ہے کیونکہ یہ قرآن وہی قرآن ہے جس کے متعلق پیشین گوئیاں تمہارے صحیفوں میں موجود ہیں، وامنوا بما انزلت مصدقا لما معکم۔ دیکھ لو یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے یا نہیں؟ اگر انہی کے مطابق ہے تو پھر کم از کم تم کو تو اس قرآن کا اولین منکر نہ بننا چاہیے ولا تکونوا اول کافر بہ

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھکر غور فرمایئے کہ اس موقعہ پر اس فقرے کی جچتی ہوئی تاویل کیا ہوسکتی ہے؟ یہ کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ جو تمہارے صحیفوں کی تصدیق کرنے والا ہے؟ یا یہ کہ اس قرآن پر ایمان لاؤ جو ٹھیک ٹھیک تمہارے صحیفوں کی خبروں کے مطابق ہے۔ اس آیت میں "ولا تکونوا اول کافر بہ" خاص طور پر قابل غور ہے۔ یہود کو اولین منکر بننے سے کیوں روکا گیا آخر مشرکین بھی تو اس انکار میں پیش پیش تھے؟ یہود کو اس لئے روکا گیا کہ قرآن، مصدقا لما معکم تھا یعنی یہود کے صحیفوں میں اس کی بشارتیں موجود تھیں اور یہ ٹھیک انہی بشارتوں کے مطابق تھا۔ پس قرآن کو جس وضاحت کے ساتھ اپنے صحیفوں کی بشارتوں کی وجہ سے یہود پہچانتے تھے، اس قدر دوسرے نہیں پہچان سکتے تھے۔ حتیٰ کہ قرآن کا بیان ہے کہ وہ اس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح باپ اپنے بیٹوں کو الذین اتینٰھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم اس لئے یہود کو اس کتاب کا اولین منکر بننے سے روکا گیا کہ جب قرآن تمہارے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہے اور تم اچھی طرح سے اس کو پہچان چکے کہ بلاشبہہ یہ وہی کتاب موعود ہے جس کا ذکر توراۃ و انجیل میں آیا ہے اور جس پر بہت پہلے ہم سے ایمان لانے کا عہد لیا جا چکا ہے۔ تو پھر تم سب سے پہلے اس کے منکر کیوں بنتے ہو۔ تم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

غور کیجئے، موقعہ کے لحاظ سے دونوں تاویلوں میں کونسی تاویل زیادہ موزوں ہے؟ جو موزوں ہو اسی کو اختیار کر لینا چاہئے۔

اس کے بعد پھر یہ فقرہ اسی سورہ کی آیت (۸۹) میں آیا ہے۔ اوپر یہود کے نفقہ کی نہایت دردانگیز تفصیلات بیان ہوتی چلی آرہی تھیں پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے اصل حقیقت ان لفظوں میں کھول کر بیان فرمایا ہے کہ یہود نہایت شریر ہیں، دنیا کی محبت ان کے دل میں اسقدر رچ گئی ہے کہ آخرت کی ان کو کوئی پرواہی نہیں ہے اولٰئک الذین اش

الحیوٰۃ الدنیا بالاٰخرۃ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات
کے خلاف خدا کا حکم لیکر آیا تو پہلے تو وہ اس کے مقابلہ میں اکڑ گئے پھر بعض پیغمبروں کی تکذیب
کی اور بعض کو قتل کر ڈالا۔ افکلما جاء کم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبرتم ففریقا
کذبتم وفریقا تقتلون اور لطف یہ کہ اپنے اس گناہ عظیم پر خوش بھی ہیں کہ ہمارے دل غلافوں
کے اندر ہیں۔ اپنے دین کے سوا کسی اور کی بات ہم پر اثر نہیں کرتی۔ وقالوا قلوبنا غلف۔
لیکن حقیقت میں یہ ان کو دھوکا ہے۔ بات یہ نہیں ہے جو یہ سرکش کہتے ہیں۔ بلکہ ان کے کفر کی وجہ
سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ملعون کر دیا ہے۔ اسی لئے ان میں سے اکثر دین حق کو نہیں مانتے ہیں۔
بل لعنھم اللہ بکفرھم فقلیلا ما یؤمنون۔ یہ ان کی ملعونیت نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ جب خدا
کی طرف سے ان کے پاس وہ آخری کتاب آئی جو مصدقا لما معھم ہے یعنی ان کی کتابوں کی
خبروں کے عین مطابق ہے۔ اور بعینہ وہی کتاب ہے جس کتاب کے وسیلے سے یہ یہود پہلے سے کافروں
کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ تو ان ملعونوں کی جانی اور پہچانی ہوئی چیز جب آموجود
ہوئی تو یہ اس کا انکار کرنے لگے ولما جاءھم کتاب من عند اللہ مصدقا لما معھم و
کانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا۔ فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ۔ اگر اس آیت
میں مصدقا لما معھم کا مطلب تصدیق کرنے والا قرار دیا جائے تو پھر کانوا من قبل یستفتحون
علی الذین کفروا سے اس کا کیا ربط ہوگا؟ اور فلما جاءھم ما عرفوا کے کیا معنی ہوںگے۔
آگے فرمایا کہ اتنی وضاحت کے بعد اگر یہود محض حسد و بغاوت کے وجہ سے اللہ کی اتاری
ہوئی کتاب کا انکار کرتے رہے ہیں تو وہ حقیقت میں نہایت ہی بری معاوضے کے بدلے اپنی
جانوں کا سودا کر رہے ہیں۔ بئسما اشتروا بہ انفسھم ان یکفروا بما انزل اللہ بغیا
ان ینزل اللہ من فضلہ علی من یشاء من عبادہ یہ انکی محض فاسدانہ بغاوت ہی تو ہے کہ

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن اتارا ہے اس پر ایمان لے آؤ۔ واذا قیل لہم اٰمنوا بما انزل اللہ تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اس کے علاوہ دوسری کتاب کو نہیں مانتے ہیں قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما وراءہ۔ حالانکہ جس قرآن کا یہ انکار کر رہے ہیں وہ ایک سچی کتاب ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ سچی کتاب ہے بلکہ ان سرکشوں کے صحیفوں کی مصدق بھی ہے۔ ہر کتاب میں اس قرآن کے اترنے کی بشارت دی گئی تھی جس سے یہ معاندین اچھی طرح واقف ہیں۔ اور یہ قرآن ٹھیک انہی بشارتوں کے مطابق ہے وھو الحق مصدقا لما معھم۔ لیکن بایں ہمہ اس قرآن کا انکار بھی کرتے جاتے ہیں، اور یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ ہم تو اپنے ہی صحیفوں کو مانتے ہیں۔
اگر واقعی یہ اپنے صحیفوں کو مانتے جب تو کسی طرح قرآن کا انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ ایک تو "حق" ہے دوسرے "مصدقا لما معھم" ہے۔ خود ان کے صحیفے اس قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بالتوراۃ کا دعویٰ صرف زبانی ہی جمع خرچ ہے۔ آج جس طرح یہ یہود باوجود توراۃ کی اس تصدیق و شہادت کے کہ قرآن اللہ کا اتارا ہوا نور ہدایت ہے۔ جب تک اس کی اتباع نہ کروگے، فلاح نہیں پا سکتے، قرآن کے انکار پر اڑے ہوئے ہیں، اسی طرح ان کے اگلے اپنے وقتوں میں حکم صریح کے ہوتے ہوئے اللہ کے پیغمبروں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ پھر ذرا ان سرکشوں سے یہ تو پوچھئے کہ اگر تم ایمان والے ہوتے تو توراۃ کے حکم صریح کے ہوتے ہوئے اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کر دیتے قل فلم تقتلون انبیاء اللہ من قبل ان کنتم مومنین۔ پس ان کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے۔ حق سے انحراف ان کی موروثی بیماری ہے، یہ ہمیشہ اللہ کی اتاری ہوئی باتوں سے بے پرواہی رہے ہیں۔ قرآن کو بھی جو باوجود اتنی وضاحت کے نہیں مان رہے ہیں

تو اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ یہود اس انحراف عن الحق کا انکار نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تو واقعہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس کھل کھلی نشانیاں لیکر آچکے تھے۔ لیکن ان تمام نشانیوں کو دیکھ لینے کے بعد بھی جب موسیٰ علیہ السلام چند دنوں کے لئے طور پر توراۃ لینے تشریف لیگئے تو ان یہودیوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی ثم اتخذتم العجل من بعدہ۔ اور پھر جب وہ توراۃ لے کر آئے تو ہم نے انہی یہودیوں کے بزرگوں سے توراۃ کے متعلق اس بات پر پکا عہد لیا تھا اور وہ بھی اسطرح کہ ان کے سروں پر کوہ طور کو لاکر لٹکا دیا تھا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اس کو مضبوط سے پکڑے رہنا۔ اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس کو سننا اور یاد رکھنا۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ۔ خُذُوْا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاسْمَعُوْا۔ لیکن جانتے ہو کہ معجزات کے اس انبوہ میں بھی انھوں نے کیا جواب دیا؟ یہ جواب دیا کہ سنتے تو ہیں لیکن مانیں گے نہیں قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا۔ اس لئے اگر آج توراۃ کی تصدیق و شہادت کے باوجود یہود قرآن کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ دیکھو قرآن سے اعراض کے لئے جبرئیل کی دشمنی وعداوت کا ایک افسانہ گڑھ لیا ہے۔ حالانکہ اس فرشتہ نے یہ قرآن خدا کے حکم سے تمھارے دل میں ڈالا ہے، جو اگلے صحیفوں کی خبروں کے عین مطابق ہے فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ مصدقا لما بین یدیہ یہ بات تنہا ان کو قرآن کی صداقت کو تسلیم کر لینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن ان سرکش یہودیوں نے تو اسقدر شرارت پر کمر باندھی ہے کہ جب کبھی کوئی قول کر لیتے ہیں تو ان میں کا کوئی نہ کوئی فریق اس کو بالائے طاق رکھدیا کرتا ہے اوکلما عٰھدوا عھدا نبذہ فریق منھم۔ چنانچہ دیکھو جب ان کے پاس خدا کی طرف سے رسول (عربی صلعم) آئے اور ٹھیک اسی کتاب کی خبروں کے مطابق آئے جو ان یہودیوں کے پاس ہے تو ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب توراۃ کو ایسا پیٹھ پیچھے

پھینکا کہ گویا ان کو کچھ خبر ہی نہیں نبذ فریق من الذین اوتوا الکتب کتٰب اللہ وراء ظھورھم کانھم لایعلمون۔ اگر مصدقاً کے معنی تصدیق کے لئے جائیں تو پھر تورات کو پیٹھ کے پیچھے پھینکنے کا کیا مطلب ہوگا؟

غور فرمائیے ان تمام آیات میں قرآن و نبوت کے اثبات کے لئے موقعہ کس تاویل کو چاہتا ہے؟ اور لفظوں سے کونسی تاویل مترشح ہوتی ہے؟ نبی اور قرآن کی تصدیق و شہادت اگلے صحیفوں کے متعلق؟ یا اگلے صحیفوں کی تصدیق و شہادت نبی اور قرآن کے متعلق؟

اس سورہ میں جس بسط و تفصیل کے ساتھ رسول اور قرآن دونوں کے اثبات کے لئے یہ فقرہ استعمال کیا گیا ہے، اس تفصیل کے ساتھ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن دیکھئے ہر جگہ رسول اور قرآن کے اثبات کا ایک ہی انداز ہے اور ہر جگہ یہ فقرہ ایک ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس لئے یہ جداگانہ تقسیم کرنی کہ رسول کے لئے تو لفظ کو دوسرے معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے باقی قرآن کے لئے نہیں، نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ قرآن اور رسول دونوں دو چیزیں نہیں ہیں تفصیل آگے آتی ہے۔

اس کے بعد یہ فقرہ سورہ آل عمران میں تین جگہ آیا ہے۔ سب سے پہلے شروع سورہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متعلق بیان فرمایا کہ:

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	اسی نے تم پر یہ کتاب برحق اتاری جو
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ	اگلے صحیفوں کی مصدق ہے۔

پھر آیت ۴۹ میں حضرت مسیح کے متعلق فرمایا کہ:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ	میرے سامنے جو تورات موجود ہے میں اس کا مصداق ہوں

ان دونوں آیتوں میں مصدق سے کیا مراد ہے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ دونوں جگہ اثبات

رسالت و نبوت ہی کا موقعہ ہے۔ اس لئے وہی پہلو راجح ہوگا جس سے ثبوت کو قوت پہنچے۔ لیکن تیسری آیت کو بھی سامنے رکھ لیجئے تو غور و فکر میں زیادہ آسانی ہوگی۔ آیت ۸۰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے
لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ	بارہ میں تم سے عہد لیا کہ البتہ جو کچھ دوں میں
ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا	تم کو کتاب اور حکمت میں سے اور پھر اس کے بعد آئے
مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ	تمہارے پاس ایک رسول سچا کرنیوالا
قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ	اس چیز کو جو تمہارے ساتھ ہے تو دیکھو اس
اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا	ضرور ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ	فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد
	بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا اچھا تو اس کے گواہ رہو

اور تمہارے ساتھ میں بھی گواہوں میں سے ہوں

نبیوں کے بارہ میں یہود سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب ہم تم کو کتاب یعنی توراۃ اور حکمت یعنی انجیل مرحمت فرمائیں تو تم ان دونوں کتابوں کو ماننا اور پھر ان کے بعد ایک رسول آئے گا جو تمہارے ان صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے عین مطابق ہوگا۔ اس پر بھی ضرور ایمان لانا۔ توراۃ تو ان کو اسی وقت حضرت کلیمؑ کی معرفت مل گئی۔ لیکن جب حضرت مسیحؑ آئے اور یہودیوں نے آپ کی نبوت کا انکار کرنا شروع کیا تو آپ نے اسی میثاق کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی نبوت کو یوں ثابت فرمایا کہ دیکھو توراۃ میں حکمت یعنی انجیل پر ایمان لانے کا عہد مذکور ہے یا نہیں؟ تورات نے بہت پہلے تمہیں بتلا دیا تھا کہ ایک آنے والا آئیگا اور تم کو حکمت کی باتیں بتائے گا۔ سو اس پر ایمان لاناؤمیں چونکہ توراۃ کی اس پیشین گوئی کو سچا ثابت کرنیوالا ہوں۔ اس لئے میری نبوت میں کیونکر شبہ کرسکتے ہو؟ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ

ہیں توراۃ کی اس خبر کو سچا ثابت کرتا ہوا آیا ہوں۔ حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ کو اگر تصدیق و شہادت سے متعلق کر دیجئے تو گو بات ایک حیثیت سے صحیح بھی ہو جائے لیکن آیت کا زور بالکل کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تیسرا عہد رسول عربی (فدیۃ بابی وامی) پر ایمان لانے سے متعلق ہے، اور اس میں یہ صاف تصریح بھی موجود ہے کہ ‘‘لما معکم’’ کا مصدق ہوگا جس کے معنی اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے کہ جو صحیفے ان کے پاس ہوں گے، ان کی خبروں کے عین مطابق ہوگا۔ اس لئے اس تیسرے عہد کو سامنے رکھ کر سورہ کی پہلی آیت پر جو قرآن کے متعلق ہے غور فرمایئے نہایت ہی آسانی کے ساتھ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ یہاں آیت میثاق میں رسول کے لئے جو بات ثابت فرمائی گئی ہے وہی اس آیت میں قرآن کے متعلق بھی ہے۔ یعنی ہم نے آپ پر یہ کتاب برحق اتاری ہے جو اگلے صحیفوں کی خبروں کے عین مطابق ہے۔ دیکھئے آیت میثاق میں انجیل کا تذکرہ ہے اور رسول عربی کا۔ یعنی ایک کے صحیفہ کا اور دوسرے کی ذات اقدس کا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اور اگلی آیتوں میں انجیل کے بجائے حضرت مسیحؑ نے خود اپنی ذات مقدس کو بیان فرمایا ہے اور رسول عربی کی جگہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو ذکر کیا ہے۔ اگر دونوں چیزیں بلحاظ حقیقت ایک ہی نہ تھیں تو ایک کی جگہ دوسری کو کیوں لایا گیا؟ بہرحال آیت میثاق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں بھی یہ فقرہ اسی معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ فقرہ سورہ نساء میں بھی ایک جگہ آیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا	اے لوگو جن کو کتاب دی گئی ایمان لاؤ اس چیز پر
بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ	جو ہم نے اتاری ہے سچ ثابت کرتی ہوئی اس چیز کو
قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى	جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے ہم مٹا دیں چہرے
اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ	پس لوٹا دیں انکو پیچھے کی طرف یا لعنت کریں ان پر جس طرح
السَّبْتِ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۴ : ۴۷)	ہم نے لعنت کی سبت والوں پر اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے

اس آیت میں یہ فقرہ اتنے واضح اور صریح قرائن کے ساتھ گھرا ہوا ہے کہ اختلاف کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی اہل کتاب مخاطب ہیں۔ چہروں کے بگاڑ دینے کی دھمکی دی جا رہی ہے اور اصحاب سبت کے مانند ملعون کر دینے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو نہ ماننا درحقیقت کسی نہایت ہی اہم میثاق کو توڑنا ہے۔ جس کے وہ پہلے سے پابند ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کلام کے اس زور کے ساتھ "مصدقا" کا وہی مفہوم جمع ہو سکتا ہے جو ہم لے رہے ہیں۔

سورہ مائدہ کی آیت ۴۶ - ۴۷ میں یہ فقرہ ایک ہی سلسلہ میں حضرت مسیحؑ، انجیل اور قرآن مجید تینوں کے متعلق آیا ہے۔ اجمالاً اس پر بھی غور کر لیجئے۔

حضرت رحمۃ للعالمین کو مخالفوں اور منکروں کی حماقتوں کو دیکھ دیکھ کر جو روحانی دکھ پہنچتا تھا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں آپ کو تسلی دی ہے۔ کہ آپ ان بے ایمانوں، جھوٹ کے سننے والوں اور حرام کے کھانے والوں کا کچھ غم نہ کیجئے۔ یہ تو چند ٹکوں پر اللہ کی آیتوں کو بیچکر روپیہ کماتے ہیں، پھر ان کو اپنے وعدوں کو پورا کرنے اور نبی موعود پر ایمان لانے کی سعادت کیسے حاصل ہو سکتی ہے! اولئك الذين لم يرد الله ان يطهر قلوبهم۔ ہم نے ان کو اہیودیوں کو تورات دی تھی جس میں ہدایت و نور تھا۔ لیکن انھوں نے اس کو برباد کر دیا اور کفر و ظلم میں جا پڑے۔ آخر میں ہم نے عیسیٰؑ بن مریم کو تورات کی خبروں کے مطابق بھیجا، ان کی بھی انھوں نے تکذیب کی۔ اور ہم نے مسیحؑ کو تورات کی خبروں کے مطابق جو کتاب (انجیل) دی۔ اور جس پر ایمان لانے کا یہ عہد بھی کر چکے تھے اس سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ چونکہ یہود حضرت مسیحؑ اور انجیل دونوں کے مخالف تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقعہ پر دونوں کے اثبات میں خود تورات کی شہادت کو پیش فرمایا تاکہ یہود کی ایک اور شناعت بھی سامنے آجائے۔ باقی خود نصاریٰ نے اپنے ان صحیفوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو معلوم ہے کہ انھوں نے بھی انجیل کی تمام اخلاقی حکمتوں کو برباد کر دیا۔ اور فسق و فجور میں پڑ گئے۔ اب آخر میں ہم نے

آپ کی طرف کتاب برحق اتاری؛ جو توراۃ وانجیل دونوں کی خبروں کے مطابق ہے اور نہ صرف ان کی خبروں کے مطابق ہے بلکہ ان کی اصل تعلیمات کی محافظ بھی ہے۔ آج اگر دنیا میں ان صحیفوں کی اصل تعلیمات کہیں مل سکتی ہیں تو وہ صرف قرآن میں! اس لئے ان بدبختوں کو تو سب سے پہلے ادھر پڑھنا تھا۔ لیکن اگر وہ نہیں بڑھتے اور حجتیں تراشتے پھرتے ہیں تو آپ ان کے غم میں کیوں پریشان ہوجیے، اللہ نے جو کچھ آپ پر اتارا ہے اس کے مطابق بلا کسی رو رعایت کے حکم نافذ فرمایئے۔ اور یہود و نصاریٰ دونوں سے ترک موالات کرلیجے۔ چونکہ یہود و نصاریٰ دونوں قرآن کے دشمن تھے اس لئے یہاں "مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب" فرمایا گیا تاکہ ایک ہی ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں پر حجت قائم ہوسکے۔

حضرت مسیحؑ اور انجیل کی تصدیق میں آپ نے جو تفریق فرمائی ہے۔ وہ بظاہر دلفریب تو ضرور ہے لیکن اس سے بلاغت کا معیار کیونکر بلند ہوسکتا ہے۔ تکرار لفظ اور وحدت معنی تو اسوقت ہوتی جب کہ حضرت مسیحؑ یا انجیل دونوں میں سے کسی ایک کے متعلق یہ فقرہ دوبارہ لایا گیا ہوتا اس کے علاوہ اس تکرار میں فوراً یہ نکتہ بھی ملحوظ ہے کہ انجیل چونکہ بعض باتوں میں توراۃ سے الگ تھی اس نے توراۃ کی بعض حرام چیزیں بھی حلال کردی تھیں ولاحل لکم بعض ما حرم علیکم اسلئے یہود کو تفصیل کے ساتھ سمجھانے کے لئے توراۃ کی تصدیق وشہادت کو حضرت مسیحؑ کے متعلق بھی بیان کیا گیا۔ اور انجیل کے متعلق بھی تاکہ کسی طرف سے بھی شبہہ کا کوئی شائبہ باقی نہ رہجائے۔ اتنے اہم فائدہ کے لئے اگر کوئی لفظ دوبارہ لایا جائے تو کیا اس سے کوئی خوبی نہیں پیدا ہوگی؟

اس کے بعد سورہ انعام کی آیت ۹۲ میں بھی یہ فقرہ آیا ہے۔ اس سورہ کی آیت کا خلاصہ اوپر گذر چکا ہے یہاں بھی یہ فقرہ یہود کے خلاف اثبات قرآن ہی کے لئے آیا ہے۔ اس کے علاوہ سورہ فاطر اور سورہ احقاف میں بھی یہ وارد ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مقامات پر بھی اثبات قرآن ہی کا پہلو راجح ہے

باقی سورۃ الصف میں حضرت مسیحؑ نے اپنی نبوت کے اثبات میں مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ جو فرمایا ہے تو اس کے متعلق تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ اس جگہ لفظ اپنے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف رسول ہو کر آیا ہوں اور اپنے اس دعویٰ پر یہ دلیل پیش کی کہ میں اپنے سے پہلے کی کتاب توراۃ کی پیشین گوئی کو سچا ثابت کرنیوالا ہوں۔ یعنی دیکھ لو تورات نے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر کی جو بشارت دی تھی میں اس کے عین مطابق ہوں یا نہیں۔

اب قرآن مجید کے وہ تمام مقامات آپ کے سامنے ہیں جنمیں یہ فقرہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ ان تمام مقامات کو غور سے دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ یہود یا نصاریٰ کو مخاطب کر کے کسی رسول کی نبوت یا کسی صحیفہ کی صداقت کے ثبوت میں اس فقرہ کو لایا گیا ہے۔ پس اگر قرآن کی تصدیق کو اگلے صحیفوں کے متعلق لیں تو اہل کتاب کے خلاف حجت اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اے کتاب والو! قرآن پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتابوں کا تصدیق کرنے والا ہے اور اگر اس کا مطلب اگلے صحیفوں کی تصدیق و شہادت قرآن کے متعلق قرار دیجئے تو حجت اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اے کتاب والو! قرآن پر ایمان لاؤ جس کی تصدیق و شہادت خود تمہاری کتابیں کر رہی ہیں۔ دوسری حجت پہلی حجت کے مقابلہ میں زیادہ قاطع نظر آتی ہے اتنی قاطع کہ اہل کتاب کے لئے مجال انکار باقی نہیں رہ جاتی اسی لئے تو عہد رسالت کے بعض یہودیوں نے اپنی جماعت کے بعض نادان مگر نیک ممبروں کو اس کے ظاہر کرنے پر ڈانٹ بتائی تھی کہ اتحدثونہم بما فتح اللہ علیکم لیحاجوکم بہ عند ربکم؛

آخر میں عام اطمینان کے لئے یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ یہ تاویل کوئی نئی تاویل نہیں ہے ابن کثیرؒ وغیرہ نے بھی یہ مطلب لیا ہے امید ہے کہ محترم تنقید نگار اس پر غور فرمائیں گے۔

مقالات

اسلامی فتوحات
اور
قوموں کے اختلاط کا اثر عربوں پر

(از جناب مولوی عبداللطیف صاحب اعظمی)

گو آنحضرت صلعم کی حیات ہی میں عرب کے قرب و جوار کی قوموں اور ملکوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت شروع ہو گئی تھی، مگر اس کا دائرہ اثر صرف ملحقات ہی تک محدود تھا۔ آپ کی وفات کے بعد پے بہ پے فتوحات ہوئیں اور مسلمانوں کے تعلقات دوسری قوموں سے بڑھنے شروع ہوئے۔ عراق فتح ہوا تو اس میں اصلی باشندوں کے علاوہ بعض عرب قبائل مثلاً ربیعہ، مضر، انصار تھے۔ اور کچھ فارس کے لوگ آباد تھے۔ جنمیں کچھ مزدکی تھے اور تھوڑے بہت زرتشتی۔

فارس فتح ہوا تو وہاں اہل فارس کے علاوہ تھوڑے سے یہود آباد تھے۔ اور کچھ رومی، جو روم اور فارس کی جنگ میں قید ہو کر آئے تھے۔

شام پر قدیم زمانہ میں مختلف قوموں نے حکومت کی تھی، اس لئے وہ بھی بے شمار تہذیبوں کا گہوارہ تھا۔ وہاں فنیقیوں، اموریوں اور کنعانیوں کی مختلف تہذیبیں پوری طرح نمایاں تھیں۔ فراعنہ مصر، یونان، روم، اور عرب غسان کے آثار بھی ہویدا تھے۔ سب سے آخر میں رومی اس پر حکمران ہوئے تھے۔ اور ظہور اسلام کے وقت ان ہی کا سکہ وہاں جاری تھا۔ ان کا مذہب نصرانیت تھا، اسلام نے

جب اس کو فتح کیا تو یہ تمام تہذیبیں اسکو وراثت میں ملیں۔

سوریہ کی فتح کے وقت اس ملک میں، ارمن، یہود اور قلیل تعداد میں رومی آباد تھے اور ان کے ساتھ عرب کے بعض مشہور قبائل مثلاً غسان، لخم، جذام، کلب، قضاعہ اور تغلب کے باشندے بھی تھے۔ ان عرب قبائل کی زبان، عربی اور آرامی سے مرکب تھی۔ یہ اپنے کو شامی شمار کرتے تھے۔ حجاز سے ان کا تعلق محض تجارتی تھا۔ چنانچہ جب عربوں نے لشکرکشی کی تو انھوں نے جنگ میں رومیوں کا ساتھ دیا۔

عربوں نے مصر پر بھی قبضہ کیا جو قدیم مصری، یونانی اور رومی حضارت کا حامل تھا۔ یہاں مصریوں، رومیوں اور یہودیوں سے مخلوط و مرکب بہت سی قومیں آباد تھیں۔ مغربی ممالک مثلاً برقہ، ٹونس، الجزائر، مراکش اور جبل طارق سب عربوں کے زیر حکومت آگئے۔ یہ ممالک رومیوں کے قبضہ میں تھے۔

ان فتوحات نے فاتح اور مفتوح کے درمیان ایک قوی تعلق پیدا کردیا۔ اور قدرتی طور پر عرب ان قوموں کے اختلاط سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور حسب ذیل چیزیں اس باب میں خاص طور پر ممد و معین ہوئیں:-

۱۔ فتوحات سے متعلق اسلامی تعلیمات۔

۲۔ مفتوحہ اقوام کا اسلام میں کثرت سے داخل ہونا۔

۳۔ عربوں کا دوسروں سے میل جول۔

فتوحات کے متعلق اسلامی تعلیمات اسلام نے اپنے پیرؤوں کو حکم دیا ہے کہ وہ جب کسی ملک پر فوج کشی کریں تو سب سے پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کریں۔ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ان کی جان و مال محفوظ ہے۔ فرمایا

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا — مجھے حکم ملا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ

لا الہ الا اللہ فاذا قالوھا عصموا — وہ لا الہ الا اللہ کا اعتراف کرلیں اگر انھوں نے

منی دماءھم واموالھم الا بحقھا — یہ کر دیا تو ان کی جان و مال محفوظ ہے الا آنکہ

وحسابھم علی اللہ — ان پر کوئی حق عاید ہو جائے اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے

اگر انکار کریں تو ان سے مطالبہ کیا جائے کہ ملک کو حوالہ کر دیں اور جزیہ ادا کریں۔ مذہبی حیثیت سے انھیں آزادی حاصل ہوگی۔ اسلام کے تمام قوانین عدل و قسط ان پہ جاری کئے جائیں گے۔ خنزیر، خمر، نکاح محارم اور عبادت غیر اللہ کے علاوہ ان سب چیزوں سے روکے جائیں گے جن سے مسلمان روکے گئے ہیں۔ عصمت جان و مال و حفاظت ناموس کے وہ تمام حقوق انکو حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

اگر وہ یہ بھی نہ مانیں تو ان سے جنگ جائز ہے اور لڑنے والوں اور مدد دینے والوں کا خون مسلمانوں کے لئے حلال ہے۔ لیکن عورتیں بچے، بوڑھے، اندھے اور لنگڑے لولے اس سے مستثنیٰ ہوں گے اور اگر وہ جنگ میں شریک ہوں تو ان کا بھی قتل جائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین میں درید بن الصمۃ کو قتل کیا تھا حالانکہ وہ اندھا اور ضعیف تھا۔

اگر محاربین صلح کی خواہش کریں تو امام مناسب سمجھے تو اسے منظور کرلے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا — اگر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اسکی طرف جھکو۔

اس کے بعد آپس میں جو معاہدہ ہو اس پہ عمل کرنا ضروری ہوگا۔ اور اگر صلح نہ ہو سکے بلکہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہو تو قیدیوں کے متعلق قرآن میں یہ حکم ہے۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا — یہانتک کہ جب خوب اچھی طرح انکا زور توڑ لو تو

الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً — قیدکرلو، پھر یا تو احسان کرو یا معاوضہ کے ساتھ چھوڑ دو

یعنی امام کو چاہئے کہ ان پر احسان کرے اور آزاد کردے یا فدیہ لیکر چھوڑ دے یا مسلم قیدیوں سے مبادلہ کرے۔

رسول اللہ صلعم ان صورتوں میں سے جو مناسب خیال فرماتے اس پر عمل کرتے کبھی قتل کروا دیتے، کبھی غلام بنا لیتے۔ غزوہ بدر میں عقبہ بن ابی معیط کو قتل کیا گیا۔ اسی طرح بنی قریظہ قتل کئے گئے۔ مشرک قیدیوں کی ایک جماعت بدر کے مسلم قیدیوں کے مبادلہ میں رہا کی گئی۔ ثمامہ بن اثال حنفی کو آزاد کردیا گیا۔ قریظہ اور ہوازن کی عورتوں اور مردوں کو غلام بنایا گیا۔ انہی وجوہ کی بنا پر قیدیوں کے بارے میں فقہا کا سخت اختلاف ہے۔ بہرحال یہ چار شکلیں ہیں، اور امام کو اختیار حاصل ہے کہ ان میں سے جو شکل مناسب مصلحت خیال کرے، اختیار کرلے۔ شام کے ایک شخص کا جو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے باڈی گارڈ میں شامل تھا، بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے صرف ایک ترک قیدی کو قتل کیا۔ پہلے اسے غلام بنا لینے کا حکم دیا تھا لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ سے بہت سے مسلمان کام آئے ہیں تو آپ نے قتل کا حکم دیدیا[۱]

مفتوحہ غیر محاربین کے متعلق امام کو اختیار رہے۔ چاہے انھیں غلام بنائے یا جزیہ مقرر کرکے آزاد چھوڑ دے۔ حضرت عمرؓ نے سواد (عراق) فتح کیا تو صرف جزیہ مقرر کیا، مالداروں سے فی شخص ۴۸ درہم اور غریبوں سے ۲۴ درہم سالانہ لئے جاتے تھے[۲]۔ قیدی، یا مفتوحہ قوم، جو غلام بنائی گئی ہے، اس کو غنیمت کے اصول پر تقسیم کیا جائے۔ یعنی پانچ حصے کئے جائیں۔ پانچواں حصہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے مخصوص ہو اور بقیہ حصے غانمین پر تقسیم کردئے جائیں۔ پیدل کے لئے ایک حصہ اور سوار کے لئے دو حصے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ غلاموں کا بھی اضافہ ہوا

---

[۱] تفسیر طبری ج ۲۶ ص ۲۲۔ [۲] مبسوط، فتح القدیر اور تاریخ طبری وغیرہ۔

ان غلاموں نے اختلاط و امتزاج کی نئی نئی راہیں کھولیں اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھیں۔

غلامی کا رواج بہت قدیم زمانہ سے دنیا میں قائم ہے۔ اور غلاموں کے ساتھ مختلف قوموں کا سلوک مختلف رہا ہے۔ یہود غلام بناتے تھے، اور ان کے مذہب نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ان کے ہاں کسی غلام کی غلامی کی مدت صرف سات سال تک ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہوجاتا ہے۔ یونانیوں کے یہاں بھی غلامی کی رسم موجود تھی، جس کی تفصیلات طویل اور عبرت انگیز ہیں۔ رومیوں میں بھی اس کا رواج تھا اور ان کے قانون کے رو سے مالک کو اس کے مارنے اور جلانے کا پورا حق حاصل تھا۔ آقا بالکل غیر مسئول ہوتا۔ ان کے زمانہ میں غلاموں کی اسقدر کثرت ہوئی کہ بعض مورخوں کے بیان کے مطابق ان کی تعداد آبادی میں ایک ثلث تھی۔ دوسری صدی عیسوی کے بعد ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کیا جانے لگا۔ قانون نے بھی کچھ رعایت کی۔

عرب ایام جاہلیت میں ، ایک دوسرے سے ہر وقت برسرپیکار رہتے اور غالب قبائل مغلوب جماعت کو غلام بنالیتی تھی۔ وہاں غلاموں کی خرید وفروخت کیلئے خاص طور پر بازار لگتے اسد الغابۃ میں ہے:-

"رسول اللہ صلعم کے مولیٰ، زید بن حارثۃ قضاعہ سے تھے، اور ان کی ماں طئی سے۔ زمانہ جاہلیت میں قید کئے گئے۔ ان کی ماں اپنی قوم بنی معن سے ملنے گئی تھیں، کہ بنی القین بن جسر کے شہسواروں نے انھیں لوٹ لیا۔ زید گرفتار ہوکر سوق عکاظ میں لائے گئے، وہاں حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی، خدیجہ بنت خویلد کے لئے انھیں خرید ا۔ انھوں نے آنحضرت صلعم کو ہبہ کیا اور آپ نے آزاد کر دیا۔"

عرب غلاموں کے علاوہ قرب وجوار کے ممالک کے بھی غلام بھی وہاں تھے مثلاً حضرت بلال حبشیؓ، سلمان فارسیؓ اور صہیب رومیؓ۔ یہ چیز تمدنی اور معاشرتی اسباب سے تدریجاً انحطاط پذیر حالت میں اسلام میں بھی باقی رہی چنانچہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت اسلام نے بھی دی جیسا کہ غزوہ بنی مصطلق میں ہوا اور آہستہ آہستہ اسلامی فتوحات کی کثرت و وسعت کے اعتبار سے یہ تعداد قدرۃً بڑھتی گئی یہانتک کہ مسعودی المتوفی ۳۴۶ھ کا بیان ہے کہ صرف حضرت زبیر بن عوام کے پاس ایک ہزار غلام اور ایک ہزار لونڈیاں تھیں۔ اور چونکہ اسلام نے آقا و مولیٰ کے تعلقات میں ایک قسم کی خاندانی اور نسلی وابستگی کی شان پیدا کردی تھی اس لئے تعلقات کی جڑیں اسقدر دور دور پھیل جاتی تھیں کہ کچھ دنوں کے بعد ان کا کاٹنا ناممکن ہوجاتا تھا اور آزادی کے بعد بھی آقا اور غلام کے خاندان میں ایک طرح کا تعلق باقی رہتا تھا جسے ولاء کہتے تھے۔ مثلاً زید بن حارثہ، آنحضرت صلعم کے "مولیٰ" یعنی آپکے آزاد کردہ غلام تھے۔ اسی طرح اگر کسی غلام کی آزادی کسی قبیلہ کی طرف سے عمل میں آتی تو وہ اس قبیلہ کی طرف منسوب ہوتا مثلاً مولیٰ بنی ہاشم، مولیٰ ثقیف۔ اور اس نسبت کا یہ فائدہ ہوتا کہ اگر معتق کے کوئی وارث نہ ہوتا تو غلام وارث قرار پاتا۔

یہ موالی عربی عصبیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ہر قبیلہ کے موالی اسی قبیلہ کی طرف اپنے کو منسوب کرتے اگر جنگ پیش آتی تو انھیں کے ساتھ لڑتے تھے عزت و ناموس کے تمام کاموں میں ان کے ساتھ شرکت عمل کرتے۔

غلامی اور ولاء کے اس نظام نے فاتح قوم کے عقلی شعور اور اس کے خانگی اور معاشرتی احوال و معاملات پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی خاندانوں میں ایران، روم، شام اور مصر و بربر وغیرہ کے عناصر بھی داخل ہوگئے۔ اور ان کے غیر مخلوط اور خالص ہونے کی جو شان تھی وہ باقی نہیں رہی۔ ان کے

اندر ایسی اولادیں پیدا ہوئیں جو باپ کی طرف سے عربی اور ماں کی طرف سے غیر عربی تھیں۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ عربوں کے اندر غیر عربی خون، غیر عربی تمدن، غیر عربی احساسات وجذبات داخل ہوئے۔

زمخشری المتوفی ۵۳۸ھ نے اپنی کتاب ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ "حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں صحابہؓ کے پاس فارس کے قیدی آئے، ان میں بادشاہ فارس، یزدجرد کی تین لڑکیاں بھی تھیں تمام قیدی بیچے گئے۔ حضرت عمرؓ نے یزدجرد کی لڑکیوں کو بھی بیچ دینے کا حکم دیا لیکن حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا کہ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ساتھ عوام کی لڑکیوں کا سا سلوک اچھا نہیں۔ پوچھا پھر کیا کرنا چاہیئے؟ انھوں نے کہا کہ ان کی قیمت لگائی جائے جو ادا کرے سے لے۔ چنانچہ ان کی قیمت مقرر کی گئی اور حضرت علی بن ابی طالبؓ نے ان میں سے ایک عبداللہ بن عمر کو دی، جن سے سالم پیدا ہوئے، ایک حضرت حسینؓ کو، جن سے زین العابدین پیدا ہوئے۔ اور تیسری محمد بن ابی بکر صدیقؓ کو، جن سے قاسم پیدا ہوئے۔

مبرد المتوفی ۲۸۵ھ کی کتاب الکامل میں ہے کہ "پہلے اہل مدینہ لونڈیوں سے اولاد پیدا کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ زین العابدین بن حسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ جو ان سے ہوئے اور تفقہ اور اتقاء میں سب بڑھ گئے، اس کے بعد لوگ اس کی طرف مائل ہوئے۔

عہد فتوحات کے دوسرے دور میں غلاموں اور موالیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ جنہیں سے بہت سے لوگوں کو تابعین میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے اور یہ لوگ ان میں شمار کیے جاتے ہیں، انھوں نے عہد اسلام میں علم کے جھنڈے کو بلند کیا۔

مفتوحین کا قبول اسلام | اختلاط وامتزاج کا یہ دوسرا دروازہ ہے۔ مفتوح قومیں نہایت کثرت سے اسلام میں داخل ہوئیں اور وہ عربوں میں اس طرح گھل مل گئیں گویا انھی میں سے تھیں۔

ابرویز چار ہزار آمیوں کے ساتھ جنگ قادسیہ میں شریک تھا۔ رستم کی فوج اس کے علاوہ تھی۔ مجوسیوں کو جب شکست ہوئی تو شکست خوردہ فوج پوری کی پوری اسلام میں داخل ہوگئی، اور حضرت سعدؓ کے ساتھ جنگ مدائن و جلولا میں شریک ہوئی۔ مسلمان جب کوفہ واپس آئے تو یہ نو مسلم فوج بھی ساتھ آئی اور عربوں کے اندر پوری طرح گھل مل گئی۔

اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جن سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

اسلام میں لوگوں کے کثرت سے داخل ہونے کے چند اسباب ہیں مثلاً

۱۔ اکثر لوگ اسلام کی خوبیوں اور اس کی سچائی کی بناپر اسے پسند کرتے تھے۔ عقائد اسلام کی وضاحت اور ان کی سادگی اس سلسلہ میں بہت مؤثر ثابت ہوئی۔

۲۔ بعض لوگ جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام میں داخل ہوجاتے تھے۔ چنانچہ حجاج کے زمانہ میں ایک گورنر نے شکایت کی کہ" خراج بہت کم ہوگیا ہے، اہل ذمہ کثرت سے مسلمان ہوگئے ہیں اور شہروں میں جا بسے ہیں۔" اس بناپر حجاج نے اسلام لانے کے باوجود ان سے جزیہ وصول کیا اور ان کی گریہ وزاری کی مطلق پرواہ نہیں کی۔[1]

۳۔ کچھ لوگ اس لئے اسلام کو ترجیح دیتے تھے کہ غیر مسلم ہونے کی حالت میں وہ ایک قسم کی ذلت محسوس کرتے تھے۔ اسلام حکومت کا مذہب تھا، اس لئے قدرتی طور پر مسلمانوں کو حکومت میں خاص حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اسلام کی طرف انتساب ایک قابل فخر چیز تھا۔ اور دوسرے مذاہب کو یہ بات حاصل نہ تھی۔ مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے پیرؤوں کو از راہ فیاضی ان کے مذہبی مراسم کی ادائگی کی پوری آزادی دیدی تھی تاہم وہ اسلام کے قدرتی تفوق کو کیسے دبا سکتے تھے۔

آبادی میں اختلاط | فتح کے بعد، فاتح اور مفتوح دونوں ساتھ ساتھ رہتے اور اجتماعی و اقتصادی

---

[1] ابن الاثیر جزو ۴ ص ۱۷۹

امور میں برابر کے شریک ہوتے۔ ولہوسن (Wellhausen) نے لکھا ہے کہ کوفہ میں نصف سے زائد موالی آباد تھے۔ صنعت وحرفت اور تجارت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ ان میں سے اکثر زبان اور جنس کے لحاظ سے ایرانی تھے۔ یہ شروع شروع میں غلام تھے۔ اسلام لانے کے بعد انھیں آزاد کردیا گیا، صرف 'ولاء' کا رشتہ باقی رہ گیا۔ اس جماعت نے عربوں کے اخلاق اور تمدن پر جو کچھ اثر ڈالا اس سے آج کون انکار کرسکتا ہے؟

اسی طرح تمام مفتوحہ ممالک۔ فارس، شام، مصر، مغرب وغیرہ میں عربی اور اجنبی عناصر اچھی طرح ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ حتی کہ خود جزیرہ عرب، محض جزیرہ عرب نہیں رہا بلکہ جزیرہ مسلمین بن گیا۔ دار الخلافت مدینہ، عہد فتوحات (عہد فاروقی) میں تمام مسلمانوں کا مرجع بنا ہوا تھا۔ قیدی وہیں لائے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا حکم تھا کہ مفتوحہ ممالک میں غنیمت اور قیدیوں کی تقسیم نہ ہو۔ ان کی تقسیم دار الخلافت سے ہو، اس طرح مدینہ اور اس کا قرب وجوار عجمیوں سے بھر گیا۔ حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں بعض عجمی یعنی فارس کے لوگ پیش پیش تھے اور ابولؤلؤ فارسی انکا سرغنہ تھا۔ علاوہ ازیں مکہ ومدینہ حجاج وزائرین کے مرجع تھے، جس کی وجہ سے یہاں کے عرب بے شمار عناصر سے متاثر ہوئے اور ان کی حالت دوسرے صوبوں سے مختلف نہ رہ سکی فرق صرف اسقدر تھا کہ ان میں عربی عنصر غالب تھا اور مفتوحہ ممالک میں عجمی عنصر زیادہ تھا۔

یہ اسباب، جو اوپر بیان ہوئے اختلاط وامتزاج میں خاص طور پر معین ہوئے۔ اسطرح آہستہ آہستہ ایرانی ورومی معاشرت نے، عربی معاشرت کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا۔ اور ایران وروم کے قوانین، قرآن وسنت کے احکام کے ساتھ مخلوط ہوئے۔ فارس کی حکمت اور روم کے فلسفہ نے حکمت عرب کے ساتھ رشتہ جوڑا۔ فارسی ورومی طرز حکومت نے عربی طرز حکومت سے متاثر ہوکر ایک

نئی شکل اختیار کی، غرضیکہ زندگی کے تمام سیاسی و اجتماعی پہلو اس اختلاط سے متاثر ہوگئے۔

اور ہر شخص، جس نے اس اختلاط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، اعتراف کریگا کہ یہ باہمی کسر و انکسار اور فعل و انفعال کے اصول پر ہوا۔ مفتوح قوم جن امور میں فاتح قوم سے بڑھ چڑھ کر ہوتی۔ فاتح قوم پوری رواداری کے ساتھ ان امور کو باقی رکھتی۔ مثلاً عربوں کی فتح کے بعد دفاتر کا نظم و نسق بالکل حسب سابق باقی رہا اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوسکی۔

جو قومیں اسلام میں داخل ہوئیں، ان کے پاس حکمت، امثال اور شعر و ادب کے اپنے ذخیرے تھے اور ان میں سے بعض قوموں کے علوم و فنون اور ان کی تمام علمی و مذہبی تحقیقات ضخیم مجلدات میں مدون تھیں، ان کے اسلام لانے کے بعد یہ سب چیزیں اسلام میں منتقل ہوئیں اور فاتح عرب ان تمام چیزوں سے متاثر ہوئے۔

اس عام تاثیر و تاثر کے علاوہ یہ امر بھی خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مفتوح قومیں اپنے بہت سے قدیم خیالات و معتقدات اپنے ساتھ لائیں جو ان کے اندر باقی رہے اور آہستہ آہستہ دوسروں پر بھی موثر ہوئے۔ اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جو ایرانی، شامی، رومی اور قبطی اسلام میں داخل ہوئے، یک بیک ان کے دماغوں کی سطح اسقدر بلند ہو جاتی کہ وہ اپنے پرانے مالوفات و معتقدات سے یکقلم منکش ہو کر اسلامی عقائد و افکار کو ان کی بالکل اصلی حالت میں قبول کر لیتے ان میں سے ہر ایک کا معبود الگ۔ ان کا خدائی تصور الگ، جنت، دوزخ، شیطان، ملائکہ، آخرت، نبی وغیرہ کے متعلق ان کے نظریات و معتقدات بالکل مختلف اور پھر ان میں سے ہر ایک کے ساتھ قدیم روایات کا ایک انبوہ، ایسی صورت میں اسلام کے پیش کردہ تصورات کو بغیر کسی آمیزش کے قبول کر لینا ان عجمیوں کے لئے نہایت دشوار تھا۔

چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے نو مسلموں نے بعض باتوں کو اپنے قدیم تصور کے مطابق سمجھ لیا تھا۔ علامہ ازدی المتوفی ۳۱۸ھ (تقریباً) نے فتوح الشام میں لکھا ہے کہ "شام کے ایک مسلمان نے ایک شخص سے اس شرط پر بکریوں کے چرانے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی اسے ہبہ کر دے اور وہ رات اسی کے یہاں گذارے۔" جب حضرت فاروق کو اس کا علم ہوا تو فریقین معاملہ کو بلوا بھیجا۔ ان دونوں نے معذرت کی کہ ہم کو اس کی حرمت کا علم نہ تھا۔ ابن عبدربہ المتوفی ۳۲۸ھ نے لکھا ہے کہ "دیہاتی موالی (نومسلم) لاعلمی کی بنا پر مذہب میں بہت تشدد سے کام لیتے تھے۔"[۵۱]

اس کا اثر پہلی صدی ہجری کے اواخر میں، متعدد مذاہب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے فتوحات کے وقت، اس سے خطرہ محسوس کیا تھا۔ ابو حنیفہ الدینوری المتوفی ۲۹۰ھ نے اپنی کتاب الاخبار الطوال میں لکھا ہے۔

"مسلمانوں کو جنگ جلولاء میں اسقدر مال غنیمت ہاتھ آیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا اور فارس کی بہت سی آزاد لڑکیاں بھی گرفتار ہوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت فاروقؓ فرماتے تھے۔ خداوندا! جلولاء کی کنیزوں کی اولاد سے پناہ دے۔"

ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان موالیوں اور ان کی نسل سے اس لئے پناہ مانگی ہو کہ ان کی عصبیت، عربی عصبیت کے بالکل مخالف تھی۔ وہ اپنے سابق مذہبی اثرات کو مکمل طور پر نہیں کر سکتے تھے اور اس سے اسلام کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

فاتح اور مفتوح میں یہی یگانگی برابر قائم رہی۔ یہاں تک کہ مذہبی و اجتماعی معاملات میں، عربوں اور موالیوں (نو مسلموں) کے اختلافات ابھرنا شروع ہوئے۔ فوج میں تجسم کے مسئلہ پر مباحثے

---

[۵۱] العقد الفرید جزء ۲ ص ۹۰-۹۱

ہوئے تھے۔ زبان کا مسئلہ الگ وجہ نزاع تھا۔ دونوں کے جذبات ومیلانات دو بالکل الگ الگ سمتوں میں بہ رہے تھے۔ عربوں کے اجتماعی احوال ومعاملات کی شاہراہ الگ، اور رومیوں اور ایرانیوں کے اجتماعی معاملات ومسائل کی دنیا بالکل علیحدہ جسمانی بعد حضرت صدیقؓ، حضرت فاروقؓ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی فتوحات نے مٹا دیا لیکن روحانی بعد کسی نہ کسی حد تک باقی تھا اور باقی رہا۔

عربی، فارسی، قبطی، یونانی، اور عبرانی زبانوں کی رنگارنگیاں برابر قائم رہیں۔ اب امت اسلامیہ وہ عربی امت نہ تھی جس کی زبان ایک، جس کا دین ایک اور جس کا رجحان ومیلان ایک ہو۔ عہد رسالت کی یہ خصوصیت بہت جلد مٹ گئی۔ اور اس کی جگہ ایک وسیع اور پائدار کشمکش نے لے لی جس میں کبھی ایرانی غالب رہے کبھی عرب اور کبھی رومی۔

عربوں کو سیاست واجتماع اور فلسفہ اور دیگر علوم میں علانیہ شکست ہوئی مگر دو چیزوں میں وہ برابر غالب رہے۔ ایک زبان دوسرے مذہب۔ ان کے تمام مفتوحہ ممالک میں عربی بولی اور سمجھی جاتی تھی اور یہی حکومت اور علوم کی زبان قرار پائی۔ بعض ممالک میں تو ابتک بولی جاتی ہے۔ اسیطرح انکا مذہب (اسلام) بھی ان تمام ممالک کا مذہب قرار پایا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان دونوں چیزوں کو کچھ نہ کچھ نقصانات بھی پہنچے۔ مثلاً زبان میں بہت سے عجمی الفاظ اور عجمی ترکیبیں داخل ہوگئیں۔ اور لحن اسقدر عام ہوگیا کہ زبان کی حفاظت کے لئے قوانین وضع کرنے پڑے۔ مذہب اس کے مقابل میں کم متاثر ہوا تاہم مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے، بہت سے مذاہب وضع ہوگئے۔ اور اس کے ہر گوشہ میں ایسی چیزیں داخل ہوگئیں جو مختلف فرقوں کے درمیان ایک مستقل جنگ ونزاع کا باعث ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نزاع کب ختم ہوگی!!

ادبیات

کلام سہیل

از مولوی اقبال احمد خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی

جو تصور سے ماورا نہ ہوا — وہ تو بندہ ہوا خدا نہ ہوا
کون فتنہ تھا جو بپا نہ ہوا — ایک ہونے سے انکے کیا نہ ہوا
در احمد کا جو گدا نہ ہوا — سر وحدت سے آشنا نہ ہوا
جو صحابہ کا خاک پا نہ ہوا — مرتبہ دان مصطفےٰ نہ ہوا
دل اگر درد آشنا نہ ہوا — ننگ ہستی ہوا ہوا نہ ہوا
نالہ اچھا ہوا رسا نہ ہوا — مجھ پہ احسان تو چرخ کا نہ ہوا
زخم کیسا جو دلکشا نہ ہوا — درد کیسا جو خود دوا نہ ہوا
راز وہ کیا جو آگیا لب تک — ساز وہ کیا جو بے صدا نہ ہوا
رتبہ داں تھا جبین عشق کا میں — حسن کے در پہ جبہہ سا نہ ہوا
دل خطاوار اشتیاق سہی — لب گنہگار التجا نہ ہوا
ننگ ہے بے عمل قبول بہشت — یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا
اس کو جینے کی آرزو کیوں ہو — جس کو مرنے کا حوصلہ نہ ہوا
داغ دل کم نہیں ہے سجدے کو — نہ ہوا ان کا نقش پا نہ ہوا
کیسے مانوں کہ آگئی ہے بہار — دل کا اک زخم بھی ہرا نہ ہوا
اپنے نغموں سے آپ بیخود ہوں — نہ ہوا کوئی ہم نوا نہ ہوا

حسن لاتا نہ تاب جلوۂ عشق　خیر گذری کہ سامنا نہ ہوا
کچھ وہی راز بندگی سمجھا　جس کو ہستی کا ادعا نہ ہوا
عشق اور حسن سے سوال کرم　یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا
دوستی کا نبھا ئیں گے جن سے　دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
اپنی ہستی کی آپ کر تعمیر　وہ بھی کیا بندہ جو خدا نہ ہوا
اس تلون کا کیا ٹھکانا ہے　کہ تغافل بھی دیرپا نہ ہوا
شکل زنداں بدل گئی ورنہ　مر کے میں قید سے رہا نہ ہوا

نوک خامہ سے کھول دیں گے سہیل
باب فردوس اگر کھلا نہ ہوا

بس اک مشق ستم وہ وہ ہے نہ آنا ہے نہ جانا ہے　زبان موج ہے اور رقص فطرت کا ترانہ ہے
ستم ہے اور اے صیاد کتنا وحشیانہ ہے　قفس میں ہم ہیں اور آنکھوں کے آگے آشیانہ ہے
ہمارا گریۂ خونیں بھی کتنا بیکسانہ ہے　جگر میں جس کو پالا اسکو آنکھوں سے گرانا ہے
چلے ہیں آج وہ دامن کشاں گورغریباں کو　اسی حیلے سے شاید شمع بالیں کو بجھانا ہے
پڑے ہیں صورت نقش قدم ہم انکے کوچے میں　اٹھانا ہے تو دامن کی ہوا دیکر اٹھانا ہے

سہیل خستہ اپنا دامن تر لیکے آیا ہے
ترا رندو تپش خورشید محشر آزمانا ہے

تلخیصات

جرمنی میں علومِ قرآن کا مطالعہ

میونخ کی علمی اکاڈمی، علوم اسلامیہ خصوصاً علوم قرآن سے متعلق تصنیفات و مخطوطات کی چھان بین میں مشغول ہے۔ اور اس مقصد کے لئے اس نے ڈاکٹر اوٹو برٹزل کو مصر بھیجا ہے۔ گو ان معاملات میں ہم کو ان مستشرقین کی نیک نیتی اور ان کے ذوق پر اعتماد نہیں ہے تاہم ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات سبق لینی چاہئیں۔ ممکن ہے کبھی ان راہوں میں جادہ پیمائی کا ذوق ہم میں بھی پیدا ہو۔

ڈاکٹر اوٹو برٹزل میونخ یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے پروفیسر، میونخ کی علمی اکاڈمی کے روح رواں اور جرمن مستشرقین کی انجمن کے رکن رکین ہیں۔ انھوں نے اکثر عربی ممالک کی سیاحت کی ہے، عرصہ تک بلاد مغرب، الجزائر، مراکش، اور جزیرۃ العرب میں قیام کیا ہے۔ ایک مدت تک بدوؤں کے اندر رہکر ان کے لب و لہجہ کو سیکھا اور ان کے جذبات اور میلانات کا مطالعہ کیا ہے اور جب واپس آئے تو نادر مخطوطات کا ایک پورا خزانہ اپنے ساتھ لائے۔ آخر میں انھوں نے ترکی کی بھی سیاحت کی، وہاں کے ایک ایک کتبخانہ کو چھانا۔ استنبول کے کتبخانہ میں ان کو ایک نادر تفسیر ہاتھ لگی، جو ابوزکریا یحییٰ بن زیاد نے دوسری صدی ہجری میں تصنیف کی ہے اور جو موجودہ تفسیروں میں سب سے قدیم تفسیر خیال کیجاتی ہے۔

ڈاکٹر برٹزل کے پاس علوم قرآن سے متعلق بہت سی نادر کتابیں موجود ہیں جنہیں سے

ایک عظیم الشان کتاب مراجع علوم قرآن سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر موصوف، پروفیسر برگسٹراسر کے ساتھ جو جامعہ مصر کے کلیۃ الادب میں پروفیسر تھے، بہت سی نادر تصنیفات کی ترتیب و تصحیح کی خدمت انجام دے چکے ہیں مثلاً "کتاب التیسیر لابی عمرو الدانی"، "کتاب المقنع فی رسم المصاحف"، "غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء" لابن الجزری۔

مذکورہ اکاڈمی کے اصلی مقاصد کی تشریح ڈاکٹر برٹزل کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"پروفیسر برگسٹراسر کو یہ خیال تھا کہ علوم قرآن کے جس قدر مصادر مل سکیں، سب یکجا کئے جائیں لیکن ابھی وہ اس راہ میں چند قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ اجل نے ان کی تمام آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا اندیشہ تھا کہ ان کے بعد یہ کام، جو تمام عالم اسلامی کی یکساں عنایت و توجہ کا مستحق ہے، جاری نہ رہ سکے گا۔ لیکن اکاڈمی نے اس کام کو جاری رکھا ہے اور اس کے لئے وہ ہم سب کی مشترکہ ہمدردی و تحسین کی مستحق ہے۔"

ڈاکٹر برٹزل کا بیان ہے کہ قرآن مجید کے بعض قدیم نسخے جو تاریخی اعتبار سے نہایت عزیز ہیں امتداد زمانہ سے تلف ہو رہے تھے اور پورا خطرہ تھا کہ اگر دستبرد زمانہ کی سفاکیوں نے ان پر کچھ دنوں کیلئے رحم بھی کھایا تو یا تو وہ چوری جائیں گے یا غفلت سے نذر آب و آتش ہو جائیں گے، ہم نے ان کے معاملہ کو فوراً اپنے ہاتھ میں لیا اور ان کے فوٹو حاصل کرکے ایک مرکز یعنی میونخ میں جمع کر دیا ہے کہ جو لوگ علوم قرآن کی تحصیل و تحقیق میں مشغول ہیں وہ بغیر کسی زحمت و کاوش کے ان سے فائدہ اٹھا سکیں اور اگر چاہیں تو ان کے فوٹو بھی حاصل کر سکیں۔

علوم قرآن کے محققین کی آسانی کے لئے ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ قرآن کریم کی ہر آیت کو علٰحدہ علٰحدہ الواح میں اس کے ان تمام رسم الخطوں میں لکھا جائے جو اب تک مختلف مصاحف میں پائے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ اس آیت کی وہ تمام تفسیریں بھی درج کی جائیں جو تاریخ کے مختلف دوروں میں بے شمار مفسرین نے کی ہیں۔

اکاڈمی اس وقت متعدد قلمی نوادر کی تحقیق و تنقیب اور ان کے فوٹو حاصل کرنے میں مشغول ہے۔ اسکے بعد وہ ان تمام نوادر کو اپنے مصارف سے، یا اگر ممکن ہوا تو دوسرے علمی مراکز کی اعانت سے شائع کریگی۔

بالفعل مندرجہ ذیل نوادر حیز اشاعت میں ہیں۔

۱۔ کتاب التفسیر فی القراءات السبع للامام عمرو بن عثمان بن سعید الدانی (یہ فن قرأت کی سب سے زیادہ صحیح اور معتمد کتاب ہے)

۲۔ کتاب مختصر الشواذ۔ لابن خالویہ

۴ کتاب المحتسب۔ لابن جنی

۵۔ غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء لشمس الدین الجزری

۶۔ رسالۃ فی تاریخ علم القرأت (یہ جرمن زبان میں ہے اور اس میں ان تمام کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔)

۷۔ کتاب معانی القرآن للفراء النحوی (یہ کتاب تمام موجودہ تفسیروں میں قدیم ترین خیال کیجاتی ہے۔ اور نہایت مفید مباحث پر مشتمل ہے۔ مطبع دار الکتب المصریہ قاہرہ میں زیر طبع ہے)

۸۔ کتاب ایضاح الوقف والابتداء مصنفہ ابوبکر بن الانباری۔

جرمنی میں تحریک استشراق کے متعلق ڈاکٹر برٹزل نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔

"جرمنی میں استشراق یعنی علوم اسلامیہ کے تحقیق ومطالعہ کی تحریک پوری تین صدیوں سے جاری ہے۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ عربی لغات اور اسلامی عقلیات کا مطالعہ کیا جائے اور اس پیام کو سمجھا جائے جو اسلام دنیا کے اندر لیکر آیا ہے۔ حکومت نے ابتدا سے اس تحریک کی سرپرستی کی ۱۸۴۳ء سے یعنی جب سے جمعیۃ المستشرقین قائم ہوئی، حکومت نے علما ومحققین کی حوصلہ افزائی اور ان کی تالیفات کی نشر واشاعت کے لئے بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ اور ہالے، برسلاؤ، لیپزگ، بون، ٹوبنگن اور میونخ کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے خاص شعبے کھولنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیں۔

اسلامیات کے مطالعہ ہیں، جنگ سے پہلے جرمنی کو جو شہرت حاصل تھی وہ علی حالہ قائم ہے۔
میونخ کی یونیورسٹی میں، جس میں میں تعلیم دیتا ہوں، اس وقت پندرہ طلبہ اسلامیات کا مطالعہ کررہے ہیں۔ بویرین اکاڈمی، جس کی نمایندگی کی عزت مجھکو اسوقت حاصل ہے، اسلامیات و مشرقیات کا ایک نہایت اہم ادارہ ہے۔ اس نے علوم قرآن کی خدمت کے لئے اپنے کو مخصوص کر لیا ہے۔ اور اس کے ارکین بجا طور پر دعوی کرسکتے ہیں کہ اسوقت وہ عالم اسلامی کی سب سے بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، انھوں نے قرآنی علوم و معارف کے نہایت ہی نایاب نوادر دستبرد زمانہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی حفاظت میں لے لئے ہیں اور انکی عام اشاعت کی فکروں میں مشغول ہیں۔
پروفیسر برگسٹراسر، ڈاکٹر طٰہٰ حسین بک اور پروفیسر ابراہیم مصطفٰے کی اعانت سے ہماری اکاڈمی کا تعلق مصر کی تمام علمی سوسائٹیوں سے بھی ہوگیا ہے۔ اور اکاڈمی، دار الکتب المصریہ اور ازہر کے کتبخانہ کے لئے ان تمام قلمی نوادر کے فوٹو لے رہی ہے۔ جو علم قرات، رسم مصاحف اور تفسیر سے متعلق اکاڈمی کی ملکیت میں ہیں۔
آجکل ہم علمائے جرمنی کی شرکت و اعانت سے "ایک" انسائیکلوپیڈیا آف قرآن تیار کررہے ہیں، جو تاریخ قرآن سے متعلق جملہ مباحث کی ضروری تفصیلات پر مشتمل ہوگی ابتک اسکی تیسری جلد تک ہم پہنچ چکے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ہم ایک ایسی تفسیر بھی تیار کرنے کی فکر میں ہیں جسکی مدد سے لوگوں کو قرآن مجید کے حقائق سمجھنے میں آسانی ہو۔
آخر میں ڈاکٹر برژل نے مختصراً پروفیسر برگسٹراسر کی خدمات کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔
ناموزوں نہ ہوگا اگر چند الفاظ اپنے لایق، اور نامور پروفیسر برگسٹراسر کی نسبت بھی کہوں۔
پروفیسر موصوف مشرقیات کے ایک جید عالم تھے۔ قرآن کے حافظ تھے، تفسیر، حدیث اور فقہ ہر چیز ان کو نوک زبان تھی۔ مختلف اسلامی و فقہی عنوانات پر ان کی بیسیوں کتابیں موجود ہیں۔

ان کا ایک رسالہ "حروف النفی فی القرآن و استعمالہا" مشہور ہے۔ پروفیسر موصوف کا ایک نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عالم اسلامی کے تمام مشہور قاریوں کی آوازیں ایک خاص آلہ کے ذریعہ محفوظ کرلی ہیں تاکہ عندالضرورت ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ایک مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر طہٰ حسین کے اس لب و لہجہ کو بھی اس میں محفوظ کرلیا ہے جس میں وہ سوق عکاظ اور مربد بصرہ کی شعر خوانیوں کی نقلیں کیا کرتے ہیں۔ بعض بدوی قبائل کے لہجے بھی اس آلہ کے ذریعہ سننے میں آئے۔ قریہ معلولہ کے لوگوں کا لب و لہجہ تو ایک نادر چیز ہے۔ "معلولہ" بادیہ شام میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو سامی لغات کی تاریخ میں اس اعتبار سے نہایت شہرت رکھتا ہے کہ وہاں کے باشندے اب تک آرامی لب و لہجہ میں گفتگو کرتے ہیں۔

پروفیسر موصوف نے اپنی زندگی کے تقریباً دس سال اپنی ایک خالص قرآنی تصنیف کے عشق میں بسر کئے۔ وہ قرارت کے متعلق ایک جامع کتاب کی ترتیب میں مشغول تھے۔ اس کیلئے انھوں نے تمام اسلامی دارالسلطنتوں کی سیاحت کی۔ تمام نادر قلمی و غیر قلمی مصاحف کا باہم مقابلہ کیا اور ان کے ایک ایک صفحہ کی تصویریں لیں اور اس پر ہزارہا پونڈ خرچ کئے۔ اور یہ سب کچھ درحقیقت اس ارادہ کی تمہید تھی، جس کی وہ عرصہ سے اپنے دل کے اندر پرورش کر رہے تھے یعنی قرآن مجید کو بالکل جدید طریقوں سے آراستہ کرکے شائع کرنے کی خواہش۔ افسوس ہے کہ اب وہ ہم میں نہیں رہے۔

ع۔ ر ناصر

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں۔ پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں، ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:- اس کتاب میں مولاناؒ کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدائی قسموں کا عمود سورہ (دینونت) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے۔ اسی ضمن میں تمام اہم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موقعِ عبور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "فعلق" سے معاد اور "خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں انکی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت:- ۸ر (باقی سرورق صفحہ ۳ پر ملاحظہ ہو)

نمبر ۲ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۷ء | جلد ۲

فہرست مضامین

شذرات

مدرستہ الاصلاح میں چھوٹے بچوں کے لئے ایک دارالاقامہ کی سخت ضرورت ہے موجودہ دارالاقامہ میں بمشکل سو طلبہ کے رہنے کی گنجائش ہے لیکن اس وقت کم و بیش ڈیڑھ سو طلبہ اس کے اندر رہتے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے طلبہ کو جو تکلیف اور منتظمین کو جو زحمتیں ہیں وہ آسانی سے نہیں بیان کیجا سکتیں۔ بالخصوص اس سال تو اس معاملہ نے کارکنوں کو سخت آزمائش میں ڈالدیا۔ ان کو داخلہ کی بہت سی درخواستیں نامنظور کرنی پڑیں، اور جن طلبہ کو انھوں نے ہمت کر کے لے لیا ان کے لئے قیام کی معمولی سہولتیں مہیا کرنے میں بھی سخت مشکلیں پیش آرہی ہیں۔

مدرستہ الاصلاح نے چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملہ کو ابتداء ایک خاص مقصد کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ بعض دقتوں کی وجہ سے جن میں سب سے زیادہ اہم دارالاقامہ کی تنگی ہے، اب تک اس چیز کی طرف پوری توجہ نہیں کیجا سکی۔ لیکن اب اس معاملہ سے اغماض کرنا ناممکن ہے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ چھوٹے بچوں اور بڑے طلبہ کا تمام نظام بالکل مشترک ہے، جس کی وجہ سے ایک طرف تو چھوٹے بچے ان بہت سی راحتوں اور آسانیوں سے محروم ہیں جو ان کے عمر کے تقاضا سے ایک عمدہ دارالاقامہ میں ان کو حاصل ہونی چاہئیں۔ دوسری طرف ان کی تعلیم و تربیت، اور ان کی آزادی اور ان کے بڑھنے اور ابھرنے کی صلاحیت کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور اہم سوال بھی منتظمین کے سامنے ہے۔ اب تک مدرستہ الاصلاح کی تعلیم و تربیت کا فیض عموماً مسلمین اور غرباء تک محدود رہا ہے لیکن اب متوسطین کا طبقہ بھی اسکی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ یہ لوگ

اپنے بچوں کو اس خواہش کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح میں بھیجنا چاہتے ہیں کہ دو تین سال وہ یہاں کے علمی و مذہبی ماحول میں رہکر ایسی مذہبی تعلیم و تربیت حاصل کرلیں جو آیندہ زندگی میں ان کیلئے مفید ہو سکے۔ اور قدرتی طور پر وہ اس امر کے بھی خواہش مند ہیں کہ ان کے لئے قیام و طعام اور نگرانی و تربیت کی مخصوص سہولتیں مہیا کیجائیں۔ اس قسم کی جو درخواستیں اب تک ہم کو موصول ہوتی تھیں ہم اپنی دقتوں کی بنا پر ان کے جواب میں معذرت عرض کرتے تھے لیکن اس کے لئے لوگوں کا اصرار اس درجہ بڑھتا گیا ہے کہ مجبوراً ہم کو اس معاملہ پر غور کرنا پڑا۔ اور حق یہ ہے کہ اس معاملہ کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ کرنا ایک قومی و مذہبی گناہ ہے۔ مسلمانوں میں امراء و متوسطین کے بچے عموماً انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور آج انگریزی مدارس اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فضا اسلامی تعلیم و تربیت سے جسقدر بیگانہ ہے وہ معلوم ہے اس لئے اس طبقہ کے بچوں کی اگر کوئی دینی خدمت مدرسۃ الاصلاح سے بن آئے تو دریغ نہ کرنا چاہئے کہ اگر ان میں سے ۵ فیصدی نے بھی اپنی آیندہ زندگی میں ہماری ابتدائی تعلیم و تربیت کا کوئی نقش باقی رکھا تو اس عہد میں دین و مذہب کی یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہوگی۔

پس ان حالات کی وجہ سے منتظمین نے بچوں کے لئے ایک علحدہ دارالاقامہ کی تعمیر کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مدرسۃ الاصلاح کے مخصوص ماحول اور اس کے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھکر ان کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک عمدہ نظام کا آغاز کیا جائے۔ اس نظام کا پورا خاکہ ہم کسی اور صحبت میں پیش کریں گے۔ سردست صرف اس قدر عرض کیا جاسکتا ہے کہ انشاءاللہ یہ نظام بچوں کی تعلیم و تربیت کا ایک بہترین نظام ہوگا۔ ہم نے اس کے بعض اجزاء کا تجربہ دو لایق اور مستعد استاذوں کی نگرانی میں شروع کردیا ہے۔ ابھی کام کی ابتدا ہے اور بے شمار دقتیں حائل، لیکن ہم کو پوری امید ہے کہ یہ نظام کامیاب رہے گا اور وہ مسلمان جو چاہتے ہیں کہ کم سے کم مصارف میں ان کے بچے ایک مذہبی ماحول میں رہکر بہتر سے بہتر تربیت

حاصل کر سکیں اس سے پوری طرح مطمئن ہو سکیں گے۔

اس مقصد کیلئے ہم جو دارالاقامہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال اس کے چھ کمرے تعمیر ہوں گے۔ ہر کمرہ پر کم و بیش ساڑھے پانچ سو کی لاگت آئے گی۔ ایک ایسے زمانہ میں، جبکہ اقتصادی زبوں حالی کا شکوہ، ہر زبان پر ہے، اتنی بڑی رقم حاصل کرلینا مشکل کام ہے، بالخصوص ایسی حالت میں تو اور بھی مشکل ہے جبکہ ہمارے سامنے روز کی روٹی کا سوال پوری اہمیت کے ساتھ ہے لیکن ہماری قوم میں ایسے ارباب کرم کی کمی نہیں ہے جو بہت آسانی کے ساتھ ایک ایک کمرے کی تعمیر کی ذمہ داری اپنے سر لے سکتے ہیں۔ اگر وہ توجہ کریں گے تو ہم چند دنوں میں اس کام سے فارغ ہو جائیں گے۔ پس ہم سب سے پہلے انہی کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ناموں سے ایک ایک کمرہ اس دارالاقامہ کے اندر تعمیر کرا دیں۔ وہ اس کام میں اپنا روپیہ صرف کرکے اپنی قومی و مذہبی تعلیم کی ایک ایسی خدمت انجام دیں گے جو انشاء اللہ ان کی قوم کے رتبہ کو اونچا کریگی۔ اس کے بعد ہم اپنے عام مسلمان بھائیوں سے امداد کی درخواست کرتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے مدرسۃ الاصلاح کے ہر ارادہ کی تکمیل میں کارکنوں کی مدد کی ہے اسی طرح اس موقع پر بھی ہماری مدد کریں۔

ہم کو امید ہے کہ ہماری قوم کے اغنیاء اس اپیل پر توجہ کریں گے۔ ہم نے یہ ارادہ محض اس شوق میں نہیں کیا ہے کہ مدرسہ کی عمارات میں اضافہ ہو جائے۔ بلکہ ضرورت نے مجبور کیا ہے کہ حالات کی ناساعدت کے باوجود ہم یہ ارادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور تمام مسلمانوں کی مدد فرمائے۔

کتبخانہ مدرسۃ الاصلاح کی امداد کے لئے جو اپیل ان صفحات میں کی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ارباب کرم نے اس کی طرف توجہ فرمائی۔ اب تک جن ہمدردوں نے اس سلسلہ میں کوئی اعانت فرمائی ہے اس کی تفصیلات ہم قارئین کو پہنچا چکے ہیں۔ آج ایک تازہ بشارت سناتے ہیں۔

رنگون میں، ملا احمد داؤد صاحب مدنی، ایک ذی علم اور صاحب خیر بزرگ ہیں۔ ان کو مدرسۃ الاصلاح کے ساتھ خاص شغف ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے وفود کی پذیرائی اور ان کی امداد و اعانت میں انھوں نے ہمیشہ فیاضی اور سیر چشمی سے حصہ لیا۔ ان کی ملکیت میں عربی کتب کا ایک عمدہ کتبخانہ ہے جو تمام تر مشہور ائمہ و مصنفین و علمائے اسلام کی تالیفات پر مشتمل ہے۔ کتبخانہ مدرسۃ الاصلاح کی اپیل، ہمارے عزیز مولوی نور الہدیٰ صاحب اصلاحی کی وساطت سے موصوف تک بھی پہنچی، اور موصوف نے اپنے کتبخانہ کا ایک قیمتی حصہ مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کے لیے مرحمت فرمایا۔ مولوی نور الہدیٰ صاحب اصلاحی نے کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجی ہے۔ یہ کتابیں تعداد میں ۹۰ ہیں، جن میں سے بعض بعض متعدد جلدوں میں ہیں۔ اور الحمد للہ یہ مجموعہ محض رطب و یابس کا ڈھیر نہیں ہے۔ نہایت مفید اور قیمتی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ابن تیمیہ، ابن قیم، عبد الوہاب شعرانی، امام سیوطی، ابن رشد، علامہ بزدوی، ابوجعفر نحاس، امام غزالی، دبوسی، جاحظ، عیسیٰ ہمدانی، محی الدین ابن عربی، ابن مسکویہ، فیضی، بشر طوفی کے ناموں سے کون ناواقف ہوگا؟ زیادہ تر کتابیں انہی مصنفین کی ہیں۔ اور یقینا ان کے اضافہ سے مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کی عزت بڑھ گئی ہے۔ ہم مدرسۃ الاصلاح کے کارکنوں اور اس کے تمام اساتذہ و طلبہ کی طرف سے مدنی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مدنی صاحب کو جزائے خیر دے۔

کتبخانہ کے لئے ہم نے جب جب اپیلیں کی ہیں یہ بات خاص طور پر ہمارے پیش نظر رہی ہے کہ یہ اپیل ان لوگوں کے کانوں تک پہنچے جن کی ملکیت میں کتابوں کے ذخیرے ہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کا پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مدنی صاحب نے ہماری اپیل پر توجہ فرما کر دوسروں کے لئے راہ کھول دی۔ ہم کو امید ہے کہ دوسرے ارباب علم اس عمدہ مثال

کی پیروی کریں گے اور مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کی امداد کتابیں بھیجکر فرمائیں گے۔ مدرسۃ الاصلاح کے ہمدردوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس کتابیں موجود ہوں گی اور ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاتا ہوگا۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنی کتابیں مدرسۃ الاصلاح کے کتبخانہ کو عنایت فرمائیں کہ طلبہ اور علماء ان سے استفادہ کریں۔ ان کو کیڑوں کی خوراک بنانے سے کیا فائدہ؟

تفسیر سورۃ الشمس، جس کے ترجمہ کی آخری قسط اس پرچہ میں نکل رہی ہے، استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے عام انداز تفسیر سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس میں مولانا بعض اشارات کی رہنمائی میں بعض دقیق مباحث کی طرف نکل گئے ہیں۔ جن سے ممکن ہے بعض لوگ متفق نہ ہوں۔ پچھلے پرچہ کو دیکھکر ایک عزیز نے اس کے اس حصہ کے متعلق اپنے تردد کا اظہار کیا تھا جسمیں مولانا نے حضرت علیؓ کو اس امت میں ناقۂ ثمود کی مثال قرار دیا ہے۔ اس طرح کے مباحث کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ انکی بنیاد محض ذوق اور اشارات پر ہوتی ہے۔ اس لئے ضرور نہیں کہ ہر شخص ان سے متفق ہو سکے۔ ان کو عقائد و ایمانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بات قرین قیاس اور لگتی ہوئی نظر آئے، قبول کر لیجئے۔ اور اگر دل کو نہ بھائے، ذوق ابا کرے، چھوڑ دیجئے۔ مصنف نے خود اس امر کی تشریح کر دی ہے۔ اور ان کے دلائل ان کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے بالکل کافی ہیں۔

آجکل مسلم نوجوانوں نے وقت کے حالات سے متاثر ہو کر جو کروٹ بدلی ہے اس سے ہمارے سن رسیدہ مذہبی پیشواؤں کو بڑا تردد لاحق ہو گیا ہے۔ ان کو اندیشہ ہے کہ یہ نوجوان کانگرس میں جا کر ہند و تہذیب و تمدن کے مقلد اور بالکل بے دین ہو جائیں گے۔ یہ اندیشہ ایک حد تک بجا ہے لیکن اس خطرہ کا علاج کیا ہے؟ نوجوانوں نے جو اقدام کیا ہے یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ ان کے خون میں

حرارت ہے اور حرارت اپنا ایک طبعی خاصہ اور اثر رکھتی ہے۔ پس نوجوان بوڑھوں کی طرح سو نہیں سکتے، اپنی طبیعت سے مجبور ہیں کہ کچھ نہ کچھ کریں اور ایسا کام کریں جس میں زندگی کی سرگرمی اور ولولہ کار کا ہیجان ہو، غیرو حمیت کا مظاہرہ ہو، قربانی اور ایثار کی بلند نظری ہو، مرنے اور مٹنے کی لذت ہو۔

مسلمانوں کے اندر عرصہ سے یہ کاروبار بند ہے۔ علماء مدرسوں میں اور صوفیا خانقاہوں میں پڑے ہوئے سو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی سو جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت نوجوانوں کو کبھی پسند نہ آئے گی۔ ایک زمانہ تک یہ ہوا کہ ان کے بڑے بوڑھے سوتے رہے۔ اور وہ معلوم نہیں گمراہی کی کن کن وادیوں میں بھٹکتے پھرے۔ اب وہ اپنی اس ہرزہ گردی سے اکتا گئے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔ وہ اپنے سامنے نوجوانوں کی ایک صف دیکھ رہے ہیں جو جوش سے بھری ہوئی، امنگوں سے تنی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ اور اس کے آگے آگے بوڑھوں اور سیانوں کی ایک جماعت ہے جو ایثار، قربانی، جانبازی اور تدبیر آپ اپنی نظیر ہے۔ ان کو ایسے خوش قسمت نوجوانوں اور ایسے قابل اور بہادر بوڑھوں پر رشک آتا ہے۔ اور وہ بیتاب ہو ہو کر چاہتے ہیں کہ انہی کے ساتھ نکل جائیں۔ وہ اپنی مُردوں کی بستی سے بیزار ہو گئے ہیں اور قبروں سے جو آوازیں اب تک سنتے رہے ہیں ان سے ان کے کان تھک چکے ہیں۔ اب وہ زندگی اور عمل کی کھوج میں نکلے ہیں۔ پس جن لوگوں کو ان کا مذہب اور ایمان عزیز ہو ان کو چاہیے کہ وہ بستروں سے اٹھیں اور ان کے آگے آگے چل کر ان کی رہنمائی کریں۔ جو لوگ پیچھے بیٹھے ہوئے دور ہی دور سے ان کو ملامت کر رہے ہیں ان کی ملامتیں اب کچھ کارگر نہیں ہو سکتیں۔

ہم کو پورا اطمینان ہے کہ اگر ہمارے علما، میدان عمل کی اگلی صف میں آجائیں اور ایثار و قربانی اور فکر و تدبر کی ویسی مثالیں پیش کریں جیسی ان کے شایان شان ہیں تو ہماری قوم کے نوجوان کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔ اسلام اور اسلامی روایات کی جن باتوں سے آج ان کے اندر ایک عام بے رغبتی پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آج جو لوگ ان چیزوں کے داعی ہیں وہ "نفی محض" ہو کر رہ گئے ہیں۔ یعنی دنیا کے اندر جتنے کام ہیں ان کے نزدیک سب باطل اور گمراہ کن ہیں لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ ٹھیک کام کیا ہے تو اس کا جواب یا تو دیتے نہیں یا دیتے ہیں تو اس کو سنکر انکی پست ہمتی اور اپنی بدقسمتی پر افسوس ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک پست ہمت جماعت کی کوئی چیز عزت نہیں پا سکتی۔ یہانتک کہ اس کی خوبیاں بھی آہستہ آہستہ برائیاں بن جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو بہادر اور بلند نظر ہیں وہ اپنی برائیوں کو بھی دنیا کی نگاہوں میں باعزت بنا دیتے ہیں۔ پس اگر ہمارے علما، چاہتے ہیں کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں مذہبی و قومی روایات کی جگہ باقی رہے تو اس کی صرف ایک ہی سبیل ہے کہ وہ اپنے اعمال سے ان چیزوں کو عزت دیں۔ اگر عمل اور کردار کا جادو قدیم ہندستان کی جاہلانہ حماقتوں کو اس بیسویں صدی میں "حکمت و فلسفہ" کے نام سے پجوا سکتا ہے تو دنیا کی کوئی قوم اسلام اور اسلامی روایات کو مٹانے پر قادر نہیں ہے۔ لیکن ہمتوں کا فرق دیکھئے! ایک وہ ہیں جو اس عقل و دانش کے زمانہ میں گائے پجوا رہے ہیں، مورتوں کے سامنے سجدے کرا رہے ہیں۔ اور مٹے ہوئے ہندوستان کی نہ جانے کن کن خرافات کو زندہ کر رہے ہیں اور انھیں مستقبل کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں اور ایک ہم ہیں کہ کانپ رہے ہیں کہ کہیں مسلمان کانگریس میں جا کر خدا کو چھوڑ کر گائے کی عبادت نہ شروع کر دیں۔ سچ کہا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

معارف القرآن

تفسیر سورۃ الشمس

(۴)

تالیف :- استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ :- امین احسن اصلاحی

حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی مثالیں

۱۲- تم کہو گے کہ حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمانؓ نہایت مظلومیت اور بیکسی کی حالت میں قتل ہوئے، جن کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ شہید ہوئے، جن کی شہادت تاریخ اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ سب سے آخر میں حضرت امام حسینؓ قتل ہوئے، جن کی مظلومیت تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی، پھر تم نے ان میں سے کسی کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے کیوں نہیں تشبیہ دی؟ اس کے لئے حضرت علیؓ ہی کے واقعہ کو کیوں انتخاب کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کا واقعہ ایک مخصوص نوعیت رکھتا ہے۔ آپ کے قتل کی ذمہ داری اس امت پر نہیں ہے۔ آپ کو ایک عیسائی نے شہید کیا۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا کہ آپ کا قاتل ایک نصرانی ہے، تو نہایت خوش ہوئے کہ امت آپ کے قتل کے وبال سے بچ گئی۔ صرف تھوڑے سے اشرار اس جرم سے راضی تھے اور چونکہ یہ پہلا خون تھا اس لئے قانون الٰہی نے امہال سے

کام لیا۔ پس حضرت عمرؓ حضرت زکریا علیہ السلام سے زیادہ اشبہ نظر آتے ہیں۔ جس طرح وہ قربان گاہ اور مسجد کے درمیان قتل ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ بھی نماز کے اندر شہید ہوئے۔ اسی لئے حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ "حضرت عمرؓ کا حلیہ تورات کے اندر موجود ہے"۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ کی بہت سی صفتیں توراۃ میں بیان ہوئی ہیں۔ آیت "ذلک مثلہم فی التوراۃ ومثلہم فی الانجیل" کی تفسیر کے ذیل میں بعض ضروری باتیں ملیں گی۔

حضرت عثمانؓ کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حالت سے زیادہ اشبہ ہے جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام قید کی حالت میں قتل کئے گئے، اسی طرح حضرت عثمانؓ مکان کے اندر بند کر کے شہید کئے گئے پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ سے جو مشابہت حضرت علیؓ کے واقعہ کو ہے وہ کسی دوسرے واقعہ کو نہیں ہے۔ نتائج کے اعتبار سے بھی دونوں بالکل یکساں درجہ کی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کر کے خدا کی امانت سے محروم ہو گئے۔ اور مسلمان حضرت علیؓ کے قتل کی ذمہ داری لے کر خلافت مقدسہ سے محروم ہو گئے۔

باقی رہا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا معاملہ، تو یہ تو ملت مرحومہ کے سینہ کا وہ زخم ہے جو ہمیشہ تازہ رہے گا۔ اور تاریخ کبھی اس کو فراموش نہ کر سکے گی۔ اور یہ درحقیقت اسی بدبختی کا ایک مظہر ہے، جو حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ زہیر نے جنگ کے نتائج کو احمر عاد سے تشبیہ دی ہے۔ اور کیا خوب بات کہی ہے۔

فتنتج لکم غلمان اشام کلهم کاحمر عاد ثم ترضع فتفطم

درحقیقت ایک ائی دس برائیوں کا دروازہ کھولتی ہے۔ پس حضرت علیؓ کے قتل کی صورت میں جو شقاوت ظاہر ہوئی، اسی کی پرورش و رضاعت سے وہ حادثہ ظہور میں آیا، جو حضرت امام حسینؓ کی مظلومانہ شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر اس واقعہ کی جڑ سے اس طرح کے ہزار ہا فتنوں کی

شاخیں پھوٹیں اور پھیلیں اور ان کے سموم اور مہلک ثمرات نہ جانے کن کن صورتوں میں نمودار ہوئے۔ یہ مسلمانوں کے جان و مال کی اباحت کے جو ہولناک اور شرمناک واقعات بار بار پیش آئے یہ سب اسی شجرۂ ملعونۂ فساد کے برگ و بار تھے۔ اور یہی فتنے تھے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبۂ الوداع میں آگاہ فرما دیا تھا کہ

یاایھا الناس، انما المومنون	لوگو، تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
اخوۃ ولا یحل لامری مال اخیہ	کسی شخص کیلئے یہ بات جائز نہ ہوگی کہ اپنے بھائی
الا عن طیب نفس منہ، الا	کا مال لے سوا اس کی اجازت اور خوشی سے۔
ھل بلغت، اللھم اشھد فلا ترجعن	آگاہ۔ میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ اے اللہ تو گواہ
بعدی کفارا۔ یضرب بعضکم	رہ۔ پس اے لوگو، نہ ہو کہ تم میرے بعد حالت کفر میں
رقاب بعض	لوٹ جاؤ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے۔

قرآن مجید نے بھی باہمی جنگ و جدل کو عذاب الٰہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورہ انعام میں ہے:۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ	کہہ دو، کہ وہ قادر ہے اس بات پر کہ تم پر عذاب بھیجے
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ	تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے یا تم کو
اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ	گروہ در گروہ کر کے تم کو باہم ٹکرا دے اور ایک کو دوسرے
بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ اُنْظُرْ كَيْفَ	کا عذاب چکھائے دیکھو، ہم اپنی آیتیں کس طرح
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ	پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں

چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ عذاب نمودار ہوگیا۔ امت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی جماعتوں میں ایسی خونریز جنگیں ہوئیں کہ مسلمان بالکل بے دم ہو کے رہ گئے۔ اور جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کا عذاب دوسری جماعت کو

پھیلا دیا، اور یہ آگ برابر مشتعل رہی۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس کے بعد مسلمانوں پر جتنی آفتیں نازل ہوئیں
وہ تمام تر انہی دونوں گروہوں یا اسی قبیل کی جماعتوں کے ہاتھوں نازل ہوئیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے
نزدیک یہ گروہ بندی اور تفریق اس درجہ مبغوض تھی کہ اس نے اپنے پیغمبر کو اس سے بالکل بری قرار
دیا تھا۔ چنانچہ فرمایا:۔ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیٔ" جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ
پیدا کر دیا، اور گروہ گروہ بن گئے، تم کو ان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح ایک اور موقع پر بھی باہمی
جنگ و جدل کو عذاب سے تعبیر فرمایا ہے" ومن الذین قالوا انا نصاریٰ اخذنا میثاقھم فنسوا حظا مما ذکروا
بہ فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیمۃ" اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے کہا کہ ہم انصاری
ہیں، ہم نے ان سے بھی میثاق لیا، پس وہ بھول گئے ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ ان لوگوں
کو تذکیر کی گئی تھی (یعنی کتاب الٰہی) پس ہم نے بھڑکا دی ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ
قیامت تک کے لئے۔

اس بحث کی اصلی جگہ سورہ حجرات ہے، اس لئے یہاں ان اشارات پر ہم کفایت کرتے ہیں۔

سورہ کے ربط پر دوبارہ نظر

۱۳۔ اس سورہ میں بدبختی اور شقاوت کے انجام کی تفصیل کی ہے۔ گویا پوری سورہ "وقد خاب من دسٰھا"
کے اجمال کی تشریح ہے۔ اور "قد افلح من زکٰھا" جس میں فلاح کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کا ذکر اس
سورہ میں مجمل چھوڑ دیا ہے۔ اس کی توضیح نہیں فرمائی۔ اس کی توضیح بعد کی سورہ (سورۃ اللیل)
میں کی ہے

ماسبق سورہ سے ربط کا پہلو یہ ہے کہ اس میں بتایا تھا کہ بیت اللہ کے چند مقاصد ہیں۔ ایمان
صبر، مرحمہ اور توصیۂ حق و صبر۔ جو لوگ ان چیزوں کو اختیار کریں گے ان کے لئے کامیابی اور نصرت کی

نعمتیں ہوں گی اور وہ اصحاب المیمنہ میں ہوں گے۔ اور جو ان سے اعراض کریں گے، ان کیلئے بدبختی اور شقاوت کی لعنتیں ہوں گی اور وہ اصحاب المشئمہ میں ہوں گے۔ پس اس سورہ میں قریش کے لئے اس بدبختی اور شقاوت کی ایک مثال بیان کی۔ اور اس کے لئے قوم ثمود کے واقعہ کو بطور مثال کے اختیار فرمایا۔ اس پہلو سے یہ سورہ، سابق و لاحق دونوں سے مربوط ہو جاتی ہے اور اس کا موقع وہی ہے جو سورہ ماعون کا ہے، جیسا کہ اس کی تفسیر سے واضح ہوگا۔

لیکن اگر ان تمام سابق و لاحق تعلقات سے قطع نظر کر لیا جائے، جب بھی یہ سورہ اپنے اندر ایک مستقل تعلیم حکمت رکھتی ہے۔ یعنی اس میں سرکشی اور تکذیب کے نتائج پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔ پس اگر تم اپنی نظر کو اسی سورہ کے مطالب تک محدود رکھو، اور اس کے پیش و عقب تک نہ پھیل سکو، جب بھی اس کی تعلیمات کم از کم سرکشی اور تکذیب کے داعیہ کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے تو بالکل کافی ہیں۔ ہاں اگر اس کو سابق و لاحق سے ملا کر دیکھو گے تو تم پر بعض نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔ تم کو اس بیماری کی جڑ اور اس بدبختی کی اصل بنیاد کا سراغ لگ جائے گا۔ یعنی یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان تمام مفاسد کی اصل درحقیقت قساوت قلب ہے۔ اس کے متعلق ہم نے سابق سورہ کی تفسیر میں مفصل بحث کی ہے۔ وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ جہالت، بخالت، اور سرکشی وغیرہ، تمام برائیوں کا اصل سرچشمہ قساوت قلب ہی ہے۔

"ولا یخاف عقبٰہا" کی تفسیر

۱۴۔ قرآن مجید، جس طرح اگلے صحیفوں کا مصدق اور متمم ہے۔ اسی طرح وہ ان کے اختلافات کے باب میں حکم اور مہیمن ہے۔ اپنی یہ حیثیت قرآن مجید نے خود نہایت وضاحت سے بیان کر دی ہے۔ ایک جگہ تورات اور انجیل کے بیان کے بعد قرآن کا ذکر ان لفظوں میں آتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ	اور ہم نے اتاری تم پر کتاب، حق کے ساتھ تصدیق کرتی
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ	ہوئی اس چیز کی جو اس کے آگے (پہلے) ہی کتاب میں سے
الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ	(یعنی قدیم صحیفے) اور نگراں ہے اس پر، پس فیصلہ
بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ	کرو ان کے درمیان اس چیز کے مطابق جو اللہ نے
اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ	اتاری ہے اور نہ پیروی کرو انکی خواہشوں کی (یعنی انکی
	تحریفات کی) چھوڑ کر اس حق کو جو تمہارے پاس آچکا ہے

دوسرے مقام پر ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى	بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بیان
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ	کرتا ہے بڑا حصہ ان باتوں کا جنہیں وہ
هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ	مختلف ہیں۔

قرآن مجید اپنے اسی منصب کے لحاظ سے جہاں اگلے صحیفوں کی بہت سی باتوں کی تصدیق کرتا ہے، وہیں ان کی بہت سی ایسی باتوں کی جو یہود نے ان میں ملا دی ہیں، اور جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہے، نہایت ہی زور و قوت کے ساتھ تردید بھی کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:۔ "ولقد خلقنا السموٰت والارض وما بینہما فی ستۃ ایام" (اور ہم نے پیدا کیا آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں) یہاں تک تو بعینہ توراۃ کے بیان کی تصدیق تھی۔ پھر اس کے بعد فرمایا" وما مسنا من لغوب (اور ہم کو ذرا بھی تکان نہیں محسوس ہوئی) یہ ٹکڑا قرآن مجید کے مہیمن اور حکم ہونے کی حیثیت کو نمایاں کر رہا ہے۔ یعنی اس میں توراۃ باب پیدائش کے اس بیان کی تردید ہے جو یہود نے ملا دیا ہے کہ "خداوند نے چھ دن کام کیا اور ساتویں دن آرام کیا"۔

اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی باتیں کتنا

چلا جاتا ہے اور انہی کے لپیٹ میں کوئی ایسی بات کہدیتا ہے جس سے کسی خاص خیال کی تردید یا کسی مخصوص غلط فہمی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔

اس تمہید کو ذہن نشین کر لینے کے بعد، زیر بحث مقام پر غور کرو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق جہاں بہت سی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، وہاں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ان بہت سے کاموں پر، جو رحمت و نعمت کے اس سے صادر ہوتے ہیں، کبھی کبھی پچھتایا بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک دلچسپ مثال یہود کی عنایت سے توراۃ کی کتاب پیدائش ۶ میں بھی ہے۔

"اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اسکے دل کے تصور اور خیال سدا برے ہی ہوتے ہیں، تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔"

اسی طرح طوفان کے ذکر کے بعد ہے۔

"اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب سے میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہیں بھیجوں گا کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے ماروں گا۔"

قرآن کی تعلیم اس سے بالکل مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے، حکمت و رحمت کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر وہ کسی قوم کو ہلاک کرتا ہے، یا کسی قوم کو رفعت و ترقی بخشتا ہے تو ایسا بغیر کسی ضابطہ اور اصول کے نہیں کرتا۔ اپنے اس قانون حکمت و رحمت کے مطابق کرتا ہے جو اس نے اپنے تمام کاموں کے لئے ازل سے ٹھہرالیا ہے۔ پس اس کے کسی کام میں نہ خوف و طمع کا شائبہ ہے، نہ کمی بیشی کا اندیشہ۔ اور اس لئے وہ ندامت و شرمندگی اور رنج و پچھتاوے کے تمام احوال و عوارض سے بالکل منزہ اور ارفع ہے۔ یہی حقیقت ہے جو یہاں "ولا یخاف عقبٰہا" سے واضح ہو رہی ہے۔

اور اس طرح کی کتنی حقیقتیں ہیں، جو قرآن کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر روشن فرما دی ہیں۔ حالانکہ دوسرے قرآن مجید کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے ان سے دور ہیں۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ما ھدانا الی الصراط المستقیم و اعطانا من الذکر الحکیم۔

تدبر قرآن

(۲)

امین احسن اصلاحی

تین جماعتیں اوپر ہم نے جن دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ بالکل اصولی تقسیم تھی۔ قرآن مجید نے اس سے زیادہ تجزیہ و تحلیل اور بسط و تفصیل کے ساتھ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کی ہے۔

قرآن مجید کس مقصد کے لئے نازل ہوا ہے؟ اس کا جواب خود قرآن نے ان لفظوں میں دیا ہے:۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ	یہ کتاب آسمانی ہے جس کو ہم نے تم پر اسلئے اتارا ہو کہ
النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ	تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لیجاؤ۔
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ	ان کے رب کے حکم سے، خدائے عزیز و حمید کے
الْحَمِيْدِ	راستہ کی طرف۔

یعنی قرآن مجید کا مقصد لوگوں کو گمراہی و ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ایمان و ہدایت کی روشنی میں لانا ہے۔ اور یہ کام ایک مخصوص قانون کے مطابق انجام پاتا ہے۔ کیونکہ فرمایا ہے "باذن ربھم" یعنی یہ پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ہدایت و ایمان بخشدے، یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جس کو چاہتا ایمان سے بہرہ ور فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی کے کھڈ میں گرا دیتا ہے۔ اور اس کا یہ چاہنا ایک قانون حکمت کے مطابق ہے۔ وہ قانون حکمت کیا ہے؟ اس کا جواب قرآن مجید نے متعدد مقامات میں دیا ہے۔ لیکن سورہ بقرہ کے آخر میں تعلیم حکمت کے باب میں اس پر نسبتۂ زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اس لئے ہم اسی مقام کو اس معاملہ کی توضیح کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ فرمایا:۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے انکو نکالتا ہے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور جنھوں نے کفر کیا تو ان کے مددگار طاغوت ہیں وہ انکو لیجاتے ہیں روشنی سے تاریکی کی طرف وہی لوگ جہنم میں پڑنے والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی اللہ اور اس کی کتاب کی رہنمائی صرف اہل ایمان کے لئے مخصوص ہے، اہل کفر اس سے محروم ہیں اہل کفر کے رہبر و مددگار طاغوت ہیں، وہ ان کو روشنی میں نہیں آنے دیتے اور اگر کبھی روشنی کی کوئی کرن انکے سروں پر جھلک جاتی ہے تو وہ فوراً ان کو دھکیل کر تاریکی کے سیاہ پردوں میں چھپا دیتے ہیں کہ کہیں وہ اس راز سے آشنا نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مثال بیان کی ہے جن کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالتا ہے یا جن کو تاریکی میں چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کے لئے تین شخصوں کو منتخب کیا ہے جو درحقیقت تین جماعتوں کے نمایندے ہیں۔ فرمایا:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ

کیا تم نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو ابراہیم سے اس کے رب کے بارہ میں جھگڑنے لگا، اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دے رکھی تھی جب ابراہیم نے اس سے کہا، میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے تو اس نے کہا میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم نے کہا (اچھا) اللہ تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۚ وَاللَّهُ لَا	تم اسکو مغرب سے نکالو تو اس پر وہ کافر ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ اور اللہ ظالم
يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ أَوْ كَا	قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ یا تم نے اس شخص کے حال پر نظر کی جو ایک بستی
لَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ	پر سے گذرا۔ اور وہ اپنی چھتوں پر ڈھئی پڑی تھی کہا کیسے اللہ اسکو زندہ
عَلَىٰ عُرُوشِهَا ۚ قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ	کریگا اس کی موت کے بعد۔ تو اللہ نے اسکو سو برس
اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ	تک مردہ رکھا۔ پھر اسکو جلا اٹھایا۔ اور پوچھا تم اس
مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۚ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ	حالت میں کتنی مدت رہے؟ بولا ایک دن رہا ہونگا
قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ	یا ایک دن سے بھی کم فرمایا بلکہ تم سو برس رہے ہو
قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ	اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو کہ
إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ	کوئی بُسی تک نہیں اور اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔
وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً	(اور ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ تم کو یقین حاصل ہو)
لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ	اور ہم تمکو لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں اور ہڈیوں کی
نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا	طرف دیکھو کیسے ہم ان کو جوڑتے ہیں۔ اور پھر ان پر گوشت
تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ	چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت ظاہر ہو گئی بولا،
عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ	میں یقین کرتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۚ قَالَ	اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا اے رب مجھے دکھا دے کیسے
أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۚ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ	تو مردوں کو زندہ کرے گا۔ کہا کیا تم کو اس کا یقین
قَلْبِي ۚ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ	نہیں؟ کہا ہاں یقین ہے۔ لیکن تاکہ میرا قلب مطمئن
فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ	ہو جائے۔ فرمایا تو چار پرند لو اور مانوس اپنے سے بنا لو
كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ	پھر کردو ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ٹکڑا پھر ان کو

يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ — بلاؤ وہ تمھارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور

اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ — یقین کرو کہ اللہ عزیز و حکیم ہے -

یہاں اُن واقعات کی توضیح و تاویل مقصود نہیں ہے جنکی طرف یہ آیات اشارہ کر رہی ہیں ہم صرف اس حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ان آیات کے اندر مضمر ہے اور جس کی طرف نظم کلام رہنمائی کر رہا ہے۔ یہ آیتیں ماسبق آیت " اللہ ولی الذین آمنوا " الایہ کے بعد ہی وارد ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ کون لوگ ہیں جو تاریکی سے روشنی کی طرف آتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو روشنی سے تاریکی کی طرف جاتے ہیں۔ پس نظم اور اسلوب کلام (الم تر الی الذی حاج ابراہیم (کیا تم نے اس کے معاملہ پر نظر نہیں کی جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا) دونوں مقتضی ہیں کہ ان آیات کا تعلق ماسبق آیت سے ہو پھر جب ہم ان آیات کے مضمون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ آیت ماسبق میں جس بات کو اجمال کے ساتھ بیان فرمایا تھا ان آیات میں اسی کو پوری وضاحت اور تمثیل کے ساتھ سمجھا دیا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو خدا کی روشنی سے محروم رہتے ہیں اور کون لوگ ہیں جو اس کی ہدایت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اب آؤ، ان آیات کو اچھی طرح تحلیل کرکے سمجھیں۔ ان میں غور کرنے سے تین شخصوں کا بیان معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ایک وہ شخص ہے، جو حکومت و دولت اور ملک و سلطنت کے نشہ سے مخبوط ہے حضرت ابراہیمؑ نے اس کے سامنے اللہ کی روشنی پیش کی ہے لیکن وہ غرور کی بدمستی میں کسی بات پر غور نہیں کرنا چاہتا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بات پر فوراً معارضہ کر بیٹھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے معارضہ کا نہایت معقول جواب دیتے ہیں۔ وہ ان کے جواب سے لاجواب ہو جاتا ہے " فبھت الذی کفر " لیکن اس پر ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھلتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی روشنی طلبگاروں اور ڈھونڈھنے والوں کے لئے ہے جو اس سے معارضہ کرتے ہیں ان کی آنکھیں اس سے چندھیا جاتی ہیں لیکن ان سے ان پر ایمان

کی راہ باز نہیں ہوتی۔ واللہ لا یہدی القوم الظالمین۔

(۲) دوسرا ایک شخص ہے جو علم و ایمان سے محروم نہیں ہے بلکہ یقین و بصیرت کا طلبگار ہے۔ اور ہر وقت علم کی طلب اور حقیقت کی کھوج میں سرگرداں۔ وہ بستیوں، مدرسوں، مسجدوں، اور خانقاہوں میں مباحثے اور مناظرے کی مجلسیں نہیں منعقد کرتا، اور نہ یہ کرتا کہ جو خطرہ دل میں گذر جائے اس کو جھٹ چند ورقوں میں چھاپ کے، ساری دنیا میں کوس لمن الملک بجاتا پھرے، بلکہ سوچنے والے دماغ اور غور کرنے والی طبیعت کی طرح وہ خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے ویرانوں کا شائق ہوتا ہے۔ وہ بستیوں کے ہجوم سے بھاگتا اور شہروں کے ازدحام سے گھبراتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی مقام عبرت و موعظت کا کوئی خلوتکدہ میسر آجائے تو اپنے ان سوالوں کو لیکر بیٹھ جائے جن کے جواب کے لئے وہ ہر وقت تشنہ و بیقرار ہے۔ چنانچہ اسی طرح کی کسی ڈھئی ہوئی بستی پر اس کا گذر ہو جاتا ہے، اس کی منہدم دیواریں، اسکے ٹوٹے ہوئے در، اس کی سربسجود محرابیں، اس کی پراگندہ اینٹیں، اور اس کی وحشت و ویرانی کی خاموشی اس کے سامنے عبرتوں اور بصیرتوں کا ایک دفتر کھول دیتی ہے۔ اور طبیعت کا ذوق فوراً اپنے لئے فکر و نظر کا موضوع تلاش کر لیتا ہے اور جس سوال پر دماغ بار بار زور آزمائی کرکے عاجز آچکا تھا، لیکن کوئی تشفی بخش حاصل نہ پاسکا تھا، موقع و ماحول کی تاثیر سے دل کا وہی داغ پھر ابھر آتا ہے۔ تذبذب کی خلش اور اضطراب کی چبھن پھر تازہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ انکار و جحود کے غرور کے ساتھ نہیں بلکہ استعظام و استعجاب کی حیرانی و درماندگی کے ساتھ، اعراض و تکذیب کے نشہ سے مخمور ہوکر نہیں، یکسر ذوق جستجو اور شوق و آرزو ہوکر۔ پکار اٹھتا ہے "انی یحیی ہذہ اللہ بعد موتہا"! یہ کیسے ہوگا کہ خدا اس کو پھر زندہ کرے گا!

اگرچہ سوال وہی ہے جو مکہ کے مغروروں اور طائف کے سرکشوں نے کیا تھا اور جس کے جواب میں قرآن نے ان کو صرف جھڑکی سنائی تھی۔ لیکن سوال کے باطن کی ذہنیت بالکل مختلف ہے وہاں انکار کا گھمنڈ تھا، یہاں تواضع کی مسکینی ہے، وہاں مناظرہ و مجادلہ کا ولولہ تھا، یہاں سوال کی خلش اور اضطراب

، ہے۔ وہاں تحریف کو چپ کرنے کی خواہش کارفرما تھی۔ یہاں درمان درد اور مرہم زخم مطلوب ہے۔
تکذیب ہے۔ یہ سوال، وہ انکار ہے۔ یہ شک "دشتان بینہا"۔
چنانچہ اس شخص کے ساتھ بالکل مختلف معاملہ ہوتا ہے۔ اس کے شک کے ازالہ کے لئے اسباب کے تمام پردے
ے جاتے ہیں اور ایک ایسی صورت حالات سامنے آجاتی ہے جو شک کے ایک ایک کانٹے کو چن چن
ں دیتی ہے اور پورے یقین کی روشنی سے معمور ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر
فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علی کل شیٔ قدیر۔
۳۔ اس کے بعد تیسرے شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام نمودار ہوتے ہیں یہ فرماتے ہیں، اے
ار! تو مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ اٹھا کھڑا کرے گا! سوال ہوتا ہے کہ کیا تم کو اس پر ایمان
نہیں ہے؟ فرماتے ہیں، ایمان و یقین تو ہے۔ بھلا ایمان و یقین کیوں نہ ہوگا: تیرے علم و قدرت سے
ہے، تو تو سب کچھ کر سکتا ہے! لیکن اے رب ہیں! ایمان و یقین سے کچھ زیادہ چاہتا ہوں، میں شرح
بھوکا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ انوار بصیرت کے دریا میں ڈوب جاؤں، میرا سینہ آفتاب یقین د
ں کا ایک ابدی و دائمی مطلع بنجائے۔ میں جو کچھ بصیرت سے سمجھا ہوں، اس کو بصارت سے دیکھ
اس کی معرفت میں غرق ہو جاؤں، اس کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ "لیطمئن قلبی"
یہ حالت، اوپر کی دونوں حالتوں سے مختلف ہے۔ یہ نہ تو انکار و جحود کی حالت ہے، نہ شک و
ب کی۔ یہ شرح صدر کی طلب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتا ہے کہ ان کا دل طمینان
کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور ان کی بصیرت کے سامنے سے تمام حجابات یکقلم ہٹ جاتے ہیں
ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ تین شخص درحقیقت تین جماعتوں کے نمایندے ہیں۔ اور خدا
نی ان تینوں جماعتوں کے ساتھ تین مختلف قسم کے معاملے کرتی ہے۔ ایک جماعت منکرین
ن کی ہے۔ ان کی نگاہوں کو نور الٰہی صرف خیرہ کر دیتا ہے، ایمان و بصیرت نہیں بخشتا۔

دوسری جماعت ارباب شک و اضطراب کی ہے۔ خدا کی روشنی ان کو تشفی و طمانیت بخشتی ہے تیسری جماعت طالبین شرح صدر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سینوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

یہ عام سنۃ اللہ کا بیان ہے۔ شقاوت و سعادت کا وہ قانون جو ہمیشہ سے ہی اور ہمیشہ رہے گا، یہی ہے۔ اور بالکل ٹھیک ٹھیک یہی حالت قرآن مجید کے تفکر و تدبر میں ایک طالب قرآن کو پیش آتی ہے۔ اگر ایک شخص قرآن مجید سے حجت کرنا چاہے، اور یہ حوصلہ لے کر اٹھے کہ اس کی دلیلوں سے لڑائی لڑے گا اور اس کی نصیحتوں سے جھگڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر قرآنی ہدایت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے جو کسی شک و شبہہ کی خلش سے بےچین ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن اس کے شبہات دور کردے۔ تو قرآن اس کی رہبری کرتا ہے، اور آہستہ آہستہ اس کو یقین و بصیرت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اس معاملہ میں قرآن مجید کی روش ایک طبیب کی ہے، اگر کوئی طالب شفا اس کے پاس اس لئے آئے کہ اس کی بیماریاں دور ہو جائیں تو وہ چونکہ شفاء لما فی الصدور دل کے تمام روگوں اور بیماریوں کی دوا ہے، وہ اس کے لئے شفا بنجاتا ہے، لیکن اگر کوئی مریض اس لئے آتا ہے کہ وہ طبیب کے مشوروں کو سننے اور سمجھنے کی بجائے ان سے معارضہ کرے گا، یا اس کی باتوں کو اپنی خواہشوں کے موافق بنانے کی کوشش کرے گا، تو اس کی بیماری دور ہونے کی جگہ بڑھتی اور گھٹنے کے بجائے زیادہ ہوتی ہے۔ فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا، ولہم عذاب الیم، بما کانوا یکذبون۔

قرآن مجید اور صاحب وحی علیہ الف الف تحیۃ کے ابتدائی احوال اس حقیقت کو پوری طرح کھول دینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ نبوت سے قبل لیکن بعثت کے قریب آنحضرت صلعم کا کیا حال تھا، ایک گمراہ اور آوارہ دنیا کے اندر جس کے اوپر اور نیچے صرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی آپ ایک روشنی کے لئے بیقرار تھے۔ ایسی روشنی جو دنیا کے لئے ہدایت اور نجات کی بند راہوں کو کھول دے جو عقل و دل کی بصیرت کو جگمگا دے، جو شبہات کی تاریکیوں کو مٹا دے، اور اس کائنات کے معمہ کو

جس پر ہزارہا حجابات اور پردے پڑے ہوئے ہیں، حل کر کے سمجھا دے۔ آپ کو اندرونی خلشوں اور باطنی کاوشوں نے یکسر درد بنا دیا تھا۔ آپ سراپا طلب و جستجو اور سرشوق و آرزو ہو کر بستی سے متنفر اور آبادی سے بیزار ہو گئے تھے۔ ایک صحرا کے اندر، ایک پہاڑ کے غار میں معتکف ہو کر منتظر تھے کہ کسی طرح یہ سامنے کے پردے چاک ہوں اور حقیقت منتظر جلوہ آرا ہو۔ طلب و جستجو کی یہ نیازمندی اور شوق و آرزو کی یہ فروتنی اور پھر تفکر و تدبر کی یہ خلوت گزینی اور غار نشینی تھی جب اقرا کا پیام آیا اور خدا نے ایک سرچراغ نو انسان کو اٹھایا اور اس پر امتنان فرمایا کہ " ووجدک ضالا فھدی " (ہم نے تم کو تلاش حقیقت میں سرگرداں پایا تو ہدایت بخشی)

پس طالب قرآن کی ابتدا اور انتہا، دونوں طلب و جستجو اور عجز و فروتنی ہے۔ بے نیازی، استکبار، مجادلہ، معارضہ کے ساتھ اس راہ کی ایک منزل بھی طے نہیں ہو سکتی ۔ قرآن کی طرف آدمی کا قدم اس لئے اٹھنا چاہیئے کہ اس کو حقیقت کی طلب ہے اور جب تک حقیقت نہ مل جائے طالب کو چاہیئے کہ وہ قرآن کے اندر معتکف رہے۔ اور فکر و تدبر کا جہاد جاری رکھے۔ شبہات کتنے ہی اہم ہوں اور مشکلات کتنی ہی کٹھن، ایک لمحہ کے لئے بھی مایوس نہ ہو۔ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ طلب علم اور جستجوئے رشد و ہدایت کی راہ میں جہاد کر رہا ہے، اس کی کامیابی یقینی ہے۔ " والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" اس کے اطمینان و بصیرت کے لئے خدائے کارساز و کریم دشوار کو سہل بلکہ ناممکن کو ممکن کر دے گا اور اس کو ہدایت و ایمان کی غذا اس گوشہ سے ملے گی جس گوشہ سے اس کو کبھی وہم و گمان بھی نہ گذرا ہوگا۔ یرزقہ من حیث لایحتسب

اور پھر اگر قرآن پر آدمی ثابت قدم رہے تو وہ نعمت عظمیٰ جس کو ہم نے شرح صدر سے تعبیر کیا ہے اور جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواہش کی تھی، وہ بھی اس کو ملتی ہے، چنانچہ قرآنی تعلیمات کے ظہور و کمال کے بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم سے فرمایا۔ " الم نشرح لک صدرک

کیا ہم نے تمھارے سینہ کو کھول نہیں دیا۔

اس سلسلہ کی ایک نہایت لطیف حقیقت سورہ مجادلہ میں بھی بیان ہوئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک جماعت کا حال یہ ہے کہ جب دینی احوال و معاملات میں اس کو کوئی مشکل، دشواری، شبہہ، یا روکاوٹ پیش آتی ہے تو خدا سے مجادلہ اور رسول سے شکوہ کرتی ہے۔ مجادلہ عربی زبان میں اس اصرار و الحاح کو بھی کہتے ہیں جس کی بنیاد محبت، اعتماد اور خلوص پر ہو۔ یعنی وہ خدا و رسول پر اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرتی اور نہ قرآن و حدیث کا مذاق اڑاتی بلکہ اپنے شبہات و شکوک، محبت و اعتماد کے ساتھ عرض کرتی ہے، اور ان کا حل چاہتی ہے۔ اور دوسری جماعت وہ ہے جس کی خصوصیت محادّہ ہے۔ محادة کے معنی اختلاف کے ہیں۔ یعنی اس کی اصلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خدا اور رسول کی مخالفت اور ان کی باتوں پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں اور قسم قسم کے شبہات وارد کرے۔ پہلی جماعت کی نمائندہ ایک عورت ہے، جو ایک مخصوص دینی معاملہ کی وجہ سے سخت کشمکش میں پڑ گئی ہے۔ لیکن بجائے اسکے کہ وہ اس کشمکش کو مذہب پر زبان درازی کا بہانہ بنالے، اپنی مشکل کو نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ خدا و رسول کے حضور میں عرض کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عرض کو سنتا ہے اور اس کی مشکل کو دور کردیتا ہے۔ "قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجہا و تشتکی الی اللہ، واللہ یسمع تحاورکما، ان اللہ سمیع بصیر"۔ دوسری جماعت منافقین کی ہے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے ہیں کہ کوئی موقع اعتراض اور نکتہ چینی کا پائیں اور اس کو لے اڑیں۔ ان کی نسبت فرمایا۔ ان الذین یحادون اللہ ورسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلہم وقد انزلنا بینات وللکفرین عذاب مہین۔ سورہ مجادلہ کے اندر ان دونوں جماعتوں کا ذکر دو مقابل جماعتوں کی حیثیت سے آیا ہے اور اس کا مقصود محض لوگوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ خدا و رسول کے ساتھ معاملہ کرنے کا طریقہ عرض و معروض اور شکوہ

التجا ہے۔ نہ کہ مجادلہ اور مناقشہ۔ پس خدا کے دین یا اس کی کتاب میں اگر کوئی مشکل پیش آئے تو اس کی راہ صرف یہی ہے کہ اس کو خدا ہی کے سامنے پیش کرے اور اسی سے تسلی و تشفی اور فتح باب کا متمنی ہو۔ یہ نہ کرے کہ جھٹ اس کو ذریعہ اعتراض و نکتہ چینی بنا کر ایک نیا دین کھڑا کر دے، یا تراش خراش کر اپنی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال لے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان پر قرآن کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔ وہ یا تو کتاب الٰہی پر نکتہ چینی کرتے کرتے اس سے اسقدر ابعد ہو جاتے ہیں کہ پھر اسکی طرف لوٹنے کا ان کے لئے امکان ہی نہیں باقی رہ جاتا۔ یا قرآنی آیات کی تراش خراش کے معاملہ میں اسقدر چابکدست ہو جاتے ہیں کہ آہستہ آہستہ قرآن کی ہر بات کو اپنی خواہشوں کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اور ان پر بالکل وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جو یہود پر طاری ہو چکی تھی۔ " ومنہم امیون لایعلمون الکتاب الا امانی "

قرآن مجید ایک اعلیٰ کلام ہے

"جو لوگ قرآن کو ایک معمولی کلام خیال کرتے ہیں، اور اپنی لیاقت کو جتنی ہے اس سے زیادہ سمجھکر سمجھتے ہیں کہ یہ فہم قرآن کے لئے کافی ہے، وہ قرآن کے معنی سے بالکل محروم رہتے ہیں ان میں سے بعض اپنی کج فہمی کا نام اعتراض رکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب والے جو قرآن کو کچھ تھوڑا بہت سمجھتے ہیں، وہ خود گواہی دیتے ہیں کہ اس کو سمجھنے کے لئے یہ پہلا امر ہے کہ اسے ایک اعلیٰ کلام مانا جاوے۔

قرآن پاک نے اپنی نسبت مختلف جگہ یہی کہا ہے کہ انکار کرنے والا اس کو ہرگز نہیں سمجھے گا۔"

(فراہیؒ)

مذاکرہ

نظر بر استدراک

(از جناب چودھری غلام احمد پرویز بی۔ اے)

الاصلاح بابت اپریل میں میرا مضمون بر عنوان نجات شائع ہوا۔ جس پر مدیر الاصلاح کا یہ نوٹ دیکھکر کہ وہ اس کے اختلافی مقامات کے متعلق آیندہ پرچہ میں اپنی تصریحات درج فرمائیں گے مجھے خوشی ہوئی کہ ایک ایسے نظریئے کے متعلق، جسے میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلی مرتبہ میں نے ہی پیش کیا ہے (یعنی نجات کا ارتقائی تخیل) مجھے معلوم ہوسکے گا کہ قرآن کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے میں، میں کہاں کہاں قاصر رہا ہوں۔ لیکن جب مئی اور جون کے پرچوں میں مولوی اختر احسن صاحب کا استدراک دیکھا تو میں بھی ایسا ہی مایوس ہوا جیسے خود مدیر الاصلاح اور غالباً الاصلاح کے اور پڑھنے والے۔ مدیر الاصلاح نے تو اپنی مایوسی کو اختصار اور ابہام کے تبسم میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہر صاحب نظر کے سامنے بے نقاب ہو کہ استدراک یا تو محض اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ میرے مضمون کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا یا مولوی صاحب جو کچھ لکھنا چاہتے تھے وہ لکھ نہیں سکے۔ بہر حال ان کی تحریر میں کچھ ایسا الجھاؤ ہے کہ ان کا مفہوم سامنے آتا ہی نہیں۔ استدراک میں کسی اصولی بات سے بحث ہی نہیں کی گئی اس لئے اس کے جواب میں مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس میں دو ایک باتیں ایسی آگئی ہیں کہ ان کے جواب میں ع اگر خاموش بنشینم گناہ است۔

لہذا یہ چند سطور توضیحاً لکھ رہا ہوں۔

میرے مضمون کا عمود یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ کہیں ثابت نہیں کہ کوئی شخص جہنم میں داخل

ہونے کے بعد پھر اس سے نکالکر جنت میں بھیجا جائے گا۔ اور اس کو میں نے قرآن کریم کی روشنی میں عین اصولِ فطرت کے مطابق دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے میں نے لکھا تھا کہ اس قسم کی نجات کا تخیل جسکی رو سے جہنم کے عذاب میں داخل ہوکر پھر اس سے رہائی ملنے کی طرف ذہن منتقل ہو، یکسر غیر قرآنی ہے۔ اس کے علاوہ، دنیاوی مصائب میں گرفتار ہوکر ان سے آزادی ملنے کے لئے، یا عذاب دوزخ سے (بغیر اس میں داخل ہوئے) محفوظ رہنے کے لئے: نجات کے لفظ کے استعمال کے لئے مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور یہ میرے مضمون سے بالکل واضح تھا۔

لیکن مولوی صاحب نے، باوجود اختصار کے عادی ہونے کے، پانچ چھ صفحے اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کردئے کہ نجات کا لفظ مصائب دنیاوی سے بچنے، یا عذاب جہنم سے (بغیر اس میں داخل ہوئے) محفوظ رہنے کے لئے اگر استعمال کیا جائے تو یہ مفہوم غیر قرآنی نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ مولوی صاحب نے اتنا کچھ لکھکر میری کس غلطی کو واضح کیا۔ اس کا تو مجھے پہلے ہی اقرار ہے۔ پھر اس سے ثابت کیا ہوا۔ یا تو مولوی صاحب نے (معاف فرمایئے) میرا مضمون سمجھا ہی نہیں، یا جو کچھ وہ کہنا چاہتے وہ کہہ نہیں سکے۔

دوسرا اعتراض اس آیت کے مفہوم کے متعلق ہے۔ "وان منکم الا واردھا کان علیٰ ربک حتماً مقضیا ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا" اس کے متعلق انھوں نے فرمایا ہے کہ وَرَوْد کے معنی دخول کے ہیں۔ اور میں نے جو اس کے معنی "اوپر سے گذرنے" کے لئے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہیں۔ لیکن میں یہ گذارش کروں گا کہ یہ معنی میں نے وضع نہیں کئے بلکہ یہ معنی شاہ رفیع الدینؒ نے اپنے ترجمے میں لکھے ہیں۔ اور پھر وَرَوْد یعنی قربؔ خود مولوی صاحب نے بھی قرآن کریم سے ثابت کیا ہے تو اب معلوم نہیں میں نے کونسا جرم کردیا۔ حیرت ہے کہ اگر کوئی شخص اسلاف کے متعین کردہ معانی کے خلاف لب کشائی کرے تو مجرم۔ اور اگر انہی کے معانی استعمال کرے تو جرم۔ غرض دوگونہ عذاب است جان مجنون را۔

استدراک کے اس حصہ میں بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ مولوی صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اولاً تو آپ فرماتے ہیں کہ "ہمارے نزدیک اس آیت کو اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں" معاملہ صاف ہو گیا۔ میں نے تو اس آیت کو اس لئے نقل کر دیا تھا کہ کوئی صاحب اس سے دخول جہنم کے بعد نجات کا مفہوم نہ اخذ کر لیں۔ اب جب آپکے نزدیک اس آیت کا اس مضمون سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے تو اس کو معرض بحث میں لانیکی کیا ضرورت۔

پھر ارشاد ہے کہ میری تاویل "عین اس حدیث کے مطابق ہے جس میں پل صراط کا ذکر ہے"۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب کیلئے میری تاویل کی حجت کی سند اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ایک حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات حدیث کی حجیت کے بھی اسیوقت تک قائل ہیں جب تک وہ اپنے مزعومہ عقیدہ کے مطابق ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ "لیکن آیت کے الفاظ پر غور کر کے دیکھنا چاہئے کہ آیت کی یہ تاویل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں"۔ اور پھر دو تین صفحات کے اندر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تاویل غلط ہے۔ یہ لکھتے وقت مولوی صاحب نے شاید اتنا نہیں سوچا کہ. تیرے نشتر کی زد شریان قیس ناتواں تک ہے۔ آپ پرویز کی تاویل کی مخالفت کرتے کرتے خود حدیث کی مخالفت کر گئے ہیں۔ یہ نادان کی دوستی نہیں تو اور کیا ہے۔

اور یہ بھی تماشا ہے کہ اس آیت کی صحیح تاویل بھی آپ بیان نہیں فرماتے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب ورود کے معنی قرب کے بھی ہیں۔ اور یہ معنی لینے میں قرآن کریم کی دیگر آیات بینات کی تائید ہوتی ہو۔ تو پھر دوسرے معنی کیوں لئے جائیں۔ جنکی وجہ سے نہ صرف دوسری آیات کی ہی مخالفت ہوتی ہو بلکہ ایسے اشکال سامنے آجائیں جنکا حل مشکل ہو جائے۔ اور مقصد پھر بھی کچھ حاصل نہیں آپ فرماتے ہیں کہ قرب کے معنی لینے میں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ دوسری جگہ جو ہے کہ جنتیوں کو دوزخ سے بہت دور رکھا جائیگا۔ اور ان کو اس کی آواز بھی سنائی نہ دیگی۔ تو ان دونوں میں تضاد واقع ہو جائے گا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ

جب ورود کے معنی دخول کے لئے جائیں تو کیا پھر یہی تضاد عائد نہ ہو جائے گا؟ یہ تو اور بھی شدت کا تضاد ہوگا۔ اور پھر اس کا کیا جواب ہوگا کہ قرآن کریم میں تو اہل جنت اور اہل جہنم کا باہمی مکالمہ بھی موجود ہے بہرحال اس آیت سے تو مولوی صاحب نے ثابت ہی نہیں کیا کہ دوزخ کا عذاب بھگتنے کے بعد لوگ جنت میں بھیجے جائیں گے۔ اور یہی میرا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم سے ایسا ثابت نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے یہ بات ثابت کی ہے کہ خلود جہنم کفر و شرک سے ہوگا۔ کیونکہ حبط اعمال صرف کفر و شرک سے ہی ہوتا ہے۔ جس میں ایمان ہوگا۔ اس کے لئے حبط اعمال نہیں ہے۔ لہذا جب اس کے تمام اعمال غارت نہیں ہوں گے تو ان کی جزا کے لئے دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جانا ضروری ہوگا۔

غنیمت ہے کہ مولوی صاحب نے اتنا تو مان لیا کہ کافر و مشرک کے لئے خلود جہنم ہوگا۔ اور اس کو وہ اہل سنت والجماعت کا مذہب بیان فرماتے ہیں۔ لیکن اگر کسی اہل سنت والجماعت نے کہدیا کہ نا صاحب۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ فرشتے دوزخ کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اور اسمیں کوئی موجود نہ ہوگا۔ (یعنی دوزخ موجود ہوگا اور اس کے اندر کوئی نہ ہوگا۔) تو پتہ نہیں آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔

لیکن مولوی صاحب نے جو صغریٰ و کبریٰ قائم کیا ہے وہ از خود غلط ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

خلود جہنم حبط اعمال سے ہوگا۔

اور حبط اعمال ہوتا ہے کفر و شرک سے

اس لئے

خلود جہنم صرف مشرک و کافر کے لئے ہی ہے

اور چونکہ مومن کے لئے حبط اعمال نہیں۔ اس لئے اس کے لئے خلود جہنم نہیں

لیکن قرآن کریم میں تو یہ بھی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت بلند کرو اواز اپنی کو

اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ — اوپر آواز نبی کے۔ اور مت آواز بلند کرو اوپر اس کے جیسے
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ — بول کے جیسا بلند کرتے ہیں بعضے تمہارے واسطے بعض کے
بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ — ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹:۲) — تم کو خبر بھی نہ ہو۔

یہاں خطاب اہل ایمان سے ہے اور حبط اعمال کفر و شرک سے نہیں بلکہ نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے سے ہے۔ اور جب خلود جہنم حبط اعمال سے ہی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے مسلمانوں کے لئے بھی خلود جہنم ہوگا۔ لیجئے۔ مولوی صاحب کی تمام خود ساختہ عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ اس لئے کہ اس کی بنیادیں یکسر قیاس آرائی پر تھیں، قرآن کریم پر نہ تھیں۔

پھر ایک اور دلچسپ صغریٰ کبریٰ قائم فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ چونکہ خدا کا یہ قانون صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کہ "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"۔ تو سزا کا ہونا ضروری ہے۔ اور پھر خود ہی لکھتے ہیں کہ "البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر گناہ کی سزا ہونی چاہئے"۔ اللہ اکبر! ایک طرف تو خدا کا یہ قانون ایسا اٹل ہو کہ ذرہ برابر برائی کی بھی سزا ہو۔ اور دوسری طرف مولوی صاحب کا قیاس، ملاحظہ ہو کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر گناہ کی سزا ہونی چاہئے۔ یہاں پھر مولوی صاحب الجھن میں پھنس گئے۔ قرآن کریم کی رو سے صحیح مسلک یہی ہے کہ جن لوگوں کو جنتی زندگی کا مستحق سمجھا جائے گا ان کی لغزشیں معاف کر دی جائیں گی۔ (یکفر عنہم سیاتہم) اور جن کو جہنم کی زندگی کے لائق سمجھا جائے گا، ان کے لئے حبط اعمال ہوگا اس لئے کہ جنت دوزخ میں جانے کا معیار ثقل و خفت موازنہ ہے۔ اور یہ وہ آیت ہے جسے مولوی صاحب نے چھوا تک نہیں۔

پھر یہ بھی غلطی ہے کہ مولوی صاحب دخول جہنم اور خلود جہنم میں فرق سمجھ رہے ہیں۔ اور خلود جہنم والوں کا الگ ذکر فرماتے ہیں۔ حالانکہ میں نے اپنے مضمون میں ثابت کیا ہے کہ تنہا خلود (خالدین فیہا) کے معنی۔ بغیر خالدین فیہا ابداً کے۔ بھی ہمیشگی اور "خلود" کے ہیں۔ اس کی طرف بھی مولوی صاحب نے توجہ نہیں

فرمائی۔

مولوی صاحب کو اعراف کی تیسری جماعت پر بھی اعتراض ہے۔ حالانکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جنکی نیکیوں اور برائیوں کے پلڑے مساوی ہوں گے جن کی قسمت کا فیصلہ میزان نے نہیں کیا، ان کا معاملہ زیر غور ہوگا۔ اور خدا کی رحمت سے توقع ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ پتہ نہیں اس مقام پر مولوی اسلم کا ذکر بالکل بے محل کیوں آگیا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کی ذہنیت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے ایسی ہی باتیں لکھنے میں آتی ہیں۔ اب آخیر میں مولوی صاحب کی قرآن فہمی کی بھی ایک مثال دیکھتے جائیے۔ یہ حضرات دوسروں کو مطعون کرتے رہتے ہیں کہ انھیں قرآن کے اصولوں سے واقفیت نہیں اس لئے یہ غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن اگر اصول قرآن سے واقفیت کے بعد قرآن ایسا ہی سمجھ میں آتا ہو تو اس سے تو وہ ناواقفیت اچھی جس سے صحیح قرآن سمجھ میں آجائے۔ میں نے لکھا تھا کہ بچوں کا ذکر جنت میں نہیں ہے۔ کیونکہ جنت اعمال کی وراثت ہے۔ آپنے اس کے خلاف یہ آیت نقل فرمائی ہے۔ والذین آمنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان الحقنا بھم ذریتھم وما التناھم من عملھم من شئی۔" اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بچے جنت میں ضرور جائیں گے۔ اول تو اس آیت میں انھوں نے ذریت کے معنی اولاد لکھے ہیں۔ حالانکہ ذریت کے معنی اولاد۔ اور اولاد در اولاد ہے۔ پھر آیت میں اس ذریت کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں۔ انھوں نے اتباع کی ہے۔ اور یہ کہ ان کے اعمال میں اللہ کمی نہ کرے گا۔ اس سے نابالغ غیر مکلف بچے کسطرح مراد لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے عجیب تر ایک اور استدلال ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں کہ "بہشت میں جو آرزو کی جائے گی پوری ہوگی .... اس لئے اللہ تعالیٰ مومنین کی اس آرزو کو کہ ان کی اولاد ان کے ساتھ کردی جائے۔ انکی تکمیل مسرت کیلئے پوری کردے گا۔" کیا عمدہ استدلال ہے۔ اور اگر کسی کی وہاں یہ آرزو ہو کہ اس کے فلاں دوست یا اسکی بیوی کو تکمیل مسرت کے لیے اس کے ساتھ کردیا جائے۔ تو ان سب کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا

جائے گا! یہ راستہ بڑا عمدہ رہا۔ ایک شخص جنت میں چلا گیا اور اس نے محلہ بھر کو وہاں بلا بھیجا۔ کہ اس کی تکمیل مسرت اس سے ہوگی۔

اس کا نام یہ حضرات رکھتے ہیں اصولِ دلالت قرآن!

اخیر میں مولوی صاحب نے یہ آیت نقل فرمائی ہے "انکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم ..... اور ما تعبدون کا ترجمہ کیا ہے" تمہارے اصنام "محض اس لئے کہ وقودہا الناس والحجارہ میں جو حجارہ سے انھوں نے اصنام مراد لئے ہیں۔ اس کی تائید ہو جائے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ ما تعبدون اس سے کہیں وسیع تر ہے۔ دوزخ میں جو متبوعین اور متبعین کے باہمی جھگڑے ہیں۔ وہ کیا سب پتھر کے بتوں سے ہی ہوں گے!

میں نے شروع میں جو عرض کیا ہے کہ یہ استدراک محض اس لئے لکھا گیا ہے کہ ایک ایسے مضمون کے خلاف جس میں خلودِ جہنم کا ثبوت دیا گیا ہو، کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ وہ تصریحات بالا سے ظاہر ہے۔ ورنہ مولوی صاحب نے تو خود اقرار کیا ہے کہ

"یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں کوئی ایسی صریح آیت نہیں ہے جس سے سزا کے بعد جنت میں داخل ہونا ثابت ہو" اور یہی میرا دعویٰ تھا۔

میں ان حضرات کی خدمت میں بادب گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے ہر چند اصولِ دلالت، نظم و ربط و ضبط سب ضروری ہیں۔ لیکن ان سب سے مقدم ایک اور شے ہے اور وہ یہ کہ ذہن کو ان عقائد سے پہلے خالی کر لیا جائے جو روایتی اور جماعتی مسلک کی شکل میں دماغ میں موجود ہوں۔ اس کے بعد قرآن کو کھولئے تو انشاء اللہ صحیح راہ مل جائے گی۔ مثلاً اسی مضمون کو لیجئے۔ مولوی صاحب اور ان کے رفقاء اسی کوشش میں رہے کہ خلودِ جہنم چونکہ ان کے روایتی (یا جماعتی) عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے اس کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے۔ اور وہ حضرات جنھوں نے خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ کیا انھوں نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا کہ قرآنی نجات کا نظریہ کس طرح عین اصولِ فطرت کے

مطابق، وہ انسان کے ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے میں نے اسی لئے محترمی مولوی امین احسن صاحب سے گذارش کیا تھا کہ وہ میرے اس مضمون کو نہ لیں[1] کیونکہ اعظم گڈھ اور اس کے متعلقات اس کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن وہ اسے باصرار لے گئے اور خواہ مخواہ "دوگونہ عذاب" میں پھنس گئے۔

میں تو ابھی منتظر ہوں کہ کوئی صاحب قرآن کی رو سے میری غلطی کو واضح کردیں۔ اگر وہ غلطی ہے تو۔ اور یہ نظریہ درست ہے۔ تو "ربنا لا تزغ قلوبنا بعد از ہدیتنا۔

---

[1] الاصلاح یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ یہ مضمون مجھکو مولانا اسلم نے اس وقت عنایت فرمایا تھا جب میں دہلی سے واپس ہو رہا تھا۔ سفر کی روا روی میں، میں اس کو پورا پڑھ نہ سکا۔ یہاں آکر پڑھا تو مجھکو اس میں بعض غلطیاں نظر آئیں۔ میں نے پرویز صاحب کو اور غالباً مولانا اسلم صاحب کو بھی لکھا کہ مجھے اس مضمون کے بعض حصوں سے اختلاف ہے۔ اگر وہ اجازت دیں تو میں اس پر نوٹ لکھکر شائع کردوں ورنہ مضمون واپس کردوں، مولانا اسلم صاحب نے لکھا کہ مناسب یہ ہے کہ اس کو بعینہ شائع کردو اور اپنی رائے علیحدہ مضمون میں ظاہر کردو، مجھکو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی اور یہی شکل اختیار کرلی گئی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو صورت معاملہ یہی ہے۔ اور میں پورے اطمینان کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ اس مضمون کی وجہ سے نہ تو "اعظم گڈھ اور اس کے متعلقات" کو کوئی زحمت پیش آئی اور نہ میں کسی "دوگونہ رنج و عذاب" میں پھنسا۔ دنیا کا کارخانہ اپنے معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ اور ہم سب ہمیشہ کی طرح پرویز صاحب کے اس مضمون کے بعد بھی بالکل خوش اور مطمئن ہیں۔

ہاں۔ پرویز صاحب کی اس تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرکے ضرور تھوڑا سا رنج ہوا کہ مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون ان کی آزردگی کا باعث بنا۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کو بالکل پہلی مرتبہ ایک نئی حالت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کی تحریریں اخباروں اور رسالوں میں چھپ جایا کرتی

تھیں، لوگ پڑھ لیتے تھے، وہ خوش ہو جایا کرتے تھے۔ اب تک تسوید و تحریر کی دنیا کا صرف یہی خوبصورت پہلو ان کے سامنے تھا۔ ان کو بالکل خبر نہیں تھی کہ اس دنیا کا ایک اور رخ بھی ہے جو دلکش اور دلفریب نہیں ہے بلکہ کسی قدر بھیانک ہے اور وہی اس کا اصلی چہرہ ہے۔ اور ہر اس شخص کو جس نے قرطاس و قلم کا مشغلہ اختیار کیا ہو بالآخر اسی بھیانک چہرہ سے عشق کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نام "نقد و تبصرہ" ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہی بھیانک چہرہ، بالکل پہلی مرتبہ ان کو مولوی اختر احسن صاحب کے مضمون میں دیکھنا پڑا، اور وہ اس کو دیکھکر بالکل گھبرا اٹھے۔ اور اسی گھبراہٹ کی حالت میں مضمون لکھنے بیٹھ گئے۔ حالانکہ دانشمندوں کا مشورہ یہ ہے کہ آدمی کو جب کبھی ایسی حالت پیش آجائے تو پہلے اپنی گم شدہ دلجمعی اور سکون قلب کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرے۔ جب یہ چیز مل جائے تو معاملہ کی نوعیت پر بار بار غور کرے۔ اور پھر زبان کھولے۔ لیکن انھوں نے پرانے دانشمندوں کی اس حکمت پر عمل نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی طبیعت کی ایک ایسی حالت بے نقاب کرنے پر مجبور ہوگئے کہ ہم کو افسوس اور ندامت ہے کہ اس کی "نقاب کشائی" کی رسم افتتاح کی ذمہ داری ہم نے اپنے سر کیوں لی!

مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون مجمل سہی، لیکن سنجیدہ، ٹھوس، اور "طالب العلمانہ" تھا۔ اس میں ایک فقرہ بھی ایسا نہ تھا جس میں استخفاف و استہزا یا تحقیر کا کوئی شائبہ ہو۔ لیکن آپ اپنی اس تحریر گرامی کو ملاحظہ فرما کر سوچیے کہ مروجہ مضمون نگاری کی وہ کونسی بلاغت ہے جس کے اسراف سے آپ یہاں باز رہے ہیں! مولوی اختر احسن صاحب نے آپ کو نہایت شائستہ انداز میں آپ کی غلطیوں پر متنبہ کیا تھا، آپ ان کی غلطیوں پر ان کو متنبہ کر دیتے۔ بحث ختم تھی۔ ان تعریضات و کنایات اور لن ترانیوں کے بغیر کونسا کام بند تھا! اور اگر آپ حضرات کے نزدیک ان چیزوں کے بغیر مضمون نگاری کا فرض ادا نہیں ہوتا تو آخر کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ ہر شخص اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ بھی ہو سکتا ہے!

تعجب ہے کہ آپ مولوی اختر حسن صاحب کا مضمون نہیں سمجھے۔ حالانکہ آپ چاہتے تو اس کو باسانی سمجھ سکتے تھے۔ ہر چند صرف ایک شخص کو سمجھانے کے لئے، اور وہ بھی ایسا شخص جو آپ کی طرح سمجھتے ہوئے بھاگنا چاہتا ہو، الاصلاح کے صفحات کو ضائع کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ایک مرتبہ اور کوشش کی جائے گی کہ آپ سمجھ جائیں۔ لیکن خدارا ذرا قریب آیئے۔ آپ تو شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ کیا پا گئے ہیں گویا معارف قرآن کی کوئی آسمانی کلید ہاتھ آگئی ہے جس کے بعد آپ کے کچھ کہنے سننے کا کسی کو کوئی حق ہی باقی نہیں رہ گیا ہے!

معاف کیجئے گا، آپ لوگوں نے اپنے طرز عمل سے ان مقدس مترجمین قرآن کی روحوں کو بڑی اذیت پہنچائی ہے۔ انھوں نے قرآن کے ترجمے اس لئے کئے تھے کہ جو مسلمان عربی سے ناواقف ہیں ان کے لئے اللہ کی کتاب سے فائدہ اٹھانے کی ایک راہ کھول دیں۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگا جو انھیں ترجموں کو پاکر اجتہاد و تحقیق کی مسندیں بچھا دے گا۔ اور ابن تیمیہ و ابن قیم اور ابن جریر اور رازی سب اس کے سیلاب اجتہاد میں بہ جائینگے اگر اس فتنہ کی خبر انھیں ہوتی تو یقیناً نادانوں کے ہاتھوں میں وہ یہ تلوار نہ دیتے۔

ہمارے دوست یقین کریں کہ ہم نے ان کے قرآنی مضامین کو ہمیشہ قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھا ہے، اور ان کو عام لکھنے والوں میں ایک مستثنیٰ درجہ دیا ہے۔ لیکن بحث و مذاکرہ سے تو کسی کو بھی اپنے تئیں بالاتر نہیں خیال کرنا چاہئے۔ یہ تو طالب العلمانہ افہام و تفہیم ہے۔ ہم اگر کوئی بات نہیں سمجھے ہیں آپ سمجھا دیجئے۔ خفا ہو کر برا بھلا کہہ دینے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا! آپ نے ہم لوگوں پر ادعائے علم و واقفیت کا بھی الزام لگایا ہے اور غصہ کی جھنجھلاہٹ میں "جماعتی عصبیت" اور "روایتی مسلک" کے بھی الفاظ بول گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان معاملات میں آپ لوگوں کو ہمارا حال معلوم نہیں ورنہ اپنے ان قیمتی لفظوں کو آپ اس بیدردی سے ضائع نہ کرتے۔ ادعائے علم و واقفیت

اولاً تو قرآن کے معاملہ میں کسی کو ہونا نہیں چاہئے کہ

در محفلے کہ خورشید اندر شمار ذرہ است خود را بزرگ دیدن شرط ادب نہ باشد

اور اگر ہو تو ان لوگوں کو ہو جنکو یہ جامہ زیب دے اس کیلئے اپنے قامت کی ناموزونی تو اسقدر نمایاں ہے کہ چھپائے نہیں چھپ سکتی۔

اپنی محرومی و تشنہ لبی کا تو یہ عالم ہے کہ مرحوم غالبؔ نے کہا تھا:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ میرے لئے تو دردِ تہ جام بہت ہے

ہم نے یہ شرم بھی اٹھا دی، تاہم ہنوز منتظر چشم التفات ساقی ہی رہے! اور یقین کیجئے کہ یہی نارسائی بخت ہے جس نے مجبور کیا کہ اس "روایتی مسلک" کو اختیار کر لینے کا ننگ گوارا کریں جس کے نام سے آپ لوگوں کو گھن آتی ہے۔ اور اس باب میں ہم کو ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔

بادشاہوں کی نظر میں لعل و گہر کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن فقیر تو راہ میں پڑی ہوئی کوڑی بھی اٹھا لیتا ہے۔ گنگا اور جمنا کے کنارے بسنے والے کیا جانیں کہ صحرا کا تشنہ لب مسافر اپنی پیاس بجھانے کیلئے کیا کیا جتن کرتا ہے۔ جو سیمرغ کا شکار نہیں کر سکتے وہ کنجشک کے لئے دام بچھاتے ہیں اور اسی کو شکار کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔ آپ لوگوں کی سی قسمت ہر شخص کہاں سے لائے؟ پھر "اس کو" نہ پاکر "اپنے کو" کھو آنے کا حوصلہ کوئی معمولی عزم و ہمت کا کام ہے! پس ہم تہی دامنوں کی اس محرومی پر آپ لوگوں کو ہنسنا نہیں چاہئے، رحم کرنا چاہئے۔

"جماعتی عصبیت" کا الزام بھی محض آپ لوگوں کا حسن ظن کریمانہ ہے۔ یہاں تو صحرا کے تنہا درخت کا سا معاملہ ہے جس کے سایہ کے سوا کوئی اس کا رفیق نہیں۔ ہم جیسے بے نواؤں کو اپنی جماعت میں کون لے گا؟ اور لے گا تو کیا فائدہ اٹھائے گا۔

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا

کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

پرویز صاحب سے نہایت ادب سے گذارش ہے کہ وہ نکتہ چینی سے گھبرا نہ جایا کریں۔ گھبرانے
حل نہیں ہوا کرتیں، خواجہ حافظ کی نصیحت ہے کہ

مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

پس ان کو چاہیے کہ وہ مولوی اختر احسن صاحب کا مضمون دوبارہ سمجھکر پڑھیں۔ انشاء اللہ
لے لئے مفید ہوگا۔ ہم نے مولوی اختر احسن صاحب سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اپنے مضمون
خاص مباحث کی طرف مکرر توجہ دلادیں۔ امید ہے کہ آیندہ نمبر میں ان کا مضمون شائع
ا۔

تفسیر سورۂ کوثر (اردو)

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوثر کی
خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار و حقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے
اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طباعت جاذب نظر کاغذ
بسع ۲۰×۶/۱۶ حجم ۱۲۳ صفحے قیمت ۸ر

منیجر

نجات

از جناب خواجہ ابوالحسن صاحب محکمہ تعلیمات حکومت ہند شملہ

"اس مضمون کے بعض دلائل سے ہم مطمئن نہیں ہیں لیکن ایک مسئلہ کی توضیح کے لئے دوسروں کے نقطہ نظر کو پیش کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے یہ تحریر شائع کی جاتی ہے" (الاصلاح)

مسئلہ نجات پر "الاصلاح" کی گذشتہ اشاعتوں میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور جس طریق پر یہ مسئلہ معرض بحث میں لایا گیا ہے۔ اس نے بجائے واضح کرنے کے اسے اور پیچیدہ کر دیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسے اس طرح صاف کر دیا جائے کہ پوری طرح دلنشین ہو جائے۔ میں بھی اس کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں ممکن ہے کہ اہل نظر اسے پسند فرمائیں۔

اس مسئلہ پر غور کرنے سے پیشتر ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کونسی باتیں ہیں جنکا اعتراف یا عمل ہمیں نجات دلا سکتا ہے اور وہ کون سی چیز ہے جس کا انکار ہمیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جس قدر رسول بھی نوع انسانی کی طرف مبعوث کئے ان کی رسالت کا مقصد وحید صرف یہی تھا کہ سب انسان خدا کی وحدانیت کا اعتراف کریں اور صرف اسی کی عبادت کریں۔ چنانچہ فرمایا

(۱) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ	ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول بھی دنیا میں نہیں بھیجا
رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ	مگر اس وحی کے ساتھ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں
إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ۲۱/۲	پس میری ہی عبادت کرو۔
(۲) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا	اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ جس کی تعلیم یہ تھی کہ اللہ کی عبادت کرو، اور سرکش

۱۶/۳۶ و شریر طاقتوں کے اغوا سے بچو

چونکہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور فطرت انسانی روز ازل میں میثاق الست پر پہلی ثبت کر چکی ہے اس لئے پیغمبروں کے ذریعہ بھی اسی میثاق کی تجدید کا مطالبہ کیا گیا اور کسی ایسی بات کا اقرار نہیں لیا گیا جو فطرت انسانی میں داخل نہ تھی۔ اب اگر انسان خدا کی وحدانیت کا اعتراف نہیں کرتا اور رسولوں کی تعلیم کے خلاف عمل پیرا ہوتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے خلاف سرکشی کرتا ہے اور اپنا میثاق توڑ ڈالتا ہے۔ اب وہ انسانیت کے درجہ سے بہت نیچے گر گیا اور اس قابل نہیں رہا کہ جنت میں اس مخلوق کے ساتھ رہ سکے جس نے اپنی فطرت نہیں بدلی بلکہ اسے اس مخلوق کے پاس جگہ ملے گی جو اپنا فطری پیمان بھلا کر خدا سے بغاوت کر چکی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی صدائے فطرت کو لبیک کہتا ہے اور سرکشی کر کے اسے مسخ نہیں کرتا اور اللہ کے رسولوں کی دعوت پر کان دھرتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ نعائم اخروی کا مستحق ہو اور نجات حاصل کرے۔ اس ایک میثاق کے علاوہ کوئی اور عہد میثاق نہیں جو روز ازل میں اس سے لیا گیا ہو نہ کوئی اور اعتقاد ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہو۔ اب اگر دنیا میں آکر اسے اور باتوں کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان میں سے بعض کی یا اکثر کی خلاف ورزی کرتا ہے تو گو وہ نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے مگر اس نافرمانی سے وہ اپنی فطرت کو پامال نہیں کرتا۔ اسے مکدر و زنگ آلود کر دیتا ہے۔ اس کی پاداش میں جو سزا اسے ملے گی وہ اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق ہونی چاہیے تاکہ اس کے آئینہ فطرت کا زنگ دور ہو جائے اور اس کی فطرت اپنی اصلی حالت پر آجائے۔

جہاں تک میرا علم ناقص ہے قرآن سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اعمال صالحہ ایمان کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی پختگی اعمال کی قبولیت کا سبب ہوتی ہے اور

انسان کی روحانی ترقی اور اس کا ذہنی و فکری نشو نما اس کی ایمانی حالت پر موقوف ہے۔ اگر اس کا ایمان درست نہیں تو اس کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں۔ خود انبیاء کرام کی نسبت سورہ انعام میں کہا گیا ہے کہ۔ "لو اشرکوا لحبط عنہم ما کانوا یعملون" برعکس اس کے کہ اگر اس کی ساری عمر بد اعمالیوں میں گذری مگر آخری لمحات حیات میں، ایک لمحہ سچے ایمان کا مل گیا تو اس کی ساری سابقہ بد عملیوں کی تلافی ہو گئی۔ ساحران فرعون کی ساری عمر کفر و بد عملی میں گذری مگر ایک لمحہ کے سچے ایمان نے انھیں نہ صرف جنت کا حق دار بنا دیا بلکہ ان کا تزکیہ نفس کر کے انھیں بلند مقامات پر پہنچا دیا۔ چنانچہ ساحران فرعون کے واقعہ کے بعد ہی فرمایا ہے "من یاتہ مومناً قد عمل الصالحت فاولئک لہم الدرجات العلیٰ جنّٰت عدن تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا و ذلک جزاء من تزکیٰ" (طٰہٰ)

اسی طرح سورہ یٰسین میں ایک بستی کی مثال بیان فرمائی جہاں اللہ کے رسول بھیجے گئے مگر بستی والوں نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔ صرف ایک آدمی ایمان لایا اور ایمان لانے کی وجہ سے مار ڈالا گیا مرنے کے ساتھ ہی اسے جنت کی بشارت مل جاتی ہے "قیل ادخل الجنۃ قال یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین" یہ ظاہر ہے کہ وہ آدمی ایمان لانے سے پیشتر کافر تھا۔ اس کی ساری عمر بد عملیوں میں گذری مگر ایمان لانے کے ساتھ ہی وہ تمام معاصی سے پاک وصاف ہو گیا۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دراصل ایمان ہی نجات کا موجب ہے۔ اگر ایمان کے ساتھ اچھے اعمال ہیں تو انسان کو جلد نجات مل جائیگی۔ اگر برے ہیں تو وہ اپنے اعمال بد کی سزا پائے گا اسکی وجہ سے اس کی نجات میں تاخیر ہو جائے گی مگر نجات سے محروم نہیں رہے گا اور یہی حقیقت حدیث نبوی میں بیان کی گئی ہے "یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان" (ترمذی)

اسی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ کم عمر مسلمان بچے بھی ضرور نجات پائیں گے۔ چونکہ وہ اپنی فطرت صالحہ پر جو روز ازل میں خدا کی ہستی کا اقرار کر چکی ہے، دنیا سے گئے ہیں اس لئے وہ مومن تصور کر لئے جائیں گے

اگر انھیں اعمال صالحہ کا موقع نہیں ملا تو نہ سہی، اس سے ان کی فطرت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہی۔ رسول اللہ کے اس ارشاد سے بھی کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں لوگ اسے یہودی نصرانی بنا لیتے ہیں اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔

الغرض جمہور اہل اسلام کا یہ اعتقاد کہ ہر مومن کے لئے بالآخر نجات ہوگی خواہ وہ بدعمل ہی کیوں نہ ہو قرآن حکیم وسنت نبوی کی تصریحات پر مبنی ہے۔ اور اس سے انکار یا اعراض اہل حق کا شیوہ نہیں۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ہداہم اللہ واولئک ہم اولوا الالباب

تفسیر سورہ لہب (اردو)

ادبیات

غزل

از

جناب مولانا کیفی چریاکوٹی

سو داغ تمناؤں کے، ہم کھائے ہوئے ہیں
گل، جتنے ہیں اس بار بہاریں، مرجھائے ہوئے ہیں

شرمندہ ہوں میں اپنی دعاؤں کے اثر سے
وہ آج پریشان ہیں گھبرائے ہوئے ہیں

خود داری گیسو کا ہے اس رخ پہ یہ عالم
جھکنا جو پڑا ان کو تو بل کھائے ہوئے ہیں

اب تم بھی ذرا حسن جہاں سوز کو روکو
ہم تو دل بے تاب کو سمجھائے ہوئے ہیں

اے دست کرم! پھینک دے کونین کو اس میں
دامن کو ترے سامنے پھیلائے ہوئے ہیں

کچھ ذوقِ تماشا بھی ہے، کچھ حسن نظر بھی
دل ہاتھ میں وہ دیکھ کے للچائے ہوئے ہیں

اب اپنی جبیں پھوڑیں گے در پر ترے محتاج
برباد ہیں تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے ہیں

حیران ہیں کس شکل سے ہم سامنے جائیں
ہنگام قیامت ہے وہ جھلّائے ہوئے ہیں

پینا ہے ہمیں زہر الم آج طبیبو!
ہٹ جاؤ کہ مرنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

آتا ہے بڑھا بحرِ کرم جوش میں کیفی،
ہم اپنے گناہوں پہ جو شرمائے ہوئے ہیں

تلخیصات

موجودہ دنیائے سیاست کے عناصر اربعہ

مسولینی ۔ ہٹلر ۔ اسٹالین ۔ اتاترک

حالات وخصوصیات کی حیرت انگیز یکسانی

جو لوگ اخبارات و رسائل پڑھتے ہیں اور موجودہ زمانہ کے حالات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، ان کے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہوگا کہ مسولینی، ہٹلر، اسٹالین اور اتاترک اس فرمانروائی بلکہ مطلق العنانی کے درجہ تک کیسے پہنچ گئے۔ کیا ان کے اندر کوئی غیر معمولی طاقت مخفی ہے؟ ان کو کوئی غیبی امداد حاصل ہے؟ حسن خلق، فہم و تدبر اور اصابت رائے میں وہ کوئی مافوق العادۃ درجہ رکھتے ہیں؟ ذاتی وجاہت اور خاندانی شرافت کی کوئی نمایاں برتری ان کو حاصل ہے؟ آخر کیا بات ہے کہ وہ چشم زدن میں ترقی کے آسمان پر پہنچ گئے؟ یہ کوئی جادو تو نہیں ہے؟

ہمارے لئے ان سوالوں کا جواب دینا مشکل ہے البتہ اتنا ہم ضرور کرسکتے ہیں کہ ان تمام خصوصیات کو، جہاں تک معلوم ہوسکیں، یکجا کردیں، جو ان حکمرانوں کے درمیان مشترک طور پر پائی جاتی ہیں تاکہ ناظرین خود کسی صحیح فیصلہ تک پہونچنے کی کوشش کریں۔

ان حکمرانوں کی ملک گیری اور سیاسی ترقی کے حالات ہی نہ صرف یکساں طرح کے ہیں

بلکہ ان کی مرزبوم، طریق، رہائش، ابتدائی نشوونما، تعلیم و تربیت، خانگی زندگی اور روزمرہ کے مشاغل بھی ایک ہی قسم کے ہیں۔ سب ایسے باپوں کے فرزند ہیں جو بالکل ٹھیٹ دیہاتی تھے۔ زراعت، مویشیوں کی پرورش، اور دوسری دیہاتی صنعتیں ان کا محبوب پیشہ تھیں۔ علم سے بے بہرہ، مال و دولت سے محروم بالکل اجڈ اور گنوار تھے۔ علمی بے مائگی کی وجہ سے ان کے مزاج ٹیڑھے اور طبیعتیں سخت تھیں۔ مفلسی کی محنت و مشقت سے چور تھے۔ شب و روز کشادگی اور فراغت کے خواب دیکھتے اور ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ تلاش معاش کی دوڑ دھوپ میں ان کسانوں سے آگے نکل جائیں جو تمازت آفتاب اور جاڑے کی ٹھنڈ سے نڈھال ہیں۔

مسولینی اپنے باپ کے متعلق بیان کرتا ہے کہ "میرے باپ نے کبھی مدرسہ کا رخ نہیں دیکھا۔ دس برس کا ہوا تو اس کو پڑوس کے گاؤں میں ایک لوہار کی دوکان پر بیٹھا دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد جب اسے لوہاری کے کاموں میں مہارت ہوگئی تو اس نے اپنی ذاتی دوکان کھول لی۔ اسی زمانہ میں اس نے اشتراکیوں سے ربط ضبط قائم کیا۔ اشتراکیوں کی باتیں غور و توجہ سے سنتا۔ ان سے مشورے کرتا اور ان کے خیالات کی گاؤں والوں میں تبلیغ کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے بہت سے ہم خیال پیدا ہوگئے اور ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس نے پولیس کے عیش و آرام اور خواب و خور کو تلخ کر دیا۔"

اس نے بڑی بے رحم طبیعت پائی تھی۔ مسولینی پر اس کی بے رحمیاں مشہور ہوگئی تھیں اس نے کبھی مسولینی سے شفقت و نرمی کا برتاؤ نہ کیا۔ بات بات پر اپنی سنگدلی کا اظہار کرتا۔ مسولینی اپنی "آپ بیتی" میں لکھتا ہے کہ "میں جب کبھی لوہے کی دوکان میں بھٹی سے نکلتے ہوئے شراروں اور گرم لوہے سے اڑتی ہوئی چنگاریوں سے بچنے کے لئے اپنا چہرہ چھپاتا تو میرا باپ میری کوڑے سے خبر لیتا۔ اس زدوکوب سے ڈر کر ایک شب میں، میں گھر سے نکل بھاگا یہ اس وقت کی بات ہے جب

میری عمر صرف سات برس کی تھی"

ایک اور واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسولینی کے باپ نے اس کی تربیت میں ہمیشہ خشونت اور سخت گیری سے کام لیا۔ ایک مرتبہ وہ مسولینی کے لئے ایک چھوٹا سا کھلونا لایا اور اس کو اس کے دوسرے ساتھیوں کے سامنے اس کے کھیلنے کا ڈھنگ بتانے لگا۔ دفعۃً ایک شوخ لڑکا مسولینی کے ہاتھ سے کھلونا چھین کر چلتا بنا۔ مسولینی رونے لگا۔ اس کے باپ نے یہ ماجرا دیکھا تو اس کو بری طرح ڈانٹ بتائی کہ "تو اپنے دشمن سے ڈر گیا۔ کھلونا لیکر اسے کیوں جانے دیا۔ لڑکا ہوکر لڑکیوں کی طرح آنسو بہاتا ہے۔ تونے اسے پکڑا کیوں نہیں۔ طمانچہ کا جواب طمانچہ سے اور گھونسے کا جواب گھونسے سے کیوں نہیں دیا؟" یہ کہکر اس نے اپنا سخت اور مضبوط ہاتھ اٹھایا اور مسولینی کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ مار کھا لینے کے بعد مسولینی نے بھی ایک چکنا پتھر اٹھا کر اپنے حریف کو دوڑایا کچھ دور جاکر اسے پالیا اور اس کے سر پر ایسا پتھر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔

ہٹلر کا باپ بھی ایک مفلوک الحال دیہاتی تھا۔ تیرہ برس کے سن میں اسے پیٹ کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ مجبوراً وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ روزگار کی تلاش میں پھرتا پھراتا وائنا پہنچا۔ جہاں اس نے جوتہ بنانے کا کام شروع کیا۔ لیکن صرف اسی صنعت پر قناعت اس کے لئے مشکل تھی۔ وہ محتاج اور تہی دست رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ شب و روز اپنی حالت کے سدھارنے میں کوشاں رہتا۔ بڑی کوششوں سے ۲۳ برس کے بعد اسے چنگی خانہ میں ایک ملازمت ملی۔ اپنی زندگی کو مسرور بنانے میں اسے بڑی مشقتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ اس نے تین شادیاں کیں۔ اور اس کی زندگی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی لذتیں حاصل کرنے میں نہایت بے صبر اور جلدباز تھا۔

اس کی عمر جب پچاس سے متجاوز ہوئی تو اس نے اپنا تمام کاروبار بند کر دیا۔ اور ریف میں جاکر اقامت اختیار کر لی۔ اسے ہر شخص سے نفرت تھی۔ وہ برتری کا گھمنڈ ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر لوگ اس کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ دلدوز فقروں اور چبھتے ہوئے جملوں سے اس کے غرور کا مقابلہ کرتے۔ بالآخر مجبور ہو کر گھر کے اندر ہی اپنی بڑائی کا مظاہرہ کیا کرتا۔ اپنی اولاد کی تربیت میں بڑا ہی سخت و بے رحم تھا۔ اس کے بے رحم ہاتھ اور خوفناک ڈنڈے کو دیکھکر لوگوں کو بڑا دکھ ہوتا۔ اس ماحول میں تربیت پانے کے بعد ہٹلر کی خود رائی، سختی طبعی اور اس کی بہادری پر کسے تعجب ہو سکتا ہے؛

اسٹالین اور اتاتورک کے باپ بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں نہایت سخت گیر تھے۔ ڈنڈے کی سیاست، طاقت کے اظہار اور بے دردانہ سلوک میں مسولینی اور ہٹلر کے باپ سے یہ کچھ کم نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان چاروں بچوں کو اپنے باپوں کی خدمت و اطاعت کا موقع بہت کم ملا۔ اتاتورک نو ہی برس کے تھے کہ ان کے والد نے رحلت فرمائی۔ اسٹالین ابھی گیارہ برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ اسے باپ کے مرنے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ہٹلر کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی کہ اس کا باپ انتقال کر گیا۔ مسولینی نے اپنے باپ کی بیرحمیوں سے اسی وقت نجات حاصل کر لی تھی جب اس نے گھر چھوڑا اور دور دراز کے ایک مدرسہ میں اپنا نام لکھایا۔ ان نوجوانوں کے باپوں نے جتنی ان کی تربیت کی تھی اور جتنا کچھ ان کے اخلاق و عادات کو درست کر سکے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ اپنے اخلاق کی درستگی اور اپنی حالت کے سدھارنے کا موقع انھیں ان کے مرجانے کے بعد نصیب ہوا۔ باپوں کے مرنے کے بعد جو زمانہ انھیں ہاتھ آیا وہی ان کے بننے کا زمانہ تھا۔ اس میں ان کی رائیں آزاد ہوئیں اور ان کے اندر اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کی قوت پیدا ہوئی۔ وہ اپنے فرائض و واجبات اور اپنی قدر و قیمت پہچاننے پر مجبور ہوئے۔

مسولینی ہٹلر، اسٹالین اور اتاتورک کے باپوں نے جس طرح کی مشترک عادات وصفات اپنے بچوں کو سونپیں، بالکل اسی طرح کے مشابہ طور وطریق، ان بچوں نے اپنی ماؤں سے بھی سیکھے۔ یہ عورتیں خصوصیات میں اپنے شوہروں کی ضد تھیں۔ وہ جتنے اکھڑ، بے رحم اور اجڈ تھے، اتنی ہی یہ رحم دل، نرم مزاج، فرمانبردار اور پارسا تھیں۔ سب کی سب کثیر العیال تھیں، مذہب سے انھیں عشق تھا۔ تقویٰ و دینداری ان میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ دنیا کے تمام کام دھندوں سے الگ تھلگ رہکر صرف خانہ داری کے انتظام اور بچوں کی دیکھ بھال میں منہمک رہتیں۔ فاقہ اور تنگدستی کی تمام مصیبتیں انھوں نے نہایت خوشی خوشی جھیلیں۔

یہ کہنا چاہئے کہ ان حکمرانوں کی تربیت دو بالکل متضاد قسم کے حالات و عوامل کے اندر ہوئی ہے۔ عامل انقلاب، جو ان کے باپوں کے سینوں میں موجزن تھا۔ اور عامل ایمان، جو ان کی ماؤں کی پیشانیوں پر اطمینان و مسرت سے چمکتا تھا۔ اتاتورک کی والدہ اور ان کے والد میں عرصہ دراز تک اس بات پر جھگڑا رہا کہ اتاتورک کے والد، اتاتورک کے لئے محض قرآن و فقہ کی تعلیم کو کافی نہ سمجھتے تھے۔ مسولینی کے انقلاب پسند باپ اور اس کی نیک ماں کے درمیان مسولینی کی تعلیم کا معاملہ ایک مستقل وجہ نزاع تھا۔ ماں کی دلی خواہش تھی کہ بچہ کی تعلیم مذہبی ہو۔ ہٹلر کی ماں اپنے بچے کو مذہبی گیتیں یا ذکر کی طرف متوجہ دیکھکر بہت خوش ہوتی۔ اس کی سب سے محبوب آرزو یہ تھی کہ خدا ہٹلر کو مسیح کا خادم بنادے اور وہ اس دنیا سے کٹکر صرف خدا کا ہو جائے۔ اسٹالین کی ماں نے منت مانی تھی کہ اگر اسٹالین زندہ رہا تو اسے کنیسہ کا خادم بنائے گی۔ چودہ برس کے سن میں اس کو الٰہیات کے ایک مدرسہ میں داخل کر دیا۔ جوں جوں زمانہ گذرا اس کی مذہبی تعلیم اور رہبانیت کی مشق ترقی کرتی رہی۔ وہاں اس کو کسی ایسی قیادت کی تعلیم نہیں دی گئی جو کسی حکومت کے حصول کا ذریعہ ہو۔

یہ چاروں حکمراں نہایت بہادر، بحیم شحیم، تندرست اور قوی الاعصاب ہیں۔ لیکن ان کی مائیں نہایت ہی کمزور اور ضعیف البنیہ تھیں۔ مسولینی کی ماں بہت سے امراض میں گرفتار تھی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹتی اور بستر پر پڑی درد سے چلایا کرتی۔

ان حکمرانوں کے بچپن اور جوانی کے حالات سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ان کے تمام عادات و اطوار اور تمام خصوصیاتِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل مماثل ہیں۔ اب ہم اپنے دعویٰ کی تائید میں خود انہی کی زبانی چند واقعات کا اور اضافہ کرتے ہیں۔ مسولینی بیان کرتا ہے کہ "میں ایک بدمزاج اور شریر لڑکا تھا۔ دروازہ کی کنڈیاں کھٹکھٹائے بغیر سڑک پر نہ آتا۔ گھر لوٹتا تو تمام بدن چوٹوں سے داغ دار ہوتا۔ مگر میں انتقام سے بھی باز نہ آتا تھا۔" اتاترک کو ان کے استاد کے صرف ایک فقرہ نے برانگیختہ کر دیا پھر اس تاریخ سے انھوں نے اس مدرسہ کا رخ نہ کیا۔ اسٹالین بدمزاج اور آوارہ لونڈوں کا سرغنہ تھا۔

ہٹلر کے متعلق ایک ابتدائی مدرسہ کا استاد بیان کرتا ہے کہ "ہٹلر ایک شریر، ضدی اور بہادر لڑکا تھا۔ اسے اپنے ہجولیوں سے بہت کم انس تھا۔ اس کے ساتھی بھی اس سے زیادہ ربط ضبط نہ رکھتے تھے۔ ایک سے زیادہ دوست اسے کم ملے۔ مسولینی کی شرارت یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ گاؤں ہی کی ایک لڑکی کو دیکھتا تو اس کو کمزور پاکر چھیڑتا۔ اس کے بالوں کو زور سے کھینچتا۔ جس سے لڑکی رونے اور چلانے لگتی اور وہ اس کی بے بسی و بے چارگی سے محظوظ ہوتا۔ اتاترک اپنے ضمیر اور رائے کی پابندی میں اتنے آزاد تھے کہ ان کی یہ آزادی ان کے دوستوں کو ناگوار ہوتی لیکن وہ وہی کرتے جو ان کے دل میں ہوتا اور سب کو بادل ناخواستہ اسی کا پابند ہونا پڑتا۔

ایک اور خصوصیت جو ان چاروں حکمرانوں کو مشترک طور پر حاصل ہے۔ اور جس کا ان کے

خیالات اور رجحانات زندگی پر خاص اثر ہوا وہ ان کی ماؤں کی مادرانہ شفقت ہے۔ وہ اپنے بے رحم باپوں کی محبت سے جس قدر محروم تھے ان کی مائیں اتنی ہی ان پر مہربان تھیں۔ ان شفقتوں اور نازبرداریوں کا یہ اثر ہوا کہ یہ ایثار و خودداری میں بالغ العقل لوگوں سے بھی بڑھ گئے۔ ہٹلر کہتا ہے کہ "میں باپ کا احترام کرتا ہوں اور ماں سے محبت" اور درحقیقت اسے یہی کہنا چاہئے۔ کیونکہ جب اسکے باپ کا انتقال ہوگیا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو بجز ماں کی شفقت کے اور کوئی سہارا اس کے لئے باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ دن بھر گھر پر رہتا۔ کھاتا، پیتا، کھیلتا اور سو رہتا۔ اس کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ دکھیاری ماں آٹے دال کی فکر میں پریشان رہتی۔ چار سال یونہی گذر گئے۔ مگر فقر و فاقہ کے باوجود اس کی ماں نے اسے کبھی آزردہ نہیں کیا۔ مسولینی کہتا ہے کہ "میں اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ماں کی محبت محسوس کرتا ہوں۔ اس نے میری خاطر بڑے دکھ اٹھائے میں جس چیز کے لئے مچل جاتا، اس کے مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتی۔ میری حالت سدھارنے کی غرض سے متواتر کئی کئی گھنٹے کام کرتی اور اف تک نہ کرتی" اسٹالین اور اتاترک کی ماؤں کا بھی قریب یہی حال تھا۔

ان حکمرانوں کی چند مشترک خصوصیات اور ہیں جن کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن ہم بقصد اختصار ان کو نظرانداز کرتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ ان کو ابتدا ہی سے ایسے حالات پیش آتے گئے جو ان کو موجودہ منازل تک کھینچ لائے۔ ان سب کی ابتدائی زندگیاں نہایت فلاکت و عسرت میں بسر ہوئیں۔ مسولینی عرصہ تک اسپین کی خاک چھانتا رہا۔ اسے تھوڑی سی چٹیل زمین بھی گذارے کو نہ ملی۔ ہٹلر باپ کے مرنے کے بعد وائنا کی گلیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ پیٹ بھرنے کو روٹی اور سر چھپانے کو کوئی جگہ نصیب نہ ہوتی۔ بھیک مانگی اور راہ گیروں کے ساتھ سڑکوں پر رات کو پڑ رہتا۔ یہاں تک کہ مجبور ہو کر اسے دوسروں کے سامنے

ہاتھ پھیلانا پڑا۔ کم وبیش انہی حالات سے اسٹالین کو بھی دوچار ہونا پڑا۔

ان حکمرانوں کو اوائل عمر میں جس طرح غربت ومسکینی کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح جوانی میں قید وبند کی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اسٹالین چھ مرتبہ جیل گیا۔ مسولینی، اٹلی، سوسیزلینڈ اور اسٹریا کے مختلف جیلوں میں گیارہ بار قید ہوا۔ استنبول میں اتاتورک کا "لال قید خانہ" مشہور تھا۔ انھیں متعدد بغاوتوں اور مختلف سازشوں کے جرم میں سزائیں دی گئیں۔ ہٹلر کو ایک سال تک قید خانہ میں رہنا پڑا۔ قید خانہ ہی میں اس نے اپنی مشہور تصنیف "جد وجہد" لکھی۔ غرض سب نے قید وبند کا تھوڑا بہت مزہ چکھا ہے۔

سا ل

یورپ کا اخلاقی زوال

مغرب کے اخلاقی زوال کا حال ہم عرصہ سے اخبارات میں پڑھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مشہور برطانوی مفکر لارڈ سالسبری کی ایک تقریر سننے کے قابل ہے۔ ذیل میں اس کا ضروری خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

لارڈ سالسبری مسیحی یورپ کے اخلاقی زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہم مسیحی دنیا کے جس گوشے پر بھی نگاہ ڈالیں، اخلاقی زبوں حالی کا ایک دردانگیز منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ منظر اتنا خوفناک، تاریک اور وحشت انگیز ہے کہ اس کو دیکھ کر اصلاح حالات کی امید بالکل معدوم ہوجاتی ہے۔ فریب کاری اور جھوٹ وقت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔ ناجائز اور شرمناک جنسی تعلقات اور بے ایمانی و مکاری کی اس درجہ گرم بازاری ہے کہ اب ہم ان انسانیت سوز حرکات وافعال کی کسی قسم کی اہمیت نہیں محسوس کرتے، جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے مادیت، نفس پرستی

اور حرام کاری کا غلبہ نظر آتا ہے"۔ لارڈ سالسبری اس عالمگیر تباہی سے نجات کی صرف ایک صورت بتاتے ہیں کہ دنیا مسیح کی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن ہو جائے۔ وہ آگے چلکر اس سے زیادہ دردانگیز لفظوں میں فرماتے ہیں:-

یورپ کو اس بات کا فخر ہے کہ اس نے اپنے آغوش میں دنیا کے بہترین دماغوں کی پرورش کی ہے۔ لیکن کیا وہ کوئی ایسا روحانی لیڈر بھی پیدا کر سکتا ہے جو اس ہولناک تاریکی کو شکست دیکر گم کردہ راہ انسانیت کو مذہب اور خدا کی راہ پر لگا دے۔ آج اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ارباب کلیسا نے وقت کی سب سے بڑی مشکل کے سامنے سپر ڈال دی ہے ان کی ناکامی نہایت دردناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک پروردگار کائنات خود رحمت وکرم کی ملکوتی افواج کے ساتھ اس زمین پر نہ اترے انسانیت کے مصائب وآلام کا خاتمہ ناممکن ہے۔ روح انسانیت نفرت وحقارت، حرص وہوس اور خوف ودہشت کے استیلاء سے پامال ہو رہی ہے، اور کوئی نہیں جو اس تباہی سے اس کو بچالے۔ ایک امریکی فلم ڈائرکٹر، جس نے یورپ کا سفر کیا ہے لکھتا ہے:-

"تم ایک طرف نگاہ اٹھاؤگے تو تمھیں دیہاتی کسانوں کی جماعتیں نظر آئیں گی۔ ان کے کھیت، مویشی اور فارم دیکھوگے۔ پھر دوسری طرف نظر دوڑاؤگے تو بالکل اسی شکل وصورت کے انسان اور مویشی اور فارم نظر آئیں گے، ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ ایک ہی شکل کے انسان ایک ہی طرح کے جانور اور ایک ہی قسم کے فارم۔ لیکن دونوں کے درمیان مشین اور بجلی کی ایسی محکم دیواریں حائل ہوں گی کہ ایک پرندہ بھی ادھر سے ادھر نہیں گذر سکتا"۔

مسیح نے فرمایا تھا دشمنوں کو اپنوں کی طرح پیار کرو لیکن اقوام یورپ اپنے ہمسایوں سے شیطان کی طرح نفرت کرتی ہیں۔ اور اس نفرت کا لازمی نتیجہ وہ خوف وہراس ہے جس کا بادل آج تمام یورپ پر چھایا ہوا ہے۔

مسٹر نول چیمبر لین نے حال ہی میں فرمایا ہے کہ اگر حملہ و جنگ کا اندیشہ جو شب و روز ہمارے دماغوں پر مسلط رہتا ہے کسی طرح دور ہو سکتا تو ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تھی اور یقیناً ہم یورپ کی مکدر فضا کو ایک مرتبہ پھر صاف شفاف بنا لیتے۔

اس عالمگیر خوف و ہراس کے بعد اقوام یورپ کی ملک گیری اور ہوس رانی کا نمبر آتا ہے۔ جذبات حرص و ہوا کی تسکین کی خاطر دول مغرب ہر طرح کے جھوٹ، فریب، بد دیانتی اور بداخلاقی کی نہایت آسانی سے مرتکب ہوتی ہیں۔ ظلمت و تاریکی کی ان مہیب قوتوں کے نتائج یورپ کی ریاستوں میں، انکی اقتصادی بدحالیوں میں، تزئید اسلحہ کی جد و جہد میں، انجمن اقوام کی بیچارگی میں اور مقدس معاہدوں اور صلحناموں کی خلاف ورزیوں میں ہم اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے مہیا کرنے کے لئے آج روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اور جنگ کا ہونا ناگزیر اور بالکل یقینی ہے۔ موجودہ حالت کے اندر دول یورپ کا تمام بدگمانیوں سے دور ہو کر ایک دوسرے کی طرف محبت و مودت اور اخوت و ہمدردی کا ہاتھ بڑھانا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

(عبدالحکیم)

اشتراکیت کی ناکامی

روس کے اشتراکی نظام نے چند سال پہلے تمام دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، لیکن اب آہستہ آہستہ اس کی کمزوریاں واضح ہو رہی ہیں اور لوگ اس سے بددل ہوتے جا رہے ہیں۔ ذیل میں ایک مشہور اشتراکی ماکس اسٹیمن کے ایک مضمون کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جس سے اس کی موجودہ حالت واضح ہو گی۔

نظام اشتراکیت کے ابتدائی مقاصد میں "ضبط نسل" کا مسئلہ مخصوص اہمیت رکھتا تھا۔

تاکہ آبادی کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روک کر روٹی کے مسئلہ کو حل کیا جائے، لیکن اس سعی میں اس کو جہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ آج بھی روس میں ایسی ہزاروں عورتیں موجود ہیں جو اپنے شیر خوار بچوں کے لئے دودھ خریدنے کی طاقت نہیں رکھتیں اور ان میں کتنی ایسی ہیں جن کے سر چھپانے کے لئے کوئی جھونپڑا تک موجود نہیں ہے۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ اب سویٹ گورنمنٹ نے بعض ایسے اعلانات کئے ہیں جو نہ صرف اس کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہیں بلکہ عقل اور جذبات انسانی کے بھی بالکل خلاف ہیں۔ مثلاً اس نے اعلان کیا ہے کہ اب نسل خوب بڑھانی چاہیے کیونکہ ملک کی حفاظت کے لئے کثیر التعداد فوج کی ضرورت ہے۔ اس نے عورتوں کو بھی مشورہ دیا ہے کہ ہر عورت سپاہی، ہوا باز، انجنیر بنے، اور زیادہ سے زیادہ سپاہیوں کی ماں بننے کی کوشش کرے! اسلئے طلاق کے معاملہ کو حکومت نے بہت سخت کر دیا ہے لیکن اس راہ کی تمام مشکلیں درحقیقت مالی قسم کی ہیں جو غربا کے لئے تو ضرور رکاوٹ بن سکتی ہیں لیکن امراء کی راہ نہیں روک سکتیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک مختلف طبقوں میں بٹ جائے گا۔ جو بہر صورت اشتراکیت کے دعاوی کے بالکل خلاف ہے۔

جنگ کے معاملہ میں اب سویٹ گورنمنٹ اشتراکیت سے زیادہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے قریب ہے کیونکہ اب پورا روس ایک فوجی چھاؤنی بن گیا ہے اور ہر نوجوان کو مسلح رہنے کا حکم دیا گیا ہے کسی شخص کو، جو فوجی صلاحیت رکھتا ہے، ملک چھوڑ کر باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، سزائے موت کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس کے گھر والوں نے باوجود علم، حکومت کو اس واقعہ کی اطلاع نہ دی تو حکومت ایسے خاندان کو اس کی تمام مقبوضات سے محروم کر کے سائبیریا کے دور دراز علاقہ میں جلاوطن کر دیگی، اور اگر یہ واقعہ خاندان والوں کی لاعلمی میں واقع ہوا تو اس کی سزا یہ ہے کہ وہ خاندان

دس سال کے لئے تمام شہری حقوق سے محروم رہے گا۔

روسی افواج کی تنظیم بالکل جرمنی اور اٹلی کے فوجی اصولوں کے مطابق ہو رہی ہے اور افسروں اور سپہ سالاروں کے لئے اسی طرح کے امتیازات قائم کئے جا رہے ہیں جو زار کے عہد میں رائج تھے اور جن کو سرمایہ داری کی لعنت سمجھکر سوئٹ گورنمنٹ نے مٹا دیا تھا۔

موجودہ بالشویک حکومت ایک بالکل بیورو کریٹک نظام ہے۔ اس کی سیاست کی باگ چند ایسے زعماء کے ہاتھوں میں ہے جن کا جور و استبداد زار کے جور و استبداد سے بھی زیادہ مطلق العنان ہے۔ تاہم وہ دعوی کئے جاتے ہیں کہ انھوں نے ایک اشتراکی نظام قائم کر رکھا ہے، حالانکہ اشتراکیت سے ان کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

اسٹالین نے تمام سابق سوئٹ مجلس آئین ساز کو ختم کر کے، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کے طریقوں پر ایک نئی مجلس آئین ساز کی تشکیل کی ہے جس میں قوم کے ارادے اور منشا کو کوئی دخل نہیں۔ اس مجلس کی دو شاخیں ہیں (۱) مجلس خصوصی (۲) مجلس عمومی۔ مجلس خصوصی کے رکن صرف اعلیٰ حکام اور رؤسا ہو سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو مجلس عمومی میں بھی شرکت کا حق حاصل ہے۔ اسٹالین روس کا ڈکٹیٹر ہے۔ اس کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ فرمائیے یہ استبداد نہیں تو اور کیا ہے۔ قوم کا مختلف طبقوں میں بٹ جانا ملکی اختیارات کا صرف چند مستبد لوگوں کے ہاتھوں میں محدود ہو جانا۔ مزدوروں کی مزدوری کاٹ کر امیروں کے خزانے بھرنا کیا انہی برکات کے پھیلانے کے لئے اشتراکیت وجود میں آئی تھی؟

اسوقت بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ روس اشتراکیت کے اصولوں پر نہیں چل رہا ہے۔ کیونکہ ملک کی دولت میں ملک کے تمام باشندے برابر کے شریک نہیں رہے بلکہ وہ صرف چند آدمیوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جو صاحب اقتدار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کا اقتدار برابر باقی

لوگوں کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ قوم حقیقت حال سے آگاہ نہ ہونے پائے تاکہ ان کے خلاف
ٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ غور کیجئے اس کو نظام اشتراکیت کہیں گے یا نظام سرمایہ داری؟
ورا آگے بڑھکر مزدوروں کی اجرتوں کا بھی جائزہ لے لیجئے جس پر اشتراکیت کی بنیاد قائم ہے۔
ر اتنی اجرت بھی نہیں پاتے جو ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو اور اسکے برعکس معضوں
رنی ۵۰ گنی سے بھی زیادہ ہے مثلاً موسیو اسٹرولیا ڈوف کی۔ کیا کارل مارکس نے انہی
ا تعلیم دی تھی؟

س سے آنیوالوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہاں کے کارخانوں کے مالکوں اور دوسرے لوگوں
ی بڑی رقمیں جمع ہیں۔ وہ لوگ اسی طرح عیاشی اور اسراف کی زندگی بسر کر رہے
عہد زار کے امراء بسر کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس نگاہوں کو خیرہ کرنے والے محل ہیں،
یں ہیں۔ خدم و حشم ہیں۔ غرضیکہ دنیاوی لذات سے متمتع ہونے کے لئے جتنے سامانوں
ہے سب ان کے پاس موجود ہیں۔ غرض آج اشتراکی نظام کے نام سے وہ سب کچھ
رہا ہے جو دنیا کی سرمایہ دار قومیں ہمیشہ سے کرتی آئی ہیں۔ لیکن بالشویک لیڈر ان
اندازکرتے جا رہے ہیں، ان کی ساری توجہ تو محض اس بات کی طرف ہے کہ قوم کی باگ
ں سے چھوٹنے نہ پائے۔ یہ لیڈر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سرمایہ دار حکومتوں
رضے لیتے جا رہے ہیں۔ اتنے قرضے لینے کے باوجود بھی ملک کے لاکھوں انسان بھوکوں
وران فاقہ مستوں کی تعداد بڑھتی ہی جائے گی اس لئے کہ بالآخر یہ غریبوں کے
سر قرضہ ادا کئے جائیں گے۔

ع۔ ر۔ ناظر

التشافات

کتاب مقدس کا سب سے بڑا لغت

ایک ہزار برس کا زمانہ گذرا، ایک یہودی عالم، داؤد بن ابراہیم فاسی نے کتاب مقدس کا ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا تھا لیکن یہ لغت ضائع ہوگیا تھا۔ کچھ دن ہوئے بعض علماء کو اس کے بعض نسخوں کا سراغ لگا اور یورپ و امریکہ کے تمام مطابع نے اس کے حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیابی پروفیسر سلومن سکوس کو ہوئی جو فیلاڈلفیا کے ڈورسی کالج میں عربی کے استاذ ہیں۔ انھوں نے یورپ کے مختلف کتب خانوں سے اس کے تمام منتشر اجزاء فراہم کئے اور اب امریکہ کی یال یونیورسٹی نے اس کا پہلا حصہ چھاپکر شائع کیا ہے اور بقیہ حصے یکے بعد دیگرے اسی یونیورسٹی کے اہتمام سے شائع ہوں گے۔

یہ عظیم الشان تصنیف اپنے زمانہ کی نہایت مشہور تصنیفوں میں تھی۔ یہاں تک کہ یہ "کتاب" کے نام سے موسوم ہوگئی تھی۔ مصنف نے اصل کتاب عربی زبان اور عبرانی حروف میں لکھی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں علمائے یہود عربی زبان استعمال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے اس کو چھوڑدیا۔ البتہ عبرانی حروف میں عربی زبان کا استعمال ایک حد تک باقی رہگیا۔

اس لغت کی مدد سے مفسرین توریت کی بعض ایسی مشکلیں حل ہوتی ہیں جو اب تک لاینحل تھیں۔ مثلاً ارمیا نبی کے صحیفہ میں وارد ہے کہ خداوند نے جب کہ وہ فلسطین میں تھے، ان کو حکم دیا کہ وہ فرات کی طرف جائیں اور اپنا پٹکا ایک چٹان میں وہاں چھپادیں۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا

ہوتا ہے کہ فرات اس سرزمین میں ہے جو قدیم زمانہ میں بابل کے نام سے مشہور تھی اور بابل و فلسطین میں اس زمانہ میں نہایت سخت عداوت تھی یہاں تک کہ کوئی شخص ان کے حدود کو پار کرکے ایک دوسرے کی سرحدوں میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یرمیاہ نبی کے لئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ سرحد کو عبور کرکے فرات کے کناروں تک پہنچ گئے۔

علمائے تفسیر کے نزدیک یہ سوال ہمیشہ ایک معمہ رہا لیکن اس لغت نے دریافت ہو کر دفعتہ اس عقدۂ لاینحل کی تمام گتھیاں سلجھا دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبرانی لفظ "پرات" جس کا عربی میں فرات ترجمہ کیا گیا ہے درحقیقت شہر اورشلیم کے اطراف کے اس حصہ کا نام تھا جس کو اب "فاراح" کہتے ہیں۔

(اگر یہ داستان سچ ہے تو اس سے ان تحریفات کا بھی ایک پہلو روشنی میں آتا ہے جو کتاب مقدس میں واقع ہوئیں۔ مترجم)

کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را!

برسٹل یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر کونکلن کا بیان ہے کہ وہ تمام کوششیں جو اب تک علمائے سائنس نے مصنوعی انسان پیدا کرنے کی راہ میں صرف کی ہیں، رائگاں گئی ہیں اور آئندہ ان کے کامیاب ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ علم انسانی کتنی ہی ترقی کر جائے لیکن زندگی کا راز اس کے لئے ہمیشہ معمہ ہی رہے گا۔ اور اگر ایسا ہوا کہ علم نے اپنے معمل کیمیائی کے اندر زندگی کا راز دریافت کر لیا تو اس روز سے انسانیت کا زوال شروع ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ یقینی ہے کہ جو انسان کیمیاوی نلکی کے اندر سے ظہور میں آئے گا وہ بالکل ایک صناعی مخلوق اور جذبات و عواطف اور شعور و احساس سے یکقلم خالی ہوگا۔ (ع۔ ر ناصر)

تقریظ وتبصرہ

بیان للناس: منزل اول۔ مؤلفہ مولانا احمد الدین۔ ملنے کا پتہ: دفتر امت مسلمہ امرتسر۔ قیمت للعہ

یہ خواجہ احمد الدین صاحب کی تفسیر بیان للناس کی پہلی منزل ہے۔ فاتحہ سے لیکر سورۂ نساء کے چوبیسویں رکوع تک کی تفسیر اس میں آگئی ہے۔ یہ کتاب بڑا عرصہ ہوا ہم کو ریویو کے لئے موصول ہوئی تھی۔ خیال تھا کہ اس کو پڑھکر اس پر مفصل تبصرہ لکھیں گے لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کو پڑھنے کی نوبت نہیں آئی اور اگر کاموں کی رفتار یہی رہی جو آج ہے تو شاید ہی کبھی اس کی نوبت آسکے۔ مجبوراً کتاب کی رسید لکھنے پر قناعت کرتے ہیں اور خواجہ صاحب سے نہایت ادب سے معافی چاہتے ہیں کہ وعدہ اور ان کی پیہم یاد دہانیوں کے باوجود ہم اس کتاب پر کچھ لکھنے کا موقع نہ نکال سکے۔

ہم نے تھوڑی سی فرصت میں کتاب کے بعض مباحث پر نگاہ دوڑائی۔ ہم کو یہ تفسیر بالکل پسند نہیں ہے۔ اس کا کوئی اصول نہیں ہے لکھنے والے کے دماغ میں جو خیالات بھرے ہوئے ہیں ہر آیت کے ذیل میں ان کو ٹھونس دینے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ قرآن کے الفاظ اس کے متحمل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ سرسری نگاہ میں بھی، جو چند صفحات سے آگے نہ بڑھ سکی، ہم کو متعدد ایسے الفاظ ملے جن کے معانی مصنف نے بالکل اپنے جی سے گڑھ لئے ہیں، لغت سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ اور قاعدہ زبان تو گویا، قرآن کو سمجھنے کے لئے سرے سے ضروری ہی نہیں۔

طرز بیان بھی بالکل غیر موثر بلکہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ زبان بالکل پنجابی ہے۔ سرسید مرحوم کی تفسیر میں اگر ان کی بے اعتدالیوں سے تکلیف ہوتی ہے تو کم از کم زبان کا لطف موجود ہوتا ہے۔ عام مباحث میں وسعت نظر اور ایک سچے جوش وجذبہ کی نمود ہوتی ہے، اس تفسیر میں یہ چیزیں بھی مفقود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ناواقف

مسلمانوں کو اس تفسیر کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔ اور خواجہ صاحب کے متبعین کو توفیق دے کہ وہ کتاب الٰہی کی کسی سچی خدمت میں مشغول ہوں۔

فصل الخطاب:- مصنفہ اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی ملنے کا پتہ منیجر مکتبہ عبرت نجیب آباد۔ قیمت فی جلد مجلد عمر غیر مجلد ۱۲ر صفحات ۱۲۰۔ کتابت و طباعت متوسط۔

یہ کتاب عنایت اللہ خاں مشرقی بانی خاکسار تحریک کے "اختیار مطلق" پر ایک کاری ضرب ہے۔ اس میں قرآن مجید اور احادیث و واقعات تاریخ اسلام سے ثابت کیا گیا ہے کہ اس قسم کی مطلق العنانی جو بانی خاکسار تحریک اپنے لئے چاہتے ہیں اسلام میں کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے۔ ہم نے کتاب جا بجا سے دیکھی۔ مصنف نے اپنے دعاوی کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے اور بحمد اللہ نفس مسئلہ پر بحث کی ہے ذاتیات سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا ہے۔

بعض بحثیں پڑھکر محسوس ہوا کہ ان میں غیر ضروری طوالت کو راہ دی گئی ہے۔ جس سے اصل نتیجہ تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے اور طبیعت کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ مصنف کی بعض کتابیں ہم نے پڑھی ہیں۔ ان کا عام انداز یہ نہیں ہے۔

خاکسار تحریک یوں بھی اب نزع کی حالت میں پہنچ چکی تھی۔ انشاء اللہ یہ کتاب اس تحریک کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دے گی۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے۔ (ا۔ ان ا)

جمع القرآن والاحادیث:- مؤلفہ مولانا ابو القاسم محمد خاں صاحب سیف بنارسی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۴۳ صفحے۔ کاغذ سفید و بہتر کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ۶ر ملنے کا پتہ:- آل انڈیا اہل حدیث دارالاشاعت۔ امرتسر

قرآن کریم کی ترتیب کے متعلق مسلمانوں میں عام خیال یہ ہے کہ یہ کام حضرت عثمان غنی کے ہاتھوں انجام پایا۔ یہ خیال غلط ہونے کے علاوہ قرآن مجید پر نکتہ چینی کا ایک وسیع دروازہ کھول دیتا ہے۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔ آیات قرآن، احادیث اور آثار صحابہ سے مخالفین کے

تمام مزعومہ شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے اور مستند دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کا جامع و مرتب خود خدائے رحمان ہے۔ یعنی اس کی پوری ترتیب آنحضرت صلعم کے عہد میں ہدایت آسمانی کے مطابق ہو چکی تھی۔ قرآن کی طرح حدیثوں کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انکی تدوین بہت بعد میں ہوئی ہے۔ پیش نظر رسالہ کے ایک حصہ میں تدوین حدیث پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس سے متعلق عام معترضین اور منکرین حدیث کے تمام اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلعم کے اقوال و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ احادیث کی تحریر و ترتیب کا کام عہد رسالت میں شروع ہو چکا تھا۔ اور خود جناب رسالت مآبؐ نے بعض صحابہ کو حدیثیں لکھوائیں اور بعض لوگوں کو لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ قابل قدر اور عام لوگوں کے فائدہ اٹھانے کے قابل ہے۔ صرف ایک امر قابل گذارش ہے کہ ترتیب قرآن کے باب میں مصنف نے بعض آیات سے جو نتائج نکالے ہیں، ہم ان سے متفق نہیں ہیں۔ ان کے سیاق و سباق اور مطالب پر مزید غور و تعمق کی ضرورت ہے۔

ترجمان وہابیہ :۔ مصنفہ نواب صدیق حسن خان مرحوم۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۱۴۴ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی قیمت مع محصولڈاک ۵؍ ملنے کا پتہ :۔ حقانی بک ڈپو۔ امرتسر۔ (پنجاب)

غدر ۵۷ء کے بعد کا زمانہ، ہندوستان میں، عام افراتفری اور انتشار و پراگندگی کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کے اندر ایک تباہ ہونیوالی قوم کی تمام خصوصیات پیدا ہو چکی تھیں۔ عوام تو عوام، خواص امت کو بھی باہمی نزاعوں سے فرصت نہ تھی۔ بات بات پر جھگڑے ہوتے تھے اور برطانوی عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے تھے۔ اسی زمانہ کی بات ہے کہ تحریک اہل حدیث جو یکسر ایک مذہبی و اصلاحی تحریک تھی، بعض مخالفین کی ریشہ دوانیوں کی بدولت برطانوی حکام کے نزدیک ایک باغیانہ تحریک بنگئی اور اکابر علمائے حدیث کو اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے بڑی کوششیں کرنی پڑیں۔ نواب صاحب مرحوم

کا یہ رسالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں نہایت واضح دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ جماعت اہل حدیث کا محمد ابن عبدالوہاب نجدی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جماعت نہ کسی خاص شخص کی مقلد ہے اور نہ اسے معاملات سیاسیہ سے کوئی تعلق ہے۔ آخر کے چند صفحات میں علماء احناف و اہل حدیث کا ایک صلحنامہ درج ہے، اس کی دفعات آج بھی قابل عمل ہیں۔ ان مسلمانوں کو ان پر عمل پیرا ہونا چاہئے جو آئے دن حنفیت اور وہابیت کے جھگڑوں سے اسلام کو بدنام کر رہے ہیں۔

مجاہد ہند: مرتبہ مولوی محمد اسحاق صاحب حنیف امرتسری۔ مدیر بلغ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۲ صفحے کاغذ اور کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ قیمت ۲/ ملنے کا پتہ:۔ حقانی بکڈپو۔ امرتسر۔ (پنجاب)

ہندوستان کی سیاسی بیداری کی تاریخ میں مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ساری زندگی مسلمانوں کی اصلاح و ترقی میں گذری انہوں نے آزادی اور اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اس وقت نعرۂ حق بلند کیا جبکہ تمام عالم میں سناٹا تھا۔ وہ حق کی راہ میں لڑے اور اسی راہ میں انھوں نے اپنی جان عزیز قربان کردی۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات، ان کے تعلیمی مشاغل، ان کی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیاں اور مجاہدانہ کارنامے نہایت حیرت انگیز ہیں، جو اس چھوٹے سے رسالہ میں نہایت خوبی سے بیان ہوگئے ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس دور نکبت وادبار میں اس مجاہد اعظم کی سیرت سے زندگی اور روشنی حاصل کرے۔

کشمیر:۔ مصنفہ مولوی عبدالمجید صاحب بی۔ اے گورکھپوری (یوپی ایکسائز سروس) تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۱۳۲ صفحے کاغذ متوسط۔ کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت غیر مجلد ۱۲/ مجلد عہ/

ملنے کا پتہ:۔ قاضی محمد مسعود علی۔ محلہ قاضی پور خورد۔ گورکھپور۔

"کشمیر" کشمیر کے دلچسپ حالات کا ایک جامع مرقع ہے۔ شروع میں مصنف کے برادر خرد مولوی ماجد علی صاحب وکیل گورکھپور کا ایک مختصر دیباچہ ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

مصنف کو زیارت کشمیر کے دوران میں جن مقامات کی سیر کا موقع ملا ہے، اس کے تاریخی جغرافی، تمدنی حالات نہایت تحقیق و کاوش سے جمع کر دیے ہیں نیز مختلف دور کے بزرگان دین، علماء و مشائخ اور شعرا کا بھی ذکر آگیا ہے۔ آخر میں کشمیر کی موجودہ شورش پر روشنی ڈالی گئی ہے کتاب دلچسپ اور سیر کشمیر کے شائقین کے لئے بہترین رہنما ہے۔ کتابت و طباعت اور زبان میں بعض نقائص نظر آئے، امید ہے طبع ثانی میں ان کی اصلاح ہو جائے گی۔

اثبات قربانی بآیات قرآنی:۔ ناشر حاجی بشیر احمد صاحب۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۷۰ صفحے کاغذ درست کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت کچھ نہیں محصول ڈاک کے لئے ۱؍۔ ملنے کا پتہ:۔ مہتمم حلقہ دعوت و ارشاد چوک بابا اٹل۔ کوچہ کوماسنگھ۔ امرتسر۔ (پنجاب)

امرتسر میں کچھ دنوں سے "حلقہ دعوت و ارشاد" کے نام سے ایک تبلیغی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو کتاب و سنت کے تمسک اور سلف صالحین کے اتباع کی دعوت دی جائے اور جو مسلمان مغربی خیالات و افکار سے متاثر ہیں ان پر مغربی تہذیب و تمدن کے معائب اور اسلامی کلچر اور روایات کے محاسن بے نقاب کئے جائیں۔ اس نیک مقصد کے لئے اسکی طرف سے ہر ماہ میں حالات حاضرہ کے مناسب کوئی مفید تبلیغی مضمون پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوتا ہے اور مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ماہ جون میں اس حلقہ نے مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی مدیر ترجمان القرآن کے دو شائع شدہ مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ دونوں مضامین قربانی سے متعلق ہیں۔ اور پنجاب ہی کی ایک جماعت کے چند اشتہارات و مضامین کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ مولانا موصوف نے قرآنی آیات سے قربانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور منکرین قربانی کے اعتراضات و شکوک کا نہایت مسکت جواب دیا ہے۔ جو لوگ قربانی کے اقتصادی پہلو اور اس کے روحانی فلسفہ کو سمجھنا چاہیں وہ اس رسالہ کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

تبصرہ بر تذکرہ :۔ ناشر مہتمم حلقہ دعوت و ارشاد۔ تقطیع ۱۸ × ۲۲ حجم ۴۴ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت مع محصول ڈاک ۵ ؍

مسٹر عنایت اللہ مشرقی کے "تذکرہ" کا نام اخبارات و رسائل میں بارہا آ چکا ہے۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی، علمائے اسلام نے اس کے ملحدانہ خیالات کی مخالفت کی۔ اخبارات و رسائل میں اس کے خلاف مضامین نکلے۔ جا بجا جلسوں میں اس کے خلاف نفرت کے ریزولیشن پاس ہوئے اسی زمانہ میں چودھری محمد حسین صاحب ایم۔ اے لاہوری کے قلم سے اخبار زمیندار کی کئی اشاعتوں میں اس کتاب پر ایک مفصل تبصرہ شائع ہوا۔ یہ بر وقت بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد سے اس کتاب کا چرچا مدہم پڑ گیا۔ لیکن ادھر ڈیڑھ ایک سال سے عنایت اللہ صاحب نے پھر کروٹ لی اور ایک نئی تحریک تحریک خاکسار کے نام سے شروع کی۔ اور اس تحریک کے پردہ میں اس کتاب کو بھی پھیلنے کے مواقع ملے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی طرف پھر توجہ کیجائے۔ چنانچہ حلقہ دعوت و ارشاد نے چودھری محمد حسین صاحب کے تبصرہ کے منتشر اجزا کو کتابی صورت میں شائع کر کے مسلمانوں کی ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

یار غار :۔ مولفہ مولوی محمد ظفر صاحب۔ ایم، اے، ایل، ایل، بی وکیل۔ تقطیع $\frac{22 \times 18}{16}$ حجم ۱۰۶ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی قیمت مع محصول ڈاک ۱؍ ملنے کا پتہ:۔ انجمن رفیق الاسلام گوڑ گانوہ (پنجاب)

انجمن رفیق الاسلام ایک خاموش تبلیغی انجمن ہے۔ اسلام کی عام اشاعت اور مسلمان بچوں کی اخلاقی حالت درست کرنے کی غرض سے عام فہم زبان میں چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کرتی رہتی ہے۔ جو نہایت مفید ہوتی ہیں۔ الاصلاح کی کسی گذشتہ اشاعت میں اس انجمن کی دو کتابوں کا تعارف ہو چکا ہے۔ یار غار بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی اختصار و جامعیت کے ساتھ نہایت آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ مسلمان بچوں اور بچیوں اور عام

مسلمانوں کے پڑھنے کے لئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ خوبیوں کے باوجود قیمت کچھ نہیں ہے صرف محصول ڈاک کیلئے ٹکٹ بھیجکر مفت مل سکتی ہے۔

ادب لطیف افسانہ نمبر:۔ مرتبہ چودھری برکت علی صاحب بی۔ اے و مرزا ادیب صاحب بی۔ اے حجم ۱۶۰ صفحات، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت افسانہ نمبر ۱۲؍ سالانہ للعہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اردو۔ لاہور

ادب لطیف ایک اچھا رسالہ ہے ماہ جون و جولائی کی مشترکہ اشاعتوں میں اس نے اپنا افسانہ نمبر شائع کیا ہے۔ منظوم و منثور دونوں قسم کے مضامین ہیں اور اکثر عمدہ۔ افسانہ نویسی پر بھی چند مختصر مضامین ہیں۔

پیش نظر افسانہ نمبر کو چند تصاویر سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ ان میں دو ایک آرٹ کا اچھا نمونہ ہیں۔ صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے یہ نمبر کامیاب ہے۔ اور اس کے کارکنوں کی کوشش لائق تحسین۔

پیغام حق:۔ مرتبہ سید محمد شاہ صاحب ایم۔ اے تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۳۲ صفحے کاغذ معمولی کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت سالانہ عہ۔ مقام اشاعت:۔ ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور۔

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے۔ ابتک اس کے تین نمبر شائع ہوچکے ہیں ہر نمبر میں مذہب اور مسلمانوں کی عام اصلاح کے متعلق بعض مفید مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ثلاثیات کے عنوان سے اس کا ایک مستقل باب ہے جسمیں ایسی حدیثوں کے ترجمے درج کیے جاتے ہیں جنمیں صرف تین باتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے تیسرے نمبر میں "کانگریس کی الٹی برکات" کے عنوان سے جو مقالہ افتتاحیہ لکھا گیا ہے وہ بالکل لغو ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی خدمت کے معنی اگر یہ ہیں کہ ان کے فطری جذبات و داعیات کو کچلا جائے اور انکو غلامی و بزدلی کی تعلیم دیجائے۔ تو ہمارے ان مذہبی ناصحوں پر افسوس ہے۔

پیمانہ: ناظر ساغر نظامی۔ مرتب صہبا۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۴۸ صفحے۔ کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت سالانہ عہ پتہ:۔ ادبی مرکز۔ میرٹھ

ساغر کا پیمانہ متعدد بار گردش کر چکا ہے لیکن شومئ قسمت سے اسے دوام بہت کم نصیب ہوا۔ ابکے جو پیمانہ ہمارے سامنے ہے وہ دیکھنے میں تو خوبصورت لگتا ہے بہت چھوٹا۔ رندان قدح خوار کی اس سے کیا تسکین ہوگی پھر ابکے اسمیں وہ تندی و تلخی بادہ نظر نہیں آتی جو ساغر صاحب کا مخصوص فیضان تھا اب انھوں نے شراب کے نام سے حریفان بزم کو کوئی سہج شربت ہی پلا دینا چاہا ہے۔ (ع۔ ن)

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتابِ الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ اسوقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کردی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں۔ پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:۔ اس کتاب میں مولانا کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتداء کی قسموں کا عمود سورہ (دینونت) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے۔ اسی ضمن میں تمام امم معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موقع عبور اور طریقۂ عبور کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے۔ "نطق" سے معاد اور "خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کے جو عجیب بیان ہوئے ہیں انکی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت:۔ ۶؍ (باقی سرورق صفحہ ۳ پر ملاحظہ ہو)

| نمبر ۹ | ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء | جلد ۲ |

فہرست مضامین

شذرات

اگست کے پرچہ میں ہم نے چھوٹے بچوں کیلئے ایک علیحدہ دارالاقامہ کی تعمیر کیلئے اپیل کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مدرسۃ اور قوم کے ہمدردوں نے اس اپیل پر توجہ فرمائی۔ ابتک اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل عطیے مل چکے ہیں۔

(۱) جناب حاجی، حافظ، ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب صدر دائرہ حمیدیہ (سول سرجن پرتاب گڑھ) ۵۰۰ روپے۔

(۲) جناب شیخ محمد سلیمان صاحب رکن دائرہ حمیدیہ (ساکن مرزاپور اعظم گڑھ، حال مقیم رنگون) ۶۶ روپے۔

(۳) از موضع پھریہا ۱۹ روپے ۳ آنے ۶ پائی۔

(۴) جناب علی محمد صاحب سنجرپوری اسٹیشن ماسٹر سرائمیر ۵ روپے ۸ آنے

(۵) جناب منشی علاء الحق صاحب (بندول) ۵۰ روپے (وعدہ)

(۶) جناب مولوی حمید احمد صاحب انصاری، سیجل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۲۰۰ روپے (وعدہ)

جناب شیخ نورالحسن صاحب (برا مد پور) کی شرکت بھی اس کارخیر میں متعین ہو چکی ہے۔ لیکن انکی رقم کا اعلان بعد میں ہو سکیگا۔ ہم کو چھ کمرے بنوانے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے ایک کمرہ کی رقم دیدی ہے۔ شیخ سلیمان صاحب نے ایک کمرہ کی لاگت سے زیادہ رقم دیدی ہے لیکن وہ کسی کام کو نا تمام چھوڑنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے ہم ان کے حصہ کے دوسرے کمرے کی طرف سے بھی بالکل مطمئن ہیں۔ اب صرف تین کمروں کا معاملہ رہ گیا ہے۔ ان کے لئے ہماری نگاہیں ان لوگوں کی طرف لگی ہوئی ہیں جنھوں نے مدرسہ کی صداؤں کو ہمیشہ سنا ہے اور اس کی ضرورتوں کے لئے ہمیشہ فیاض رہے ہیں۔

تعمیر کا ضروری سامان ہو رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو اکتوبر کے آخر میں کام شروع ہو جائے گا۔ اور کوشش کی جائے گی کہ عمارت جلد سے جلد تیار ہو جائے۔ طلبہ کو نہایت تکلیف ہے اور ساتھ ہی ہم کو اپنے جدید نظام تربیت کے اجراء کے لئے عجلت بھی ہے۔

ان ہمدردوں کا اخلاص ہمارے شکر و سپاس سے بالاتر ہے۔ ان کے لئے اس مدرسہ کا وجود ہی

سرتاسر زبان سپاس ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ہماری قوم کے اندر ایسے اشخاص پیدا کر دئے ہیں جو قومی اور مذہبی کاموں میں روپیہ خرچ کرنا، روپیہ کا بہترین مصرف سمجھتے ہیں۔

شیخ سلیمان صاحب نے حال ہی میں پانسو روپے کی گرانقدر رقم مدرسہ کی مرمت کے لئے سو روپے دائرہ کے لئے۔ سو روپے کتبخانہ کے لئے، ڈیڑھ سو بمد تعلیم، ڈیڑھ سو بمد زکوٰۃ عنایت فرمائی۔ ان کی فیاضیوں کا کماحقہ شکریہ ادا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

دائرہ حمیدیہ کے معاونین میں دو ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔

(۱) جناب مایت صاحب، ہڈ ماسٹر اے، وی اسلامیہ ہائی اسکول رنگون۔

(۲) جناب مولوی قمرالزماں صاحب اصلاحی اتالیق و مدرس دینیات ۔۔۔۔۔

یہ دونوں حضرات ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

مولوی نورالہدیٰ صاحب اصلاحی اور جناب مرزا محمد صدیق صاحب برما کے دورے سے واپس آگئے۔ ادھر کئی سالوں سے، مالی مشکلات کی وجہ سے، مدرسہ کا وفد سال بسال برما جاتا ہے۔ حالانکہ برما کے کاروباریوں کی حالت کچھ اچھی نہیں رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہمدردان مدرسہ نے ہمیشہ حوصلہ اور ہمت کے ساتھ وفود مدرسہ کی پذیرائی کی اور جو کچھ مدد کر سکتے تھے اس سے دریغ نہیں کیا۔ اس سال بھی انھوں نے جو کچھ کیا ہے، ہماری امید سے کم نہیں ہے۔ زیادہ ہی ہے۔ پس ہم برما کے تمام ہمدردوں کے دل سے شکر گذار ہیں۔

حضرات ذیل سے مالی مدد کے علاوہ ہر طرح کی اخلاقی مدد بھی وفد کو حاصل ہوئی اس لئے ہم ان حضرات کے خاص طور پر ممنون ہیں۔

(۱) جناب شیخ محمد سلیمان صاحب (۲) مسٹر عبدالرحمن صاحب (۳) مسٹر قربان علی عظمی (۴) جناب ولی محمد صاحب (۵) جناب ایڈیٹر صاحب مجاہد (۶) جناب اڈیٹر صاحب شیر (۷) جناب حافظ عبدالشکور صاحب (۸) جناب ملا احمد داؤد صاحب مدنی (۹) احمد ابراہیم کمپنی (۱۰) احمد عبدالکریم اینڈ سنس (۱۱) جناب حبیب صاحب (۱۲) جناب مستری عبدالاحد صاحب (۱۳) جناب محمد یعقوب انصاری صاحب (۱۴) ایس اے حسن اینڈ برادرس (۱۵) جناب محمد شبیر خاں صاحب (۱۶) جناب مولوی عبدالشکور صاحب (۱۸) جناب مسٹر انعام اللہ خاں صاحب (۱۸) عبدالغفور برادرس پانڈو ڈنگ (۱۹) جناب محمد یوسف صاحب سنجر پوری (مونچو) (۲۰) جناب عبداللہ صاحب سنجر پوری (تناچاؤں) (۲۱) جناب شیخ عبدالحمید صاحب و شیخ محمد عمر صاحب (پالون) (۲۲) جناب بابو فتح علی صاحب رئیس ہنذ ده (۲۳) جناب حاجی ظہور احمد صاحب متولی ہندوستانی مسجد (۲۴) جناب حافظ حبیب اللہ صاحب چوکسے (۲۵) جناب حافظ علی حسن صاحب (۲۶) بابو سراج الدین خانصاحب ہنذ ده (۲۷) جناب شیخ عبدالرؤف و مقبول احمد صاحبان بسیہن (۲۸) جناب مصطفےٰ خانصاحب رنگون (۲۹) مرزا محمد عثمان صاحب (کلابستی) رنگون

اگست کے شذرات میں ہم محترم احمد ملا داؤد صاحب مدنی کی عطا کردہ کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کتابوں کا بےچینی کے ساتھ انتظار تھا۔ عزیز محترم مولوی نورالہدیٰ سلمہ ان کے صندوق اپنے ساتھ لائے۔ ان کتابوں کو دیکھکر جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے اس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہے۔ ان سے مدنی صاحب کے اصلی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور یقیناً ان کو سینے سے جدا کرکے انھوں نے ایثار فی سبیل اللہ کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو قابل تقلید ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے غریب کتبخانہ اور اسکے اساتذہ و طلبہ پر انکا یہ ایک ایسا احسان ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس اخلاص کا صلہ عطا فرمائے اور دوسروں کو ان کے عمدہ نمونہ کی پیروی کی ہمت بخشے۔

الاصلاح میں اخبارات و رسائل پہ جو ریو و نکلتے ہیں بعض لوگ ان کے متعلق مراسلات

مکاتبات کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں اور یہ مراسلات موافق و مخالف دونوں قسم کی ہوتی ہیں۔ اڈیٹر کے لئے ان تمام مراسلات کا جواب دینا مشکل ہے اور ان پر رسالہ میں بحث و نظر کا ایک علحدہ باب قائم کرنا بالکل ناممکن - ہم کو جو کتابیں ملتی ہیں۔ سچائی کے ساتھ ان کی نسبت جو ہماری رائے ہوتی ہے، ظاہر کر دیتے ہیں۔ نہ موافقت کے اظہار میں بخیل ہیں نہ مخالفت کے اعلان میں مداہن- اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی مسلک صحیح ہے اور گو اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے بہتوں کو ہم ناخوش کر چکے ہیں جن میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی رفاقت اور دوستی ہم کو نہایت عزیز تھی لیکن ہم کو اس کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو منافق ہوں گے جس کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

اگر ہر چھوٹی بڑی کتاب کے ریویو کے سلسلہ میں مخالف و موافق بحثیں شروع ہو جائیں اور اڈیٹر کی طرف سے انکا جواب اور رسالہ میں انکی اشاعت بھی ضروری سمجھی جائے تو شاید الاصلاح کے تمام ابواب اسی ایک بحث کیلئے خاص کر دینے ہوں گے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ کی کس مپرسی کا جو عالم ہے وہ محتاج بیان نہیں، دوسروں کو تو اسکی فکر ہی کب تھی کہ ان سے کوئی شکایت ہو البتہ ہمارے علما، اس معاملہ پر کبھی کبھی غور کرتے تھے لیکن اب انھوں نے بھی اس کے مستقبل پر غور کرنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ اگر اس وقت یہ سب سے اہم مسئلہ نہیں تو کم از کم ان مسائل میں تو ضرور ہے جن پر ہندوستان کے مسلمانوں کی آئندہ قسمت کا انحصار ہے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ کی تحصیل صرف غربا کرتے ہیں، امرا اور عام ارباب استطاعت کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور یہ غربا بھی عموماً محض اس وجہ سے اس میں سر کھپاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم گراں ہونے کی وجہ سے حاصل نہیں کر سکتے اگر آج اس راہ کی دشواریاں دور ہو جائیں یا کم ہو جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ بہت کم لوگ رہ جائیں گے جنکو عربی تعلیم سے دلچسپی باقی رہ جائے۔ اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھکر کون کہہ سکتا ہے کہ ان دشواریوں کے دور ہونے میں بہت دیر لگے گی۔ پس جن لوگوں کو ہندوستان میں مذہبی تعلیم باقی رکھنی ہے انکو چاہئے کہ اس وقت کے آنے سے پہلے اس معاملہ پر غور کرلیں۔

ہم کو اس سچائی سے انکار نہیں ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم عربی مدارس کی تعلیم سے بھی زیادہ بے قیمت ہوگئی ہے۔ معمولی معمولی نوکریوں کے لئے ہزاروں گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ درخواستیں دیتے ہیں اور محروم رہتے ہیں اور اس محرومی نے بہت حد تک لوگوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ تاہم وہ اس محرومی کے اندر بھی ایک امید کی قوت محسوس کرتے ہیں۔ ان کو خیال ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ مسائل میں دوسروں کے مقابل میں زیادہ کامیاب حصہ لے سکتے ہیں اور اپنے تعلیم یافتہ ہونے کی شان باقی رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارے عربی مدارس کے طلبہ کا عام طور پر یہ حال نہیں ہے۔ ان پر ایک مایوسی اور افسردگی طاری ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اجنبیت اور بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور خیال کر رہے ہیں کہ وہ جن حالات کے اندر ہیں، ان کے حالات کے مقابلہ کیلئے ان کی تعلیم ان کو مسلح نہیں کر رہی ہے۔ اس چیز کی وجہ سے ان کی ناامیدیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اگر مذہبی تعلیم کے موجودہ طریقہ میں ضروری تبدیلیاں نہ کی گئیں تو اس کے نتائج اب اچھے نہ ہوں گے۔

معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ہمارے ارباب حل وعقد وہ لوگ ہیں جو مذہبی تعلیم سے بالکل محروم ہیں۔ حالانکہ یہ منصب اصلاً علماء کا تھا۔ مگر علماء کی جماعت مختلف وجوہ سے اپنے اس منصب سے محروم ہو کر دوسروں کی پیروی پر مجبور ہو چکی ہے۔ اور ہماری مذہبی تعلیم جس روش پر چل رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اب یہ حالت تبدیل نہ ہوگی۔ علماء آہستہ آہستہ فکر و عمل کے تمام گوشوں سے نکلتے جائیں گے یہاں تک کہ مذہب و مذہبی تعلیم کو لوگ ایک غیر مفید چیز سمجھ کر بالکل چھوڑ دیں گے۔ حالات کی رفتار جو اب تک رہی ہے وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہ تھی لیکن اب نئی تبدیلیاں نہایت خطرناک ہیں۔ اب جو جماعت آگے آگے چلے گی اس کے ہاتھ میں ایک موثر طاقت ہوگی اور یہ طاقت برابر بڑھتی جائے گی پس، اگر ہم نے اپنے تمام امور اس جماعت کے ہاتھ میں دیدیئے تو لامحالہ ہمیں اس بات پر راضی ہونا پڑے گا کہ ہمارے قومی و مذہبی معاملات کو جس رنگ میں یہ جماعت رنگ دے ہم اسی

رنگ کو پسند کریں۔ اور اگر ہم اس بات پر آمادہ نہیں ہیں، تو اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہیے اور اس کی شکل صرف ایک ہی ہے کہ ہم مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام میں ایسی تبدیلی کریں کہ اس سے ایسے علماء تیار ہوں جو ہماری دینی و دنیاوی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی کر سکیں۔

یہ کام ہے نہایت مشکل۔ عربی درسگاہیں اس درجہ کس مپرسی کے عالم میں ہیں کہ کوئی موثر اور اہم تبدیلی کرنا ان کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب اس کام کو کئے بغیر چارہ نہیں۔ یا تو تبدیلی کیجئے، یا علوم دینیہ کی رہی سہی یادگاروں کی آخری سانسیں گننے کے لئے تیار ہو جائیے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں شرکت کرنے سے جو لوگ جھجک رہے ہیں، ان کے خدشات عجیب عجیب ہیں۔ منجملہ بہت سے موانع کے ایک بہت بڑا مانع یہ ہے کہ اس تحریک کے پورے نظام پر ہندو تہذیب و معاشرت کا رنگ غالب ہے۔ اس میں اسلامی تہذیب و تمدن کی شان نہیں ہے۔ ہم کو اس واقعہ سے انکار نہیں ہے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہمارے خیال میں اب تک اس تحریک کا تمام نظام عملاً ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ مسلمانوں نے یا تو اس میں شرکت نہیں کی یا شرکت کی تو اس طرح کہ آندھی کی طرح آئے اور طوفان کی طرح گذر گئے۔ ایسی حالت میں اگر اس کے تمام نظام پر ہندو تہذیب و تمدن اور ہندو رسوم و عوائد کا رنگ غالب ہو تو کیا تعجب ہے۔ فرض کیجئے صورت حالات اس کے برعکس ہوتی۔ یعنی کانگریس کی تاریخ بنا سے آج تک اس کے اصلی کرتا دھرتا مسلمان ہی رہے ہوتے اور ہندوؤں کی شرکت اس میں اسی طرح ہوتی جس طرح آج مسلمانوں کی شرکت ہے تو کیا کانگریس کے پورے نظام کے کسی گوشہ میں وہ ہندو تہذیب و تمدن کا کوئی نقش قائم ہونے دیتے؟ پس ہمارے نزدیک یہ اعتراض بالکل بیجا ہے۔ مسلمانوں کو کانگریس میں جوق جوق شریک ہونا چاہیے، اس کے تمام کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے اور اخلاص، جوش عمل اور جذبہ قربانی

سے اس کے تمام نظام پر حاوی ہو جانا چاہئے اس کے بعد وہ دیکھیں کہ ان کا رنگ کتنا شوخ ہے اور ہر چیز پر کتنی تیزی سے چڑھتا ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔

ہم کو اتفاق اور اختلاف کے اصول بھی طے کر لینے چاہئیں۔ جہاں تک تحریک آزادی کا تعلق ہے ہندوؤں اور دوسری پڑوسی قوموں سے ہمارے اتحاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار اٹھ جائے۔ بس اسی معاملہ میں ہمارا انکا سمجھوتہ ہے۔ اس مقصد کیلئے وہ جو کچھ کریں گے اسمیں ہم انکے ساتھ شرکت عمل کرینگے۔ باقی امور میں وہ اور ہم دونوں آزاد ہیں اور چاہئے کہ جملہ معاملات میں تمام اختلافات رکھنے کے باوجود اس مقصد میں متحد رہیں۔ ہاں اگر وہ کوئی بات اس مقصد کے خلاف کریں تو پھر ہمارا اور انکا اتحاد باقی نہ رہنا چاہئے لیکن اس کے علاوہ دوسرے معاملات میں وہ جو روش بھی اختیار کریں یا ہم جو راہ بھی چلیں اس کا اثر اس مشترک مقصد پر ہرگز نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ ہم اس مقصد میں متحد ہونے کیلئے زندگی اور معیشت کے تمام گوشوں اور مذہب و اعتقاد کے تمام معاملات میں متحد ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور جہاں کہیں فریقین میں سے کسی کی طرف سے کوئی بات دوسرے کے مذہب و معاشرت کے خلاف ہوئی بس پھر تمام رشتوں پر مقراض چل گئی اور باہمی اتحاد ناممکن ہوگیا۔ ہمارے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اس معاملہ پر ایک مرتبہ جم کر غور کر لینا چاہئے۔

عام مذہبی و معاشرتی معاملات کے علاوہ ہم کو اپنی پڑوسی قوموں کی نیت کے متعلق بھی اپنا مسلک متعین رکھنا چاہئے یعنی یہ کہ اگر وہ ہم کو تباہ کر سکیں گی تو یقیناً ہماری پرورش نہیں کریں گی۔ ممکن ہے معاملہ اسکے خلاف ہو لیکن ہم کو اپنے پیش نظر یہی بات رکھنی چاہئے پھر سوچنا چاہئے کہ موجودہ امن بہتر ہے یا وہ بے اطمینانی۔ اور جو بہتر نظر آئے اس کو مضبوط دل سے اختیار کر لینا چاہئے

معارف قرآن

تفسیر سورہ عبس

(۱)

تالیف :۔ استاذ امام علامہ حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ :۔ امین احسن اصلاحی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰى (۱) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (۲) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى (۳)
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (۴) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى (۵) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (۶)
وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى (۷) وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى (۸) وَهُوَ يَخْشٰى (۹) فَاَنْتَ
عَنْهُ تَلَهّٰى (۱۰)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا (۱) اس پر کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا (۲) اور تجھے کیا معلوم، شاید وہ سدھرنا چاہتا ہو (۳) یا دھیان کرنا چاہتا ہو تو اسے یاد دلانا مفید ہوتا (۴) جو بے پروائی کرتا ہے (۵) اس کے تو، تو پیچھے پڑا ہے (۶) حالانکہ تجھ پر کچھ الزام نہیں اگر وہ پاکیزہ بننا نہیں چاہتا (۷) اور جو تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے (۸) ڈرتا ہوا (۹) اس سے تو تغافل کرتا ہے (۱۰)

سورہ کا عمود، موقع اور ماقبل سے تعلق

۱- یہ سورہ منذرات میں سے ہے، یعنی ان سورتوں میں سے جو قوم کے لئے تہدید و وعید کی سرزنش لیکر نازل ہوئی ہیں۔ اور ندائے بعثت و دعوت کی اکثر سورتوں کا یہی حال ہے۔ البتہ ان کے اسلوب بیان مختلف ہوگئے ہیں۔ مثلاً اسی سورہ میں انذار کا پہلو یوں اختیار کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے پیچھے وقت صائع کرنے سے روکا گیا ہے جو انکار اور نافرمانی پر اڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر اسی مضمون سے متعلق آگے چلکر بعض اور باتیں آگئی ہیں۔ مثلاً چند لفظوں میں ان منکرین کی ہٹ دھرمی پر زجر و توبیخ ہے، پھر ان کی ضد اور بے پروائی کی خرابی کے دلائل ہیں، پھر ان کے انجام کار کی تفصیل ہے اور آخر میں مقابلہ کے اصول پر ان لوگوں کا بھی ذکر آگیا ہے جنھوں نے، ان سے الگ ہوکر، ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کی ہے۔ اور اس کے چند فوائد ہیں۔ مثلاً

(۱) توضیح مطلب کے لئے مخالف پہلو کا ذکر مفید ہوتا ہے۔ وبضدھا تتبین الاشیاء

(۲) اس میں ترہیب کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی پیدا ہوگیا ہے جو ایک جامع اور موثر انداز کلام ہے۔

(۳) اس میں آنحضرت صلعم کو اشارہ ہے کہ آپ کی توجہ کے اصلی مستحق مومنین ہیں، انکا حق مقدم ہے۔

سابق سورہ سے اس کا ربط یوں ہے کہ اس کے خاتمہ کی آیت "انما انت منذر من یخشاہا" ہے۔ یعنی تمھاری نصیحتوں کو وہی قبول کر سکتے ہیں جو قیامت سے ڈرتے ہیں۔ پس اس سورہ میں یہ بتادیا کہ تم ان لوگوں سے اصرار و الحاح پر مامور نہیں کئے گئے ہو جو قیامت کے خوف سے بے پروا ہیں۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار دھرایا گیا ہے اور اس کے تکرار کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نہایت رافت و شفقت کی وجہ سے یا فرط جوش تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی اصرار و الحاح کی راہ اختیار کرلیتے تھے یہاں بھی وہی مضمون ہے، اور قرآن مجید نے اپنے عام اصول کے مطابق تعلیم کو موثر ا

دلنشین بنانے کے لئے نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر صلعم کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے منصب کے شایان شان نہیں ہے۔ اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تنبیہ و عتاب کا ہے لیکن درحقیقت ان تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلعم کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے، غصہ و عتاب کا اصلی رخ پیغمبر صلعم کے بجائے منکرین کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ تمام دعوت کا ایک نہایت معروف اسلوب ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہیں۔

سورہ کی یہ تاویل جو بالاجمال، ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ بالکل واضح ہے اور کسی صاحب بصیرت کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی لیکن بعض مفسرین سے اس کی تاویل میں لغزش ہوگئی جس کو ہم آگے بیان کریں گے اور اس کا مقتضی ہے کہ پہلے ہم ایک فصل میں انبیاء کے خلق عظیم پر روشنی ڈالیں اور یہ واضح کر دیں کہ کبھی کبھی جو ان کو عتاب کے اسلوب پر مخاطب کیا جاتا ہے۔ تو اس عتاب کا اصلی پہلو کیا ہوتا ہے۔

انبیاء کا خلق عظیم، ان کی عصمت اور انکے مواقع عتاب

۲۔ عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیشہ فرشتہ رسالت کی اوائیگی کے لئے انہی لوگوں کو چنا جو اس کی مخلوق میں اخلاق و تقوی کے نقطۂ کمال پر تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے "واللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ"۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کن پر ڈالے۔ اور حضرت سرور کائنات کی نسبت فرمایا کہ "وانک لعلی خلق عظیم"۔ بے شک تم ایک خلق عظیم پر ہو۔ اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو ترازو کے ایک پڑے میں رکھا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، سب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپ کا انتخاب بار رسالت کی ذمہ داریوں کے لئے عمل میں آیا۔

اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو اپنے امر و نہی سے مطلع کرتا ہے، اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے ہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کے اشاروں پر چلتے ہیں اور اس کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ "فانک باعیننا" بس بیشک تو ہماری نگاہوں میں ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ — پس وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھ
رَصَدًا لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ — لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور ان کے
رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ — سارے معاملات اس کے احاطہ میں ہیں اور اس نے
كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔ — ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالم غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی ہے۔ ان کو کبھی کسی لغزش میں پڑنے نہیں دیتی۔ قبل اس کے کہ ان کے قدم کسی خطرہ کے مقام پر پہنچیں، خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کے لئے نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اگر کبھی وہ کسی پر خطر راہ میں نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کے لئے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرض نبوت اور منصب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو ادا کریں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور یہ بھی اس لئے کہ ایسا ہونا سنت الٰہیہ اور قانون حکمت کا اقتضا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے آزمایش کا قانون رکھا ہے۔ اور یہی قانون ان کے باطن کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے، وہ فوراً اس کو متنبہ کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ پورے جوش انہماک میں آگے بڑھنا چاہتا ہے، تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ بانداز عتاب اس کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائے اور جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے بے نقاب ہو

ت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھ کر سوچتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے نمودار ہو کر
ی ہوتی تو وہ تو بالکل مزلہ قدم کے قریب پہنچ چکا تھا! یہ چیز اس کے شکر و انابت کے جذبہ
بش پیدا کرتی ہے اور تذلل و خضوع کی تمام نیازمندیوں کے ساتھ وہ اپنے خدا کے سامنے
ور اس سے قریب تر ہو جاتا ہے، بالکل اس طرح جس طرح ماں جب بچے کو ڈرا دیتی ہے
ے سینے سے اور چمٹ جاتا ہے۔

زمن پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا دل جو ہوس کی آلودگیوں
ل ہوتا ہے اس کا جو قدم بھی اٹھتا ہے مرضات الٰہی کی راہ میں اٹھتا ہے۔ البتہ اسی میں کبھی
ط کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حق و اعتدال کی بیچ راہ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے،
پنی قوم کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی اور اقتدا کے لئے ہوتی ہے۔
، کسی فعل میں اگر افراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام امت کی راہ کج ہو جائیگی۔
س افراط کا سبب یہ ہے کہ وہ انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتے ہیں۔ باطن کا علم
تعالیٰ کو ہے۔ اس لئے کبھی کسی شخص کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوتے۔ کوئی شخص انکار
نی ہی سخت و شدید حالت اختیار کرے لیکن وہ ایک غمگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب
ے رہتے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کر دیا جائے کہ فلاں شخص اللہ کا
،، ایمان نہ لائے گا، وہ اس کے ایمان و ہدایت سے مایوس نہیں ہوتے۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ
ہ دیتا ہے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، اس پر ایمان و ہدایت کی راہ باز نہ ہو گی، اس سے
ختیار کر لو، تو اس سے برأت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام
رآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ پس جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا

تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ دشمن ہے وہ اس سے علٰحدہ ہو گیا بیشک
لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ابراہیم بہت ہی درد مند اور بردبار تھا۔

کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور اس کے تمرد کو دیکھکر ان کے ایمان و ہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی کہ اس سے مایوسی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے جینے اور پنپنے کی ایک ہلکی سی اُمید باقی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اس طرح کے واقعات پیش آنے کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر دلوں کے حال سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کو دیکھکر ایک فیصلہ کرتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے معاملات میں فیصلہ کا انحصار باطن کی حالت پر ہے۔ پس اس معاملہ میں صرف علام الغیوب ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ کسی جماعت سے اعراض کا حکم دیدیتا ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا کہ اب یہ جماعت ایمان نہیں لانے کی اور بعض اوقات پیغمبر کو کسی مخصوص جماعت کے ساتھ صبر و ثبات اور مجاہدہ و ریاضت کا حکم دیتا ہے کیونکہ ابھی اس کے اندر امید کی ایک ہلکی سی کرن باقی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پیغمبر کی باگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس کو آگے بڑھاتا ہے، کبھی روک لیتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں کسی خاص اصول حکمت پر مبنی ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نعمت ایسے لوگوں پر پیش کرتا ہے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ہوتے، ایسے مواقع پر اس کو اعراض کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور اس کو فرطِ جوش دعوت پر پُر محبت عتاب ہوتا ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی قوم کی سرکشی و نافرمانی سے اس کو غیرت حق لاحق ہوتی ہے اور وہ ان سے بیزار ہو کر علٰحدہ ہو جانا چاہتا ہے ایسے مواقع پر اس کو پُر عتاب حکم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تبلیغ و دعوت کا جہاد جاری رکھے اور جب تک حکم خداوندی نہ ہو وہ حق کو کتنی ہی بیدردی کے ساتھ ٹھکرائیں لیکن وہ صبر و ضبط کو

ہاتھ سے نہ دے۔ غرض کبھی اس کے کمال رحمت و شفقت پہ عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق کا، اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

۲۔[عبس] منہ بنایا، تیوری چڑھائی، ترش رو ہوا۔ اس کی مزید تشریح تو لی نے کردی۔ تولی یعنی اعراض کیا۔
[اَن جاءہ] اصل میں "لان جاءہ" ہے۔ یہ ترش رو ہونے کا سبب بیان ہوا کہ دراصل ترشروئی کا باعث اس وقت نابینا کا آنا تھا، نہ کہ اس کی ذات۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔
[الاعمٰی] نابینا۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس سے مراد یہاں ابن ام مکتومؓ ہیں۔ انکا نام بھی لیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے سے ایک طرف تو ان کے ضعف و احتیاج کی حالت ظاہر ہوگئی، دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلعم کی اس وقت کی مشغولیت سے بالکل لاعلم تھے۔ پس مقتضائے حال کی بے شمار بلاغتیں اس لفظ کے اندر پنہاں ہیں۔
[وما یدریک لعلہ یزکی] ما یدریک کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اس کا قائم مقام "لعلہ یزکی" ہے۔ یہ حسب قاعدہ مقابلہ مفعول محذوف کا خود پتہ دے رہا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:-
"وما یدریک لعل الساعۃ قریب" یعنی تمھیں کیا خبر کہ قیامت بہت دور ہے۔ شاید وہ قریب آگئی ہو۔ دیکھو لعل الساعۃ قریب کے ٹکڑے نے اصل مفعول کی طرف خود انگلی اٹھادی کیونکہ جملہ کی نوعیت مقتضی ہے کہ اس کا ایک مقابل یہاں محذوف مانا جائے۔ پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ تمھیں کیا معلوم کہ اسکا آنا سد راہ اور وعیان کے لئے نہیں ہے کہ تم کفار کے طعنہ کی شرم میں پڑ گئے کہ وہ کہیں گے "محمدؐ کے پیرو اندھے اور عاجز لوگ ہیں، جو بے توفی اور طمع کی وجہ سے ان کی باتوں میں آگئے ہیں، پس ہم انکی پیروی کرکے ایسوں کی رفاقت کا ننگ کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلعم کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ابن ام مکتوم اسوقت تعلیم و تزکیہ کا کوئی مقصد لے کر آئے ہیں۔ آپ کو جو چیز ناگوار ہوئی وہ محض ان کا اسوقت کا آنا تھا اور اسکا باعث وہی خیال تھا جو اوپر بیان ہوا۔ باقی رہی یہ بات کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم قرآن کی درخواست کی اور آپنے اعراض فرمایا تو یہ بات از روئے روایت بھی ثابت نہیں۔ اور از روئے قرآن اسکے ضعف کا جو حال ہے وہ نمایاں ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

[یزکی] سدھرنا چاہتا ہو ——— یعنی آنحضرت صلعم کی صحبت اور آپ کی دعا کی برکت سے۔

[یذکر] دھیان کرنا چاہتا ہو ——— یعنی قرآن سے اور پیغمبر کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔

[استغنیٰ] بے پروا ہوا ——— یعنی تزکیہ و تذکرہ اور انابت و خشیت سے۔ ان چیزوں کا ذکر اس لئے حذف کر دیا کہ ماقبل و مابعد کا تقابل اس پر دال تھا۔

[تصدی] دراصل تتصدد تھا۔ یہ صدد سے ہے جس کے معنی متوازی اور متقابل کے ہیں۔ عام بول چال میں کہتے ہیں۔ داری بصدد دارہ۔ پس تصدی کے معنی ہوئے تعرض کرنیکے۔ یہ تولی کا ضد ہوا۔

[وما علیک الا یزکی] یعنی اگر وہ سدھرنا نہ چاہے تو اس کا بار الزام تم پر نہیں۔

[یسعیٰ] وہ دوڑ کر آتا ہے ——— لیکن اس دوڑ کر آنے سے وہ دوڑنا مراد نہیں ہے جو پاؤں سے ہوتا ہے دل کے بیتابانہ شوق کے لئے ایک پرکنایہ طریقہ تعبیر ہے۔ موقع کلام اس پر دال ہے۔ نیز یخشیٰ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

[یخشیٰ] ڈرتا ہے ——— بظاہر ایک جامع اور مطلق لفظ ہے لیکن خوف قیامت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سابق سورہ میں بالکل واضح کر دیا ہے۔ انما انت منذر من یخشاہا۔ تم تو بس انہی کو ڈرانیوالے ہو جو قیامت سے خوف کھاتے ہیں۔

[تلہیٰ] دراصل تتلہی ہے۔ ——— تلہی عنہ کے معنی ہیں اس سے غافل ہو گیا۔ الہانی عنہ ذلک۔

معنی ہوئے۔ مجھے فلاں چیز نے اس سے پھیر دیا اور میں اس کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ عقبہ بن بجیر کا شعر ہے۔

طاف لمام الضیف والبیت بیتہ ولم یلھنی عنہ غزال مقنع

میرے دروازہ پر اگر کوئی مہمان اتر پڑتا ہے تو میرا اوڑھنا بچھونا مہمان کا اوڑھنا بچھونا اور میرا گھر مہمان کا گھر بن جاتا ہے اور کوئی برقعہ پوش ہرنی مجھے اس سے غافل نہیں کرتی۔

ان آیات کا موقع نزول اور واقعہ کی اصلی تصویر

۲۔ یہ آیتیں اس موقع پر نازل ہوئی ہیں جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آنحضرتؐ منکرین کے پیچھے وقت نہ ضائع کریں اور اپنی تمام توجہ اور سرگرمی کا مرکز مسلمانوں کو بنائیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابتدا میں آنحضرت صلعم کو یہ حکم ہوا تھا کہ آپ سب سے پہلے اپنی قوم کے ان سرداروں کو دین حق کی دعوت دیں جو قوم میں دینی پیشوائی کے منصب پر متمکن ہیں۔ اور ساتھ ہی آپ کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ اگر یہ لوگ اعراض کریں اور کفر و انکار پر جم جائیں تو بالآخر آپ ان کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے ساتھ مشغول ہو جائیں اور اپنا سارا وقت انہی کی تعلیم و تربیت پر صرف فرمائیں۔ بعض ابتدائی آیات میں اس معاملہ کے تمام مراحل کی پوری تفصیل کر دی گئی تھی۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝	اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے ان پر
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ	شفقت کرو، پس اگر تمہارے رشتہ دار تمہاری
فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَ	بات نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ میں تمہارے فعل سے بری
تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ	ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو۔ جو تم کو دیکھتا
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ	ہے جب تم اٹھتے ہو اور دیکھتا ہے، نماز یوں

فِي السّٰجِدِيْنَ تمہاری آمد و شد کو۔

اس ہدایت کے بموجب آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں مشغول ہوئے۔ لیکن قوم کی طرف سے آپ کی دعوت کا جواب تکبر اور گھمنڈ کے انکار کے ساتھ دیا گیا۔ تاہم آپ بد دل نہ ہوئے، محبت کے جوش اور دعوت حق کی سرگرمی میں، اعراض و انکار کی ان تمام سختیوں کو جھیلتے رہے۔ آپ کو توقع تھی کہ یہ بیگانگی عارضی ہے۔ جلد وہ وقت آجائے گا کہ یہ لوگ آپ کی نصیحتیں قبول کرلیں گے۔ چنانچہ عناد و مخالفت کے ہیجان میں وہ لوگ جتنے ہی آپ سے دور ہٹتے جاتے آپ محبت و رافت کے جوش میں اسی قدر ان سے قریب ہوتے جاتے۔ اور اس کے چند اسباب تھے۔

اولاً محبت و شفقت کا وہ بے پایاں جذبہ جو رحمۃ للعالمین کے ساتھ مخصوص تھا، اور جس نے آپ کی نگاہوں میں دشمنوں کو عزیزوں سے زیادہ محبوب بنا دیا تھا۔

ثانیاً رسالت عظمیٰ کے فرائض کی ذمہ داریوں کا احساس۔

ثالثاً یہ خیال کہ طاقتوروں اور دولتمندوں کا ایمان دین حق کی تائید و تقویت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے سابقون الاولون کے ذریعہ آپکے اس خیال کی تصدیق فرمادی۔

رابعاً یہ اندیشہ کہ مبادا ادائے فرض کی راہ میں جو صبر و جہاد مطلوب ہے، اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہو جائے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھیں۔ رافت و رحمت کے بے پایاں جذبہ اور ادائے فرض کے حقیقی جوش کا تقاضا یہی تھا کہ آنحضرت صلعم ایسا ہی کریں لیکن اس معاملہ کے بعض پہلو ایسے تھے جو مقام نبوت کے شایان شان نہ تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ اولاً تو اس سے ان لوگوں کے حقوق سے تھوڑی سی بے پرواہی ہو جاتی جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق تھے یعنی مومنین خاصہ

ثانیاً اس سے نبوت کے اس وقار کو ٹھیس لگتی جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف سربلندی اور برتری ہی پسند کی ہے۔ پستی اور جھکاؤ کبھی نہیں چاہا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں آپ کو متعدد مقامات میں صرف مومنین صالحین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ منکرین کے پیچھے وقت ضائع کرنے۔ اور ان پر غم کھانے سے روکا گیا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ	پس شاید تم ان لوگوں کے پیچھے مارے غم کے اپنی
اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (کہف ۶)	جان ہلاک کر ڈالو گے اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں گے۔
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	اور (اے پیغمبر) اپنے آپ کو ثابت قدم رکھو ان لوگوں
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ	کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں
وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ	اس کی رضا طلبی میں اور دنیاوی زندگی کی زینت
تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا	کی کھوج میں تمھاری نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں
تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا	اور تم ان لوگوں کی بات پر کان نہ دھرو جن کے
وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا	دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیئے ہیں اور جنھوں
وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ	نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے اور جن کا معاملہ حد سے
فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ	بڑھ گیا ہے کہدو کہ حق تمھارے پروردگار کی جانب ہے
(۲۸ - ۲۹ کہف)	پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے
فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (الذاریات ۵۴)	پس تم ان سے اعراض کرو، تم کو کوئی ملامت نہیں ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ جب کبھی ایسا ہوا کہ جوش تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے انہماک و سرگرمی کی وہ حالت اختیار کر لی جو حد اعتدال سے کچھ متجاوز ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک کر صحیح جادۂ اعتدال پر کھڑا کر دیا۔ انہی حالات کے اندر اتفاق سے یہ ابن ام مکتومؓ والا واقعہ پیش آ گیا۔ وحی الٰہی تعلیم و تربیت کیلئے

مناسب حال واقعات کی منتظر ہی رہتی تھی۔ پس یہ واقعہ ایک ایسی سورہ کے نزول کا باعث بن گیا جو اغنیار کی زجر و توبیخ، غریبوں کی مدح و ستائش اور دل شکستوں کی دلداری و ہمدردی پر ایک بلیغ ترین خطبہ اور جامع ترین موعظت ہے۔ اور آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی جو اصرار و الحاح کی شکل اختیار کر لیتے تھے، اس میں ان کو بھی نہایت واضح لفظوں میں تنبیہ ہو گئی کہ آپ منکرین کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ صرف مومنین کی اصلاح و تربیت میں لگیں جو آپ کی شفقتوں کے اصلی مستحق ہیں۔

واقعہ کی اصلی صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس سادات قریش بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ان کو تبلیغ و دعوت فرما رہے تھے۔ اسی بیچ میں ابن ام مکتومؓ آ گئے۔ آنحضرت صلعم کو اندیشہ ہوا کہ اب یہ بدک جائیں گے۔ اور کہیں گے کہ تم نے چند اندھوں اور غریبوں کو طمع دلا کر اور بیوقوف بنا کر پھنسا رکھا ہے اور اب ہمارے لئے دام بچھاتے ہو، تو ہم تو اس وقت تک تمہارے پیرو نہیں ہونے کے جب تک تم ان کو اپنی پیروی سے خارج نہ کر دو۔ ہم اشراف ہو کر ان اراذل کی سطح پر نہیں اتر سکتے۔

آنحضرت صلعم کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ سادات قریش اس خیال کو بار بار ظاہر کر چکے تھے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ	جواب دیتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح
(بقرہ ۲۔ ۱۳)	یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں۔

دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ	اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو ہوشیار کر دو جو
يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ	ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے
مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ	اور اس وقت خدا کے سوا نہ ان کا کوئی دوست
يَتَّقُوْنَ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	ہوگا اور نہ سفارشی۔ تاکہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں

رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ	اور نہ دھتکارو ان لوگوں کو جو صبح وشام اپنے
وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ	رب کو پکارتے ہیں اسکی رضا جوئی میں۔ تم پر انکی
مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ	جواب دہی کچھ نہیں ہے اور نہ تمھاری جواب دہی
مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ	کچھ ان پر ہے کہ تم ان کو دھتکار کر ظالموں میں
الظّٰلِمِيْنَ ۔ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ	بن جاؤ۔ اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض سے
بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ	آزمایا ہے تاکہ وہ کہیں، کیا یہی لوگ ہیں جن پر
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ	اللہ نے ہم میں سے فضل کیا ہے؟ کیا اللہ شکرگزار
اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۔ وَاِذَا	بندوں کو نہیں جانتا۔ اور جب تمھارے پاس آئیں
جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا	وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں - ہماری آیتوں پر
فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ	تو کہو تم پر سلامتی ہو۔ تمھارے پروردگار نے اپنے
عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۔ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ	اوپر رحمت واجب کرلی ہے کہ جو کوئی تم میں سے
مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ	براہ ناواقفی کوئی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	کرے اور اپنی حالت کی اصلاح کرے تو بے شک
(۵۱ - ۵۴ الانعام)	وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ	پس تم کو جس بات کا حکم ملا ہے، کھول کر سنا دو
الْمُشْرِكِيْنَ ۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ	اور مشرکوں سے منہ پھیر لو۔ اور مذاق اڑانیوالوں
الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا	کے لئے، جو اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں ہم تمھاری
اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۔ وَلَقَدْ	طرف سے بس ہیں۔ پس عنقریب ان کو معلوم ہوجائیگا
نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ	اور ہم کو معلوم ہے کہ تم ان کی باتوں سے

بِمَا يَقُوْلُوْنَ (۹۷-۹۹ : حجر) دل تنگ ہوتے ہو۔

آنحضرت صلعم اپنی رافت و رحمت کی وجہ سے تمام غربا، و مساکین کے ملجا و ماویٰ تھے، اور بوجہ شدت غیرت یہ کبھی نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ آپکے ان صحابہؓ کی توہین ہو جن کو کسی طمع دنیا وی نے نہیں محض طلب رضائے حق نے آپکے ارد گرد اکٹھا کر دیا ہے۔ پس اس موقع پر عبداللہ بن ام مکتوم کے آجانے سے آپ کو اصلی اندیشہ یہی ہوا کہ یہ اشقیا، ان کی پھٹی حالت کو دیکھکر صحابہؓ پر زبان طعن دراز کرنیکا ایک بہانہ بنالیں گے اور ان کی توہین کریں گے۔ پس آپنے جو کچھ کیا غیرت حق اور مصالح تبلیغ و دعوت کے تقاضہ سے کیا لیکن اسی سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ آنحضرت جوش تبلیغ و دعوت میں اپنے حدود سے کسی قدر آگے نکل گئے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آپ کو متنبہ کر دیا کہ آپنے اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھالی ہے۔ اور کلام کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے بظاہر عتاب مترشح ہوتا ہے، لیکن عتاب کا اصلی رخ کفار و منکرین کی طرف ہے۔ آنحضرت صلعم کی طرف نہیں ہے۔ آپ کی تو اس میں تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی آپکے صحابہ کی بھی دلداری کی گئی ہے۔

معاملہ کی اصلی نوعیت کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو کہ ایک نہایت مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے، اسکے گلہ کی کوئی فربہ بھیڑ گلہ سے الگ ہو کر کھو جائے، چرواہا اسکی تلاش میں نکلے۔ ہر قدم پر اسکی کھر کے نشانات اسکو ملتے جارہے ہیں: بن کے کسی گوشہ سے اسکی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور اسطرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصلی گلہ سے تھوڑی دیر کیلئے غافل ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آتا ہے۔ آقا اسکو ملامت کرتا ہے کہ "تم پورے گلہ کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہو، اسکو چھوڑ دیتے بھیڑیا کھا جاتا، وہ اسی کی مستحق تھی"۔ بتاؤ! اس میں عتاب کس پر ہوا چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ بظاہر کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ چرواہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلداری ہوئی۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا رُخ سخن بظاہر آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن خفگی کا تمام زور منکرین و معاندین پر پڑتا ہے۔ آنحضرت صلعم کے لئے تو اس عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جاں نوازادائیں پنہاں ہیں۔

تعجب ہے کہ سورہ کا یہ مفہوم نہایت واضح ہونیکے باوجود بعض مفسرین سے مخفی رہگیا اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے ہم آگے کی فصلوں میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق (باقی)

تدبر قرآن

۳

امین احسن اصلاحی

تقویٰ اور عمل قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے ایک نہایت اہم اور ضروری شرط تقویٰ اور عمل ہے۔

بقرہ کی پہلی ہی آیت میں فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ — یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ متقین کیلئے ہدایت بنکر نازل ہوئی ہے۔

سورہ لقمان میں فرمایا۔

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ — یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں، ہدایت و رحمت بنکر نازل ہوئی ہے محسنین کے لئے۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بے شمار ہیں اور ایک طالب العلم کو ہر جگہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ قرآن مجید کی ہدایت متقین و محسنین ہی کے لئے کیوں مخصوص ہوئی؟ جو شخص بھی اس کو پڑھے، چاہئے کہ قرآن اس کی ہدایت کرے، عام اس سے کہ وہ متقی ہو یا غیر متقی، شقی ہو یا سعید، محسن ہو یا غیر محسن، لیکن قرآن مجید کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس کا دروازہ صرف انہی لوگوں کے لئے کھلے گا جو تقویٰ اور احسان کی صفتوں سے متصف ہوں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ بات ہمارے مفسرین کو بھی کھٹکی ہے۔ اور انھوں نے اس کو حل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن معاملہ کا ایک خاص پہلو ہے جس کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی اور اصل حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کے لئے اس کو ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ پس آج کی صحبت میں،

ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر غور کریں۔

قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلم ہے، کہ وہ انسان کے روحانی ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی درجہ بدرجہ فرمائی ہے۔ ہدایت کا پہلا درجہ ہدایت فطرت ہے جس کا ذکر الذی قدر فهدی اور فالهمها فجورها وتقوٰها وغیرہ مختلف آیات میں فرمایا ہے۔ یہ آنکھ کان، دماغ اور دل کی رہنمائی اور وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کی ہدایت ہے۔ یہ فطرت کی وہ عام بخشش ہے جس میں تمام بنی آدم یکساں شریک ہیں، بلکہ اس کے ایک حصہ کا فیضان تو اسقدر عام ہے کہ حیوانات تک اس سے محروم نہیں۔ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ مرغی کے بچے دانہ چگتے ہیں۔ بط کے بچے انڈے سے نکلتے ہی پانی میں تیرنے لگتے ہیں۔ بلی کے بچے، ابھی آنکھیں نہیں کھلی ہیں، لیکن جانتے ہیں۔ ان کی غذا کا سرچشمہ اور پرورش کا سامان کہاں ہے۔ انسان اس مرحلہ میں حیوانات کے بالکل ساتھ ساتھ ہے۔ لیکن اس کو شرف امتیاز کا ایک خاص درجہ بھی حاصل ہوا۔ یعنی وہ وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کے شرف سے ممیز ہے۔ پس اس کی فطری رہنمائی صرف اسی قدر نہیں ہے کہ وہ کھالے، پی لے اور سو رہے۔ بلکہ ان کی مدد سے وہ اپنے کاموں میں ایک نظم و ترتیب رکھتا ہے۔ جزئیات سے کلیات بناتا ہے، برے اور بھلے میں امتیاز کرتا ہے اور اختیار و ارادہ کی پوری خودداری اور قوت فیصلہ کے ساتھ شر کو چھوڑتا اور خیر کو اختیار کرتا ہے۔

اس مرحلہ کے بعد ہدایت و رہنمائی کا دوسرا درجہ ہے جو انبیاء و رسل کی بعثت سے ظہور میں آیا۔ اس مرحلہ میں انسان کو جو کچھ ملا وہ تمام تر انہی کلیات و مبادی پر مبنی تھا جن سے وہ ہدایت کے پہلے درجہ میں سرفراز ہوا تھا۔ جس طرح بیج کے چند دانوں سے تم ایک پورا لہلہاتا ہوا چمن تیار کرلیتے ہو یا چند گٹھلیوں کو بو کر ایک پورا سرسبز و شاداب باغ اگا لیتے ہو اسی طرح کشت فطرت کے چند دانوں کو باران رحمت کی پرورش، باغبان فطرت کی رکھوالی اور انبیاء و رسل کی سعی و کاوش نے

ایک چمن بنا دیا اور اس کا نام شریعت ہوا۔

لیکن فطرت کے اس عام دستور کے مطابق، جو اس کے تمام کاروبار کی خصوصیت ہے۔ یہ کام بتدریج عمل میں آیا، ایک ہی مرتبہ میں انجام نہیں پا گیا۔ پہلے انبیاء آئے جنہوں نے فطرت کی موٹی موٹی صداقتوں کو ابھارا، ان کے گرد و غبار کو صاف کیا اور ان کی زمینوں کو ہموار کیا۔ پھر دوسرے آئے جنھوں نے اس زمین پر ایک داغ بیل ڈالی۔ پھر اور لوگ آئے جنھوں نے اس داغ بیل پر بنیادیں استوار کیں، پھر اور آئے جنھوں نے ان پر دیواریں بلند کیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا جنھوں نے اس عمارت کو مسقف کیا۔ یہاں تک کہ عمارت تیار ہو گئی لیکن کونے میں ایک آخری اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی اور وقت آگیا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا تھا، وہ کونے کا آخری پتھر بنے چنانچہ وہ اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

اس عمارت کا نام اسلام ہوا اور اس کا جامع اور مکمل نقشہ ہمارے ہاتھوں میں قرآن مجید ہے۔

یہ قرآن مجید جب اول اول دنیا کے سامنے آیا تو چند جماعتیں اس کے سامنے تھیں۔

عرب۔ جن میں بیشتر مشرک تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو دین ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم تھے۔

یہود۔ جو اپنی پیہم شرارتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے بالکل مسخ ہو چکے تھے۔ صرف ایک چھوٹی سی جماعت ارباب حق و عدل کی ان میں باقی رہ گئی تھی۔

نصاریٰ۔ ان کو بھی ان کے اگلوں کی کجرویوں نے گمراہ کر دیا تھا۔ صرف تھوڑے لوگ رہ گئے تھے جو صحیح دین مسیحی پر قائم تھے۔

ان تینوں جماعتوں میں سے قرآن مجید نے سب سے پہلے عربوں کو مخاطب کیا۔ گو ان کی عام اخلاقی زندگی بعض فطری فضائل و محاسن سے خالی نہ تھی لیکن یہ اپنے پیچھے شرک و بت پرستی کی ایک طویل تاریخ رکھتے تھے جس میں ان کی طبیعت اور دماغ کا سانچہ اسقدر بدل چکا تھا کہ قرآن مجید کی تعلیمات جو سرتاسر فطری سادگی

کے حسن و جمال سے آراستہ تھیں، ان میں بڑی مشکل سے سما سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کا بڑا طبقہ عرصہ تک آپ کی تعلیمات سے نہ صرف بیگانہ رہا بلکہ اس کے مٹانے کے لئے پوری طرح سرگرم عمل۔ البتہ ان لوگوں کو قرآن مجید کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی جو دین ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم اور شرک و بت پرستی سے پہلے ہی سے نفور تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی دعوت سنی تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا اپنے ہی دل کی آواز سن رہے ہیں پس وہ فوراً اس کی طرف لپکے اور اس کو قبول کر لیا۔ ان کو نہ تو معجزات کی ضرورت پیش آئی، نہ اصرار و الحاح کی، یہ پیاسے تھے، پس جوں ہی پانی کی صدا سنی اسکی طرف دوڑ پڑے۔ بحث و مناظرہ کے طلبگار نہ ہوئے۔ ہدایت فطرت کی روشنی ان کے اندر زندہ تھی۔ اور جنکی آنکھیں کھلی ہوں انکو روشنی سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہوتی۔ پس جس طرح آئینہ روشنی میں چمک جاتا ہے، یہ بھی روشنی پاکر چمک اٹھے۔ قرآن مجید نے سورہ نور میں اس کو یوں بیان فرمایا کہ فطرت اور وحی دونوں ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ یہ دونوں بندے کو ایک ہی سرچشمہ سے ملتی ہیں۔ صحیح فطرت کی مثال صاف و شفاف روغن کی ہے جو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے بالکل پاک ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے بھڑک جانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ پس جو نہی وحی و الہام کی روشنی اس سے مس ہوتی ہے فوراً بھڑک اٹھتا ہے۔ یکاد زیتها یضیئ ولو لم تمسسه نار، نور علی نور، یھدی اللہ لنورہ من یشاء۔

مضمون کے صدر میں ہم نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں محسنین سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔ احسان کے معنی ایک تو وہی ہیں جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔ دوسرا ایک اور مفہوم بھی ہے جو لفظ کی معنوی روح سے بہت اقرب ہے اور قرآن مجید نے اسی مفہوم میں ایک سے زائد مقامات میں اس کو استعمال کیا ہے۔ یعنی اپنے قول و فعل کو اخلاص و صداقت کی پوری بیداری اور ہمت و عزیمت پوری استواری کے ساتھ انجام دینا اہل لغت نے لفظ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ احادیث بھی احسان کی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اور قرآن مجید نے اسی مفہوم کے اعتبار سے اہل مکہ یا

کی ان جماعتوں پر اس کا اطلاق فرمایا جنھوں نے فطرت کی روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اس کو گل ہونے نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ تعریف فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے، ان کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا، قرآن مجید ان کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔ یہ اس کو سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

باقی رہی دوسری جماعت جس نے اپنی فطری صلاحیتیں بالکل برباد کر دی تھیں، تو اس کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات بالکل انوکھی تھیں۔ وہ کسی طرح بھی ان کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ یہ تعلیمات جن فطری اصولوں پر مبنی تھیں وہ تمام اصول ان کے اندر مٹ چکے تھے۔ اور ان کی جگہ بالکل ہی غیر فطری معتقدات و مظنونات نے لے لی تھی۔ پس ان کی فطرت کا قالب اس درجہ ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ کوئی سیدھی چیز اس میں نہیں سما سکتی تھی۔ چنانچہ جب آنحضرت صلعم نے ان کے سامنے قرآن مجید پیش کیا تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور اس کے سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا۔ اور ان کا یہ انکار درحقیقت ان کے بہت سے سابق انکاروں کا لازمی نتیجہ تھا۔ انھوں نے ہدایت کے ابتدائی مراحل میں اسکو قبول کرنے سے اعراض کیا اس لئے بعد کے مرحلوں میں بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور ایسا ہونا قدرتی تھا۔ ایک طالب علم درجہ بدرجہ علم کی راہوں میں بڑھتا ہے۔ پس جس نے ایک فن کے ابتدائی قواعد خوب نہ سمجھ لئے ہوں اور ان کی مہارت نہ کرلی ہو وہ ہرگز اس فن کے انتہائی مباحث نہیں سمجھ سکتا۔ یہی حال ان کا ہوا۔ انھوں نے رشد و ہدایت کی ابجد نہیں سیکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہدایت کا آخری صحیفہ نازل ہوا تو وہ اس کے سمجھنے سے بالکل قاصر رہے۔ قرآن مجید نے سورہ اعراف میں اس معاملہ کی پوری تشریح کر دی ہے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ	یہ بستیاں ہیں جن کے واقعات ہم تم کو سناتے
أَنبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم	ہیں، بے شک آئے ان کے پاس انکے رسول

بِالۡبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا کھلی کھلی نشانیاں لیکر لیکن وہ ایمان لانیوالے
بِمَا کَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ کَذٰلِکَ نہیں ہوئے ، بوجہ اس کے کہ انھوں نے پہلے تکذیب
یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِ الۡکٰفِرِیۡنَ (اعراف) کی ۔ ایسی ہی اللہ مہر کردیتا ہے کافروں کے دلوں پر

یعنی ان لوگوں کا یہ تازہ انکار بہت سے سابق انکاروں کا ثمرہ ہے ۔ سابق انبیاء نے ان کو جو سبق پڑھائے انھوں نے ان سب سے اعراض کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ سبق بھی انکی سمجھ میں نہیں آرہا ہے ۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن مجید اپنی اصطلاح میں ختم قلوب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ۔ یعنی جو شخص خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو درجہ بدرجہ تمام مراحل میں قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے، بالآخر اسکا قلب سخت ہوجاتا ہے اور وہ اپنی فہم و بصیرت کی تمام استعدادیں کھو بیٹھتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ خدا کی شریعت عمل کے لئے نازل ہوتی ہے ۔ اس لئے اس میں علم اور عمل یا "جاننا" اور "کرنا" دو چیزیں نہیں ہیں ۔ اس میں جاننا بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو کرنا کہتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص جانتا ہو اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ جاننا یہاں معتبر نہیں ۔ ایسا جاننا بے سود ہے ۔ اسکی حقیقت اور جہل کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ یہ علم بالکل غیر مثمر ہے ۔ اس سے مزید علم و عمل کے دروازے نہیں کھلتے ۔ ہم نے محض اپنی غلط فہمی یا کوتاہی تعبیر کی وجہ سے جہل کا نام علم رکھ لیا ہے ۔

یہود کے معاملہ میں بھی بالکل یہی صورت حالات پیش آئی ۔ یہود کی اکثریت جس نے اپنے تمام انبیاء کی تعلیمات جھٹلا دی تھی ، قرآن مجید کا بھی انکار کردیا ، حالانکہ قرآن مجید سے سب سے زیادہ اقرب وہی تھے ۔ قرآن مجید ہدایت کا آخری زینہ ہے اور وہ اس زینہ سے صرف ایک ہی درجہ نیچے تھے ۔ ان کا فرض تھا کہ وہ اس کو سب سے پہلے قبول کرتے اور نبی امی (فدیتہ بابی و امی) کے ساتھ ہو کر تمام دنیا میں اس کے حق ہونے کی گواہی دیتے لیکن انھوں نے سب سے پہلے انکار کیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید سے پہلے جو ہدایتیں نازل ہوئی تھیں وہ ان سب کا انکار کر چکے تھے ۔ اور سنت الٰہی کے لحاظ سے قرآن مجید کو قبول کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ پچھلی تمام ہدایتوں کو قبول

کر چکے ہوں۔ اصولی طور پر یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بالکل ابتدا ہی میں فرمادی گئی تھی۔ اللہ تعالٰے نے ان کو چند امتحانوں میں جانچا اور جب وہ ان میں پورے اترے فرمایا انی جاعلک للناس اماما۔ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انھوں نے سوال کیا۔ ومن ذریتی۔ اور میری ذریت میں سے یارب! جواب ملا لاینال عہدی الظلمین میرا یہ عہد ظالموں سے تعلق نہیں ہے۔ یعنی میرا یہ عہد صرف ان کے متعلق ہے جو برابر خدا کی ہدایت پر قائم رہیں، اس کو ہر مرحلہ میں قبول کریں، اور شرک وبت پرستی سے بچتے رہیں۔ یہی لوگ خدا کی ہدایت سے برابر سرفراز ہونگے۔ اور قوموں کی امامت پائیں گے۔

یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں دہرائی گئی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لئے دعا فرمائی۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً	لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور
وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ	آخرت میں بھلائی ہم تیری طرف رجوع ہوئے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

عَذَابِیْ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاءُ	میرا عذاب تو میں جس پر چاہتا ہوں (یعنی جو اس کا
وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا	مستحق ہوتا ہے) اس کو نازل کرتا ہوں، اور میری رحمت
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ	ہر چیز کو عام ہے پس میں اسکو لکھ رکھوں گا ان لوگوں

"تقوی پر قائم رہیں گے" یعنی وہ لوگ جو اس عہد پر جو آج ان سے باندھا جا رہا ہے، قائم رہینگے اور اس کی حرمت کو بٹہ نہیں لگائیں گے۔ وہی لوگ آیندہ خدا کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔ یعنی جب خدا کی آخری شریعت جو اس دنیا پر خدا کی آخری اور سب سے بڑی رحمت ہوگی، آئے گی، وہ اس کو قبول کریں گے۔ اس کا انکار نہیں کریں گے اور جو اس عہد پر قائم نہ رہیں گے وہ آیندہ رحمت سے

بھی محروم رہیں گے۔ کیونکہ ان کے دل سخت ہو جائیں گے اور ان کے کفران نعمت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ ان کے دلوں پر مہر کردے گا - چنانچہ جب قرآن مجید نازل ہوا اور اس کی وہ سورۃ اتری جو سرتا سر یہود کو مخاطب کر رہی ہے۔ یعنی سورہ بقرہ تو اس کی پہلی ہی آیت میں فرمایا کہ، "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت بنکر نازل ہوئی ہے۔ اس کو صرف وہی قبول کریں گے جو متقی ہیں۔ جنھوں نے اپنے عہد و پیمان کو قائم رکھا ہے، جنھوں نے خدا کی نعمت کی قدر کی ہے، جنھوں نے اپنے انبیاء کی تعلیمات کو یاد رکھا ہے۔ باقی جنھوں نے ان تمام چیزوں کا انکار کر دیا ہے، وہ اس قرآن کا بھی انکار کردیں گے۔ کیونکہ ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ	بے شک جنھوں نے کفر کیا، برابر ہے ان کے لئے،
ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ	ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالےٰ نے
لَا یُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی	ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور
قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ وَعَلٰی	ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے دردناک
اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَہُمْ عَذَابٌ	عذاب ہے ....
عَظِیْمٌ (بقرہ)	....

جو خدا سے عہد باندھ کر توڑ چکے ہیں، جو خدا کے قایم کئے ہوئے رشتہ پر مقراض چلاتے ہیں۔ جو زمین میں خدا کے قانون حق وعدل کے دشمن ہیں۔ وہ ہرگز قرآن کی ہدایت نہیں قبول کریں گے۔ وہ تو اس سے بجائے ہدایت پانے کے اپنی گمراہی اور شرارت میں اور بڑھ جائیں گے اور ان کی شقاوت و بدبختی پر آخری مہر لگ جائے گی۔

یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَہْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا	اس کے ذریعہ اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور
وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ	بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور نہیں گمراہ کرتا مگر

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ
بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ
اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (بقرہ)

اور یہ گمراہ لوگوں کو جو نافرمان ہیں جو اللہ کے عہد کو
پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے
جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور
زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، وہی لوگ نامراد ہیں

اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے۔ خدا کی ہدایت ایک نعمت ہے اور نعمت اسی شخص کو دیجاتی ہے جو اس کی قدر کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ جو شخص نعمت کی ناقدری کرتا ہے وہ ہرگز مزید نعمت پانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہدایت کے باب میں یہ قانون ہمیشہ بالکل اٹل ہے، جنھوں نے نعمتوں کو قبول کیا وہ نعمتوں میں بڑھتے گئے اور جنھوں نے ان کی ناقدری کی وہ ان سے محروم ہو گئے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ
لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ
اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (۷- ابراہیم)

اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے تم کو
جتا دیا تھا کہ اگر تم شکر کروگے تو میں تمہارے لئے اپنی
نعمت زیادہ کروں گا۔ اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب
(بڑا سخت ہے)

پس چونکہ بنی اسرائیل نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کی قدر نہیں کی تھی اس لئے وہ قرآن کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے مستحق نہیں ٹھہرے۔ اور جیسا کہ فرمایا گیا تھا "جو ایک پیسہ میں چور ہے اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جائے گی"۔ قرآن کی عظیم الشان امانت سے وہ محروم ہے۔ ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا جب اس میں وہ راستباز اور امین نہیں ثابت ہوئے تو خدا ان کو اپنی پوری کتاب کیسے سونپ دیتا!

پس یہود کا بڑا حصہ جو توراۃ و انجیل کی تعلیمات کو چھوڑ کر شہوات نفس اور رغبات دنیا کا

شکار ہو چکا تھا، قرآن کے فیض سے بالکل محروم رہا، صرف ایک مختصر سی جماعت ان میں اہل حق کی باقی رہ گئی تھی۔ یہ لوگ قرآن مجید کی آمد کے منتظر تھے اور جونہی اس کی صدا ان کے کانوں میں پڑی انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں یہود کی عام بدبختی کا ذکر کیا ہے وہاں اس چھوٹی سی جماعت کی حق پسندی کی تعریف بھی فرمائی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ ان کی جماعت کا بڑا حصہ جو اپنے اگلوں کی تقلید و پیروی میں گمراہ ہو کر دین کی اصلی تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا۔ اس نے قرآن کو نہیں سمجھا۔ قرآن کی تعلیمات اس کو اپنے معتقدات و مزعومات کے بالکل مخالف نظر آئیں۔ مگر جن میں صحیح تعلیم کی روشنی موجود تھی اور حضرت مسیحؑ کے اشارات کی رہنمائی میں اس کے لئے متجسس تھے انھوں نے جب قرآن کو پایا تو پورے جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ قرآن مجید نے ان کے اس جوش کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی	اور جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو اتاری گئی رسول کی طرف
الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَہُمْ	(یعنی قرآن) تو تم دیکھتے ہو ان کی آنکھوں کو کہ
تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا	ان سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے
مِنَ الْحَقِّ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا	حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب
فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰہِدِیْنَ وَمَا	ہم ایمان لائے پس ہم کو لکھ لے گواہوں کے ساتھ اور
لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَا جَآءَنَا	کیوں نہ ہم ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو
مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا	ہمارے پاس آیا درانحالیکہ ہم متوقع ہیں کہ ہمارا
رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ (المائدہ)	پروردگار ہم کو نیکوکاروں کے ساتھ بہشت میں داخل کریگا۔

یہ تمام نصاریٰ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ انھوں نے اپنے عقائد و اعمال مسخ نہیں کئے تھے۔

وشیار اور مستعد طالب علم کی طرح جو کچھ ان کو پڑھایا گیا تھا اس کو پوری طرح محفوظ رکھا
اب مزید سبق کے لئے بیتاب تھے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو محسنین کے لقب سے ممتاز کیا۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ	پس ان کے اس قول کے سبب میں اللہ نے ان کو
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ	باغ دیئے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اس میں ہمیشہ
فِیْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝	رہیں گے اور یہ ہے بدلہ محسنین کا۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ
ن ہے متقین کے لئے۔ یہ ہدایت ہے محسنین کے لئے تو اس کا مفہوم اس سے کسی قدر وسیع
ہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔

اب ان مباحث کے اس نتیجہ پر غور کرو جو قرآن مجید کے فہم وتدبر کے متعلق ان سے مستنبط ہوتا ہے۔
قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، پس اس کا فہم وتدبر ان ہی لوگوں
ب ہوتا ہے جو اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہوں اور اس کی شکر گذاری یہ ہے کہ یہ جس مقصد
ے ان کو دی گئی ہے اس مقصد کو پورا کریں، دل سے اس کی قدر کریں اور اپنی عملی واعتقادی زندگی
کو پوری طرح طاری کر لیں۔ پس جوں جوں وہ اس نعمت کی قدر واحترام میں بڑھتے جائیں گے
مد اس کی برکتیں ان کے لئے بڑھتی جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ایک ساتھ نہیں نازل ہوا، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تاکہ امت
روانی اور شکر گذاری کا پورا پورا امتحان ہو جائے اور جس طرح ایک طالب علم درجہ بدرجہ کسی
حاصل کرتا ہے اسی طرح امت بھی بتدریج سبقاً سبقاً اس کو سیکھے اور اس کی تعلیمات کو
طرح اپنے اندر جذب کر لے۔ چنانچہ جو طریقہ قرآن مجید کے نزول کا تھا وہی طریقہ مسلمانوں
کے اخذ وتعلم کے لئے اختیار کیا۔ اس کی ایک ایک آیت کو لیتے۔ اس پر فکر وتدبر کرتے۔

عملاً اس کی مشق و تمرین کرتے اور جب اس کو اپنے عمل و اعتقاد میں پوری طرح گھلا لیتے تب آگے قدم بڑھاتے۔ اتقان میں ہے۔

وقد قال ابو عبد الرحمٰن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرؤن القرآن کعثمان بن عفان وعبد اللہ بن مسعود وغیرھما انھم کانوا اذا تعلموا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر آیات لم یتجاوزوھا حتی یعلموا ما فیھا من العلم والعمل قالوا فتعلمنا القرآن والعلم والعمل جمیعاً ولھذا کانوا یبقون مدۃ فی حفظ السورۃ

ابو عبد الرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے انلوگوں نے بیان کیا جو قرآن مجید پڑھتے پڑھاتے تھے مثلاً عثمان بن عفان اور عبد اللہ بن مسعود وغیرہ کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم دس آیتیں پڑھ لیتے تھے، تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب کر لیتے، آگے قدم نہ بڑھاتے انھوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے۔

[illegible]

چنانچہ ابن عمرؓ کے متعلق ہے:۔

اقام ابن عمر علی حفظ البقرۃ ثمانی سنین

حضرت ابن عمرؓ نے بقرہ کے حفظ پر پورے آٹھ سال

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کا مطالعۂ قرآن ہمارے مطالعہ سے بالکل مختلف تھا۔ وہ قرآن کو صرف علمی حیثیت سے جان لینے کے شائق نہ تھے بلکہ ان کی اصلی طلب اس کی تعلیمات کی عملی ممارست کے لئے تھی اور جب تک ایک آیت کو وہ اپنے علم و عمل کا جزو نہیں بنا لیتے تھے اس وقت تک دوسری آیت کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ اور یہی اس شکر کی اصلی حقیقت ہے جو ازدیاد نعمت کا باعث ہوتا ہے (لئن شکرتم لازیدنکم) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فہم و بصیرت کو اپنے انوار سے نورانی فرمایا اور صرف اسی ایک کتاب کے علم و عمل سے دونوں جہان کی تمام سربلندیاں ان کو بخشدیں۔

(باقی)

مذاکرہ

استدراک پر ''نظر''

از جناب مولوی اختر احسن صاحب اصلاحی

الاصلاح کے پچھلے نمبروں میں پرویز صاحب کے نظریہ نجات پر جو استدراک میں نے لکھا تھا، اگست کے پرچے میں اس استدراک پر پرویز صاحب نے ایک ''نظر'' ڈالی ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ ان کے اصل مضمون کی طرح ان کی یہ نظر بھی بالکل سطحی ہے اس لئے مجھے چند حرف اسکی نسبت بھی عرض کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے غور و فکر کے ساتھ پچھلی تحریرات پڑھی ہوں گی وہ فریقین کے زاویہ نگاہ اور ہر ایک کے دلائل کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہوں گے۔ اب اس مسئلہ پر مزید بحث کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ خود پرویز صاحب میرا مدعا سمجھنے سے اپنے تئیں قاصر ظاہر کر رہے ہیں اسلئے چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ اپنی مجمل تحریر کے بعض مباحث کی طرف اور توجہ دلا دوں۔ ممکن ہے اس سے کچھ فائدہ ہو۔ اگر اس کے بعد بھی ان کو اپنی رائے پر اصرار رہا تو مجبوری ہے۔ میں ان سے یا کسی شخص سے مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔ مناظرہ نہ صرف بے نتیجہ بلکہ نہایت مضر چیز ہے۔ لوگ اصل مسئلہ سے ہٹ کر بالکل غیر متعلق بحثوں میں پڑ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحث و نظر کا کوئی گوشہ تعمیر کرنا تو الگ رہا، ہم اپنی تہذیب اور اخلاق کے بچے کھچے آثار بھی مٹا کے رکھدیتے ہیں۔

پس میں محض چند لفظوں میں اپنا مدعائے ضروری الاظہار عرض کروں گا اور ان غیر متعلق باتوں سے اصلاً تعرض نہ کروں گا جو پرویز صاحب نے اپنی تحریر میں چھیڑ دی ہیں۔

(۱) سورہ مریم کی آیت وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا الایہ کے متعلق میری گذارش پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے پڑھکر مجھے تعجب ہے کہ آپ پر میرا مدعا واضح نہ ہو سکا حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ آپ نے اس خوف سے کہ کہیں اس آیت سے لوگ دوزخ سے نکلکر جنت میں جانا نہ سمجھ لیں، آیت کی جو تاویل فرمائی ہے وہ تاویل صحیح نہیں ہے۔ بالکل غلط ہے۔ اگر الفاظ کے صحیح معنی لئے جائیں گے اور ایسا کرنا ضروری ہے تو آپ کی اس احتیاط اور دوربینی کے باوجود آیت کا وہی مطلب ثابت ہو جائے گا جس سے آپ بھاگنا چاہتے ہیں بلاشبہہ میری بحث کا اصلی محور لفظ ورود تھا۔ اس میں بھی شبہہ نہیں کہ میں نے اس لفظ کے دو معنی بیان کئے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس جگہ اس کے معنی قرب کے نہیں لئے جا سکتے۔ موقع و محل مقتضی ہے کہ یہاں دخول کے معنی لئے جائیں۔ اور یہ اصول شاید آپ کو معلوم ہو کہ جب کوئی لفظ دو معنوں کو محتمل ہوتا ہے تو تعیین معنی کا فیصلہ موقع و محل کا اقتضا کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بلا لحاظ موقع و محل آپ جو معنی چاہیں اختیار کرلیں۔ عربی کا ایک مبتدی طالب علم بھی اس موٹی سی بات کو جانتا ہے۔

اور موقع و محل کے اقتضا کی نسبت یہ عرض کیا تھا کہ یہاں ورود کے معنی صرف دخول ہی کے لئے جا سکتے ہیں اس لئے کہ اس کے بعد ہی فرمایا ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۔ پھر ہم پرہیزگاروں کو بچالیں گے اور نافرمانوں کو گھٹنوں کے بل چھوڑ دیں گے۔ آپ نے اردو ترجموں میں "چھوڑ دیں گے" دیکھا اور اس سے یہ سمجھ لیا کہ مومنین کو دوزخ کے اوپر سے گذاروینگے اور کفار کو جس طرح اوپر سے کوئی چیز کوئے یا غار میں ڈالی جاتی ہے، دوزخ میں چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ معاف کیجئے گا یہ چھوڑ دینا اس سے بالکل مختلف ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔ "وذر" کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اپنی حالت اور جگہ میں پڑا ہوا چھوڑ دینا۔

اب اس معنی کو پیش نظر رکھکر غور فرمائیے کہ آپ کی تاویل بنتی ہے یا نہیں؟ لفظ کے اس

معنی کے اعتبار سے تو وہی تاویل واضح معلوم ہوتی ہے جس سے آپ بچنا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ منکم کے تمام مخاطب دوزخ میں داخل ہوں گے پھر جو الَّذِينَ اتَّقَوْا کے حکم میں داخل ہوں گے وہ نکال لئے جائیں گے اور جو ظالمین میں ہوں گے وہ اپنی حالت اور اپنی جگہ پر اوندھے منہ پڑے چھوڑ دیئے جائیں گے۔ ہمارے اس شبہ کو رفع کرنے کے لیے آپ کے لئے مناسب راہ یہ تھی کہ یا تو ورود کے جو معنی بیان کئے گئے آپ اس کی تردید فرماتے اور اپنی معنی کی تائید میں کوئی ثبوت پیش کرتے یہاں تک کہ ورود کے معنی قرب کے لئے جا سکتے یا کم سے کم یہ کرتے کہ آپ ہمارے اختیار کردہ معنی کو اختیار کرتے ہوئے آیت کی کوئی ایسی تاویل فرماتے جس سے آپکے خیال کی تائید ہو جاتی۔ مگر یہ تو کوئی ٹھیک بات نہیں ہوئی کہ محض اس ڈر کے مارے کہ کہیں کوئی شخص آپکے زعم کے خلاف اس آیت سے دوزخ میں داخل ہونے کے بعد جنت میں جانا نہ سمجھ لے الفاظ کے صحیح معنی بدل ڈالیں اور اپنی طرف سے ایک معنی وضع کر کے آیت کی من مانی تاویل کر دیں اور جب آپ کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے تو بجائے اسکے کہ کلام عرب کی کوئی شہادت پیش کریں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ کھول کر بیٹھ جائیں۔

ہم کو تسلیم ہے کہ جس طرح قرب کے معنی لینے میں یہ آیت بعض دوسری آیات سے جن میں مومنین کو دوزخ سے دور رکھے جانے کا ذکر ہے متعارض ہوتی ہے اس سے کہیں بڑھکر دخول کے معنی لینے میں متعارض ہوتی ہے۔ اس تعارض کا انکار نہ آپ کر سکتے ہیں نہ میں۔ چنانچہ اس کا ذکر میں نے پچھلے مضمون میں کیا تھا اور اپنی طرف سے بعض وجوہ رفع تعارض کی طرف بھی اشارہ کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ آپنے اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اسی لیئے آپ کو پوچھنا پڑا۔ "لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جب ورود کے معنی دخول کے لئے جائیں تو کیا پھر یہی تضاد عاید نہ ہوگا یہ تو اور بھی شدت کا تضاد ہوگا" لیکن اگر اجازت ہو تو ہم بھی نہایت ادب سے ایک بات دریافت کریں کہ کیا تعارض کے رفع کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ الفاظ کے معنی بدل دئے جائیں اگر یہ اصول مان لیا جائے

تو بہت سی مشکلات سے چھٹی تو مل جائے گی لیکن اس کو دنیا میں رائج کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کے سوا لغت و ادب اور تفسیر کا تمام ذخیرہ پہلے ناپید کر دیا جائے اور یقیناً اس دور کے لئے ابھی ہم کو اور آپ کو کچھ دن انتظار کرنا پڑیگا۔ پس اس وقت تک کیلئے، تو ناگزیر ہے کہ الفاظ کے صحیح معنی اختیار کرتے ہوئے کوئی ایسی تاویل فرمائیے کہ اشکال بھی رفع ہو جائے، اور آپ کا مطلب بھی نکل آئے، اور اگر ایسی کوئی تاویل سمجھ میں نہیں آتی تو ہم کو آپکے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہی راہ اختیار کیجئے جس کا اختیار کرنا ہے تو نفس پر بہت شاق لیکن بہتوں کو اختیار کرنی پڑتی ہے بلکہ ارباب علم کی محبوب ترین راہ یہی ہے۔ یعنی اعتراف عجز۔ آخر آپ تمام علم کے تنہا ٹھیکہ دار ہو کے تو آئے نہیں ہیں؟

اس تضاد کے رفع کرنے کی ایک صورت میں نے عرض کی تھی، شاید یاد ہو لیکن پھر عرض کرتا ہوں کہ جن آیات میں متقین کو جہنم سے دور رکھے جانے کا ذکر ہے وہ ایک مخصوص جماعت ہے جو دنیا ہی میں گناہوں سے پاک ہو چکی ہوگی۔ مرنے کے بعد حساب وغیرہ سے بالکل آزاد ہوگی۔ انہی لوگوں کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ "لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا" یہ آیات ان مومنین سے متعلق نہیں ہیں جو گناہوں کیساتھ دنیا سے جائیں گے۔ ان کا ذکر سورہ مریم کی زیر بحث آیت میں ہوا ہے اور ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں جو ایمان و تقویٰ بھی رکھتے تھے اور ساتھ ہی معاصی کی آلودگی بھی خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا"۔ یہ ہماری تاویل نہیں ہے۔ دوسروں کی ترجمانی ہے اور محض اس لئے عرض کر دی گئی تھی کہ اشکال کے رفع کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہے۔ ورنہ ہمارے نزدیک اس آیت کی تاویل ان تمام شبہات و شکوک سے بالاتر ہے۔ مگر ہم نے اس کو اس لئے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ اس وقت آپکے مضمون کی بدولت دنیا میں ایک نئے نظریہ کا اضافہ ہو رہا تھا ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس میں ہماری تاویل مخل ہو جائے اور اس بات پر پوری طرح راضی تھے کہ اگر آپ ہمارے بعض شبہات کا

ازالہ کر دیں گے تو ہم بھی اس نظریہ کو جو دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ آپ ہی نے پیش کیا ہے، تسلیم کریں گے۔

بہرحال رفع تعارض کی ایک شکل یہ پیش کی گئی تھی، مگر یہ آپ کے مدعا کے خلاف ہے اس لئے اب آپ ہی کوئی شکل پیدا کیجئے، مگر خدارا الفاظ کے صحیح معانی کا خیال رکھئے گا۔

آپ نے اس بات پر بڑے تعجب اور رنج کا اظہار کیا ہے کہ ہم سے ایک حدیث کا انکار ہو گیا۔ اس بات کا یہ پہلو تو نہایت خوشکن ہے کہ انکار حدیث آپکے نزدیک بھی معیوب ہے، لیکن ساتھ ہی اس سے یہ معلوم کر کے مایوسی ہوئی کہ آپ فن حدیث کے معاملات سمجھنے میں تفسیر قرآن سے بھی کچھ آگے ہیں حالانکہ اردو میں اس فن کی بعض چیزیں موجود ہیں اور اہل تحقیق کے لئے اجتہاد کی راہ باز۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نہایت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک حدیث اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہو لیکن وہ ایک آیت کی تفسیر نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ آیت کا منشا کچھ اور ہو۔ اور حدیث کا کچھ اور۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوں۔ فرض کیجئے کہ اس آیت کے بجائے کوئی اور آیت لے لی جائے اور اس کی تاویل ٹھیک ٹھیک اسی حدیث کے مطابق کر دی جائے گو سیاق و سباق اور الفاظ اس تاویل سے ابا کر رہے ہوں تو کیا اس تاویل کی مخالفت محض اس لئے ناجائز ہو جائے گی کہ وہ حدیث کے مطابق ہے۔ اور اس کی مخالفت عین حدیث کی مخالفت ہو گی؟

اور پھر یہ حدیث میرے عقیدہ کے خلاف کب ہے! اس میں تو ایک ایسی جماعت کا بھی ذکر ہے جو ایک وقت تک سزا پا کر نجات حاصل کر لیگی۔ بہرحال اس موقع پر حدیث کے ماننے نہ ماننے کا سوال ہی نہ تھا سوال آپ کی تاویل کی صحت و عدم صحت کا تھا اور میری معروضات تمامتر اسی سے متعلق تھیں۔

(۲) میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ حبط اعمال کفر و شرک سے ہوتا ہے اور نہایت واضح مقدمات سے یہ ثابت کیا تھا کہ خلود جہنم مومن کے لئے نہیں ہے لیکن پرویز۔ صاحب نے سورہ حجرات کی ایک

آیت پیش کرکے اپنے خیال میں میرے ان مقدمات کی جو قرآن کی صریح آیات پر مبنی تھے بالکل بنیاد ہی ڈھا دی۔

وہ آیت یہ ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ	اے ایمان والو نبی کی آواز پر اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ	اور اس کے سامنے زور سے، بولو جس طرح تم میں کا ایک
کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ	دوسرے کے سامنے زور سے بولتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ	حبط ہو جائیں اور تمھیں احساس نہ ہو۔

اس آیت کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ایک مومن کے اعمال نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے سے بھی ڈھہ جاتے ہیں حالانکہ یہ فعل شرک و کفر نہیں ہے۔ لیکن میں کیسے عرض کروں کہ سورہ مریم والی آیت کی طرح پرویز صاحب اس آیت کو بھی نہیں سمجھے اور مانع فہم غالباً یہاں بھی وہی ہے جو وہاں تھا لیکن اگر ان کو توجہ دلائے تو خفا ہو جائیں گے "اور اعظم گڈھ اور اس کے تمام متعلقات" پر ایک ہی ساتھ برس پڑیں گے۔

سب سے پہلے انھیں یہ دیکھنا تھا کہ کفار و مشرکین کے حبط اعمال کے متعلق جو آیات ہیں ان کے اسلوب بیان میں اور اس آیت کے اسلوب بیان میں نہایت نمایاں فرق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صرف اتنی ہی بات ان کو اصل حقیقت تک پہنچا دیتی اور وہ ایک ایسی بات کے کہنے سے بچ جاتے جس کو عربی زبان کا ایک معمولی طالب علم بھی سنے گا تو اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکے گا۔ اور افسوس ہے کہ اس بارے میں پرویز صاحب کی غلطی کا الزام قرآن کے اردو مترجمین کے سر بھی نہیں تھوپا جا سکتا ہے، ان بیچاروں نے آیت کے تمام مقدرات کھول دیئے ہیں جو سمجھنے والوں کے لئے کافی ہیں۔

باقی وہ مدرس بنکر سبق تو پڑھانے سے رہے!

پرویز صاحب کی نظر صرف لفظ حبط پر گئی اور انھوں نے سمجھا کہ مطلب کی بات ہے اس کو

اچاہئے۔ حالانکہ عربی زبان اور بالخصوص قرآن مجید میں ایک نہایت اہم چیز اس کے اسالیب
طلبہ کو مدت تک سر کھپانا پڑتا ہے اور جو لوگ اجتہاد اور جدید نظریات پیش کرنے کے شائق
کے لئے ضروری ہے کہ ان سے آشنا ہوں
س مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے ایک تمہید اجمالاً پیش نظر رکھئے۔
حض امور کی ابتدا بظاہر معمولی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے آخری نتائج نہایت خوفناک ہوتے
امور کو عام لوگ ہیچ سمجھکر ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے لیکن حکیم ان کے آغاز ہی میں ان پر
ہے کہ مبادا یہی قطرہ دریا بنجائے۔ اور پھر اس کے سیلاب میں ایک عالم غرق ہوجائے۔
شہور مصرع بہتوں کو یاد ہوگا۔

سر چشمہ شاید گرفتن بمیل

رب باوجودیکہ جاہل اور غیر متمدن تھے لیکن اس نکتہ کو ہمارے مجتہدین سے اچھا سمجھتے تھے۔
اس مضمون کے اشعار و نصائح سے بھرا ہے اور حماسہ کا مصرع تو شاید ہی کسی طالب العلم کو یاد نہ ہو۔

یہیج کبیرات الامور صغیرہا

طرت کے اسی اصول پر قرآن مجید نے بعض جگہ اپنی عظیم الشان تعلیمات کا آغاز ایسے واقعات
بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ سورہ تحریم کی ابتدا میں جس واقعہ کی طرف اشارہ
س قدر معمولی نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک خطرناک نتیجہ کی طرف منجر ہوسکتا تھا یعنی بعد میں
یم و تحلیل کے اس آزادانہ طرز عمل کی بنیاد پڑ سکتی تھی جس سے پچھلی قومیں برباد ہوئی ہیں
ں کے متعلق خدا کی طرف سے سخت تنبیہ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت
طوالت مانع تفصیل ہے۔ انفال کی ابتدائی آیتیں غور سے پڑھئے۔ اور جی چاہے تو
نی کے پہاڑ پر جانے کا واقعہ بھی۔ اس کے بعد اس آیت کے مفہوم پر غور کیجئے اور سب سے

اہم

پہلے "اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ" کے اسلوب پر تدبر فرمائیے۔ بالخصوص حرف "اَنْ" کے پیش وعقب پر۔ اسی تل کے اوٹ میں پہاڑ ہے۔

یہ اسلوب عربی زبان میں بہت عام ہے۔ اور قرآن مجید میں تو اسقدر ہے کہ اگر اندیشہ ہوتا کہ آپ کے سوا اس اسلوب سے بعض دوسرے بھی بیخبر ہونگے تو الاصلاح میں اس پر ایک مضمون لکھدیا جاتا۔ اس قسم کی ترکیب میں "ان" سے پہلے کوئی مناسب مقام لفظ محذوف ہوتا ہے۔ اہل نحو اس محذوف کی تعیین موقع ومحل کی مناسبت سے رجاء وتحذیر کے مختلف الفاظ سے کرتے ہیں۔ مثلاً اس موقع کے لئے مخافۃ، کراہۃ یا اس کے ہم معنی الفاظ اختیار کرلیں گے۔ پس "اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس امر سے تم کو روکا گیا ہے اس سے روکنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ رہے تو مبادا تمھارا یہ فعل ایسی برائی تک منجر ہو کر تمھاری تمام اعمال حبط ہو جائیں۔ یہ نہیں کہ بعینہٖ یہی فعل سبب حبط عمل ہے۔ براہ کرم ان آیتوں کو پیش نظر رکھئے جن میں کفر وشرک کو حبط عمل کا قطعی سبب بتایا گیا ہے۔ مثلاً (۱) لَوْ اَشْرَکُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" نبی سے خطاب ہے۔ (۲) لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ۔ (۳) مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ" کیا آپ کے نزدیک آیت زیر بحث اور ان آیات میں کوئی فرق نہیں ہے؟ اگر آپ قرآن کے اردو ترجموں میں بھی دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ ایک میں قطعی فیصلہ ہے ایک میں خطرہ سے تحذیر ہے کہ تمھارا یہ فعل حبط عمل تک منجر ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ آیت میں یوں نہیں کہا گیا کہ خطرہ ہے کہ تمھارے اعمال حبط ہو جائیں" اس لئے آپنے سمجھ لیا کہ نفس رفع صوت فوق صوت النبی ہی حبط عمل کا سبب ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ بغیر کسی نوٹس کے اس خطرہ کو سمجھتے ہیں۔ مگر آخر آپ نے اردو ترجموں پر کیوں نہیں غور فرمایا! ممکن ہے آپنے مقدر کی توضیح کو قوسین کے اندر دیکھکر سمجھا ہو کہ یہ بیچ میں مترجم نے کوئی "روایتی مسلک

رکھدیا ہے اور اسی لئے اس کو چھوڑ گئے ہوں۔ وہ مثل ہے : کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے !

افسوس ہے کہ آپ حدیث کے قدر داں نہیں ورنہ ہم آپ کو یہی بات ایک مثال سے سمجھاتے اور پھر ایک حدیث سناتے جس میں وہ مثال بیان ہوئی ہے اور عالم کے تمام اسرار کو بے نقاب کر رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نبی کی آواز پر آواز بلند کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یوں تو آواز بلند کرنے کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں سب اس کے تحت آ سکتی ہیں اور یہی ادب و احترام کا تقاضا ہے کہ ان سب سے اجتناب کیا جائے۔ نبی کی حیثیت عام انسانوں کی نہیں۔ ہم پر اپنے عام علم اور استاد کی تعظیم بھی واجب ہے۔ پھر اس ذات کے احترام کا کیا پوچھنا ہے جو خدا کی طرف سے تمام عالم کی معلم بنا کر بھیجی گئی ہے۔

لیکن موقع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفع صوت سے مناظرہ و مجادلہ کی طرف اشارہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنی رایوں کو بہت وقیع سمجھتے تھے اور نبی کریم سے بات بات پر گستاخانہ بحث کر بیٹھتے تھے۔ عام طور پر یہ طریقہ منافقین کا تھا کہ ان کا مقصود ہی نبی کی توہین و دل آزاری تھا لیکن ممکن ہے کہ کمزور ایمان کے مسلمان بھی کبھی کبھی ایسا کر جاتے رہے ہوں اس لئے یہ نہی نازل ہوئی کہ مسلمان اس فعل کے آخری نتائج سے واقف ہو جائیں۔ حسن سے مروی ہے۔

نزلت فی المنافقین کانوا یرفعون	یہ آیت منافقین کے بارہ میں نازل ہوئی وہ لوگ
باصواتہم فوق صوت رسول اللہ	اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر اہانت کے خیال سے
صلی اللہ علیہ وسلم استخفافاً واستہانۃً	بلند کرتے تھے تاکہ یہ کمزور ایمان کے مسلمان انکی
لیقتدی بہم ضعفۃ المسلمین فنہی	پیروی کریں۔ پس مسلمانوں کو اس سے روک
المسلمون عن ذلک	دیا گیا۔

اس سے قبل کی آیت لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ سے بھی اس خیال کی

تائید ہوتی ہے اور مزید تائید اس سورہ کی ایک اور آیت سے ہوتی ہے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ	اور جان لو کہ تمھارے اندر خدا کا رسول ہے
لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ	اگر وہ بہت سے امور میں تمھاری پیروی کرتا تو تم تنگی میں پڑ جاتے

"یٰاَیُّھَا الذین اٰمنوا" میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن ظاہر ہے کہ تمام مسلمان اس سے مراد نہیں ہو سکتے بلکہ راسخ الایمان مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ	یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو خدا کے رسول کے
رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	یہاں پست کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جن کے دلوں
امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى	کو خدا نے تقویٰ کے لئے پرکھ لیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رفع صوت عند النبی تقویٰ کے منافی ہے اور چونکہ تقویٰ ہدایت کا سرچشمہ ہے اسلئے جو لوگ نبی کے سامنے آواز بلند کرینگے وہ ہدایت سے محروم ہو جانے کے مستحق ہوں گے۔

الغرض یہاں یاایہا الذین اٰمنوا کے خطاب عام کا روئے سخن اصلاً ضعیف الایمان مومنین کی طرف ہے۔ اسی قسم کے مومنین کی ایک جماعت کا ذکر اس سورہ کے اخیر میں ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا	اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے (اے نبی) کہدو تم لوگ
وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا	ایمان نہیں لائے بلکہ تم لوگ کہو ہم اسلام لائے۔

سورہ حدید کی ایک آیت میں الذین اٰمنوا کے عام لفظ سے ضعیف الایمان مسلمانوں کو مراد لیا ہے

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ	کیا مسلمانوں کے لئے ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ	خدا کے ذکر کیلئے اور اس حق کیلئے جو نازل ہوا

ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتٰب　　اور ان لوگوں کی طرح
من قبل فطال علیھم الامد　　نہ ہو جائیں جنکو اس سے قبل کتاب دی گئی تو ان پر
فقست قلوبھم الایہ　　مدت دراز ہو گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے

پرویز صاحب فرمائیں گے کہ دیکھئے بے دلیل وسند یا ایھا الذین امنوا سے ضعفاء قلوب کو مراد لے لیا حالانکہ کسی ترجمہ میں ایسا نہیں لکھا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق وجوہ خطاب سے ہے جو مجملہ ابواب وجوہ دلالت قرآن کے ہے اور اس پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں۔ خود آیت زیر بحث کے ابھی بعض نہایت مفید پہلو اس قابل تھے کہ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے لیکن خوف طوالت مانع ہے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے میرے اس فقرہ پر کہ "البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر گناہ کی سزا ہونی چاہیئے" لکھا ہے کہ "یہاں مولوی صاحب پھر الجھن میں پھنس گئے"۔ اچھا صاحب ہم الجھن میں پھنس گئے لیکن آپ تو شب تاریک اور بیم موج کے تمام اندیشوں سے فارغ تھے۔ پھر آپ کو کیا ہو گیا تھا کہ اس کے بعد ہی کی یہ عبارت آپ کو نظر نہ آسکی" اس لئے کہ جو گناہ توبہ سے معاف ہو گئے یا جنکو حسنات نے مٹا دیا ان کی سزا نہیں ہو گی ہاں جو گناہ ایسے ہیں کہ بغیر توبہ معاف نہیں ہو سکتے اگر ان کا کوئی مرتکب ہوا اور توبہ نکرے تو یقیناً سزا کا مستحق ہو گا ...."
کہیں آپنے اپنے نجات کے ارتقائی تخیل میں تو بحث و نظر کے زینوں کو اسی طرح نہیں طے کیا ہے!

(۴) بچوں کے دخول جنت کے متعلق میں نے یہ عرض کیا تھا کہ بلا شبہ اسکے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح آیت نہیں ہے اور نہ یہ کوئی اصولی مسئلہ ہے البتہ اشارات ملتے ہیں اور اس کے لئے اشارات کافی ہیں اور اسی ضمن میں سورہ طور کی آیت والذین امنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان الآیہ پیش کی تھی اور اس سے اس طرح پر استدلال کیا تھا کہ اس آیت میں مذکور ہے کہ

مومنوں کی صالح اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ کر دیا جائے گا۔ اور ان سب کو ایک ہی درجہ میں رکھا جائے گا گو عمل کے لحاظ سے اولاد کا درجہ فروتر ہو۔ اور ایسا محض جنتیوں کی تکمیل مسرت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے کرے گا۔ پھر جب محض جنتیوں کی تکمیل مسرت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے ان کی صالح مومن ذریت کو چاہے وہ جنت کے فروتر درجہ میں ہو اونچے درجہ میں پہونچا دے گا تو اگر چھوٹے بچے بھی محض اپنی والدین کی تکمیل مسرت کے لئے بطور فضل و بخشش ان کے ساتھ کر دئے جائیں تو ایسا ہونا اقرب ہے جب کہ یہ بھی معلوم ہے کہ جنت میں اہل ایمان جو آرزو کریں گے وہ پوری کی جائے گی۔ یہ میرا خیال تھا جو مذکورہ بالا آیت سے میں نے سمجھا تھا اور اس کی تائید میں جنازہ والی دعا پیش کر کے عرض کیا تھا کہ احادیث سے بچوں کے جنت میں جانے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے لیکن پرویز صاحب نے اس پر چند اعتراضات وارد کئے ہیں۔ اول اعتراض یہ ہے کہ ہم نے ذریت کے معنی اولاد کے لئے ہیں حالانکہ اس کے معنی اولاد اور اولاد در اولاد کے آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایک غیر متعلق بحث چھڑ جائے گی ورنہ ہم ان کو بتلاتے کہ اولاد در اولاد کے کیا معنی ہیں اور ذریت کے لفظ میں یہ مفہوم کیسے آتا ہے لیکن زائد بحث میں پڑنے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ چونکہ اولاد کے معنی اختیار کرنے میں کوئی خرابی نہیں تھی اس لئے ہم نے اسے اختیار کر لیا۔ اور یہی تمام مفسرین اور مترجمین نے اختیار کیا۔ لیکن اگر پرویز صاحب کو اصرار ہے تو خیر اولاد در اولاد ہی کے معنی سہی میرے مدعا کو اس سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک یہ اجتماع ذریت ہی تک محدود نہیں ہوگا بلکہ اس میں آباء و ازواج بھی شامل ہوں گے جیسا کہ قرآن پاک کی اور دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "آیت میں ذریت کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائے۔

انھوں نے اتباع کی اور یہ کہ اللہ ان کے اعمال میں کمی نہ کرے گا پھر اس سے نابالغ غیر مکلف بچے کس طرح مراد لیے جا سکتے ہیں؟ معلوم نہیں پرویز صاحب نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے ذریت سے مراد نابالغ بچے لیے ہیں۔ میں نے تو بالکل واضح طور پر مومن وصالح اور سیانی اولاد کا لفظ لکھا ہے اور پھر میرے استدلال کی نوعیت ہی بتا دے سکتی ہے کہ میں نے نابالغ بچوں کو مراد نہیں لیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ اگر میرے نزدیک ذریت سے نابالغ بچے مراد ہوتے تو یہ آیت تو اس باب میں بالکل نص صریح ہو جاتی ـــ اس سے مجھے اشارات مستنبط کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پرویز صاحب سے اس آیت کے سمجھنے میں ایک اور چوک بھی ہو گئی ہے وہ یہ کہ "وما التناھم من عملھم من شیٔ" کو وہ ذریت سے متعلق سمجھتے ہیں اور غالباً اس سے ان کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ مومنین کے ساتھ مزید فضل الٰہی کے طفیل میں نہ ہوں گے، اپنے اعمال کے استحقاق کی بنا پر ہوں گے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا تعلق مومنین سے ہے ذریت سے نہیں ہے۔ یہی عام طور پر مفسرین کی بھی رائے ہے۔ رسول اللہ صلعم سے جو تفسیر مروی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

پھر نفس آیت اور موقع و محل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہاں ان نعمتوں کا ذکر ہے جن سے مومنین کو جنت میں نوازا جائے گا اور منجملہ ان نعمتوں کے یہ ذریت کا الحاق و اجتماع بھی ہے۔ لیکن یہاں ایک شبہہ ناشی ہوتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس الحاق کے لئے ذریت کے نقص عمل کی تلافی ان کے بزرگوں کے عمل سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس شبہہ کو دفع فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا یہ محض فضل و احسان ہوگا، مومنین کے اعمال میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ یہ گویا بطور دفع دخل مقدر ہے۔ دوسرے یہ کہ آیت میں الحاق کا لفظ ہے۔ اور اگر مان لیا جائے کہ وہ محض اپنے اعمال کے صلہ میں اپنے بزرگوں کے درجہ میں ہوں گے تو ان کی خود مستقل حیثیت ہوئی۔ یہ الحاق نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مومنین کی اولاد جو اپنے عمل کی کمی کی وجہ سے

ان سے فروتر ہوگی۔ بطور فضل خداوندی اور تشریف و تکریم ان کے ساتھ کر دیئے گی۔ تاکہ ان کی مسرت کامل ہو۔ میں نے اسی پر چھوٹے بچوں کے متعلق اپنے استدلال کی بنیاد قائم کی کہ جب ذریت کے باب میں اس فضل و رعایت کا سراغ لگتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کمسن بچوں کو بھی ان کے والدین کی تکمیل مسرت کے لئے ان کے ساتھ کر دے گا گو وہ اپنے عمل کے اعتبار سے جنت کے مستحق نہ ہوں۔

پھر اسی ذیل میں میں نے ایک روایت بھی لکھی تھی کہ "بہشت میں جو آرزو کی جائیگی پوری ہوگی۔۔۔۔ اسلئے اللہ تعالیٰ مومنین کی اس آرزو کو کہ انکی اولاد ان کے ساتھ کر دیجائے انکی تکمیل مسرت کیلئے پوری کر دے گا۔"

اس پر پرویز صاحب پر لطف معارضہ فرماتے ہیں۔

"کیا عمدہ استدلال ہے۔ اور اگر کسی کی وہاں یہ آرزو ہو کہ اس کے فلاں دوست یا اسکی بیوی کو تکمیل مسرت کے لئے اس کے ساتھ کر دیا جائے تو ان سب کو دوزخ سے نکالکر جنت میں بھیج دیا جائیگا۔"

جواب میں گذارش ہے کہ قرآن کا وعدہ تو یہی ہے کہ جنت میں جو خواہش کی جائے گی وہ پوری ہوگی ولکم فیہا ما تشتھون ولکم فیہا ما تدعون

یہ تو قرآن کی آیتیں ہیں۔ کوئی روایتی مسلک تو ہے نہیں کہ آپ بے تامل انکار کر دیں گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ حضرات قرآن کو بھی اسی وقت تک مانتے ہیں جب تک وہ آپکے مزعومہ مسلک کی حمایت کرے اور جماعت کے مشن سے ہم آہنگ ہو ورنہ اس کے انکار میں بھی چنداں مضایقہ نہیں ہے۔ تعجب ہے آپنے جنت کی زندگی کو بالکل اپنی زندگی پر قیاس فرمایا۔ حالانکہ وہ زندگی بالکل مختلف ہوگی۔ وہاں ہر جائز و ناجائز چیز کی آرزو نہیں کی جائے گی۔ غور فرمایئے جن چیزوں سے ایک مومن اپنی دنیاوی زندگی میں نفرت کرتا تھا یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ان کی آرزو اس زندگی میں کرے جو بالکل پاک اور خالص زندگی ہوگی۔ سورہ نور غور سے پڑھیئے۔ اس میں ایک آیت ملے گی جس میں مومن کے گھرانے اور اسلام کی سوسائٹی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور اس کے بعد

سوچئے کہ جس مقدس گھرانے کے افراد دنیا میں پاکی اور طہارت کے اس رتبہ پر ہیں وہ جنت میں یہ کیسے آرزو کریں گے کہ فلاں عورت دوزخ سے نکال کے ان کے ساتھ کر دی جائے۔ معلوم نہیں آپ نے ایمان کو کیا چیز سمجھ رکھا ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ تمنائیں بھی باقی رہیں گی۔ جس ایمان نے بدر میں باپ کی تلوار بیٹے کی گردن پر چلوا دی۔ جس نے بھانجہ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین کرا دی۔ جس نے حضرت نوحؑ کے بیٹے کو ان کے خاندان سے خارج کر دیا۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ۔ جس نے حضرت ابراہیمؑ کو باپ کے لئے دعائے استغفار سے روک دیا، جس نے رحمۃ للعالمین سے اپنے چچا کے خلاف اعلان برأت کرایا اور جس کی بے پناہی کا یہ عالم ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ کیا اس ایمان کے ساتھ آپ کو یہ بھی خیال ہے کہ کسی زانیہ، فاحشہ اور دوزخی عورت کی محبت بھی جمع ہو جائے گی اور وہ بھی جنت میں پہنچکر؟ کیا قرآن کو سمجھنے کے لئے "روایتی مسلک" سے آزاد ہونے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کا مذاق سلیم ایسا ہو کہ اس طرح کی باتیں لکھدینے سے اس کا قلم ذرا بھی نہ جھجکے۔!! انا للہ

بہر حال آپنے یہ ایسی بات لکھدی کہ جس کے بعد آپ سے کسی علمی مسئلہ پر گفتگو بے محل معلوم ہوتی ہے۔ تاہم عرض کرتا ہوں کہ اہل ایمان کا رشتۂ محبت دنیا ہی میں اہل کفر و شرک سے منقطع ہو جاتا ہے۔ پس وہ جنت میں بدرجہ اولی ان کے ساتھ یکجائی کی درخواست نہیں کریں گے۔ لیکن کمسن بچوں کا معاملہ بالکل مختلف نوعیت و حالت رکھتا ہے۔ وہ کفر و فسق کی آلودگی سے کوسوں دور معصومیت کے گودوں میں کھیلتے ہوئے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں اور اپنے والدین کے دلوں میں ایک زخم چھوڑ جاتے ہیں۔ پس ہو نہیں سکتا کہ جنت میں یہ داغ محبت نہ ابھرے اور ارحم الراحمین اس پر مرہم نہ رکھے۔

آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ کافروں اور فاسقوں کے لئے تو جنت میں جانے کے لئے ایک مانع موجود ہے لیکن بچوں کے لئے کیا مانع ہے؟ ان کے لئے صرف داعی کی ضرورت تھی اور مومن باپ اور مومنہ ماں سے بڑھکر کون داعی ہو سکتا ہے! اسی لئے میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ بچوں کا جنت میں جانا تبعاً ہوگا۔

"انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم الایۃ"

اس آیت میں ہم نے "ما تعبدون" سے اصنام مراد لئے تھے اس لئے کہ قرائن اسی کے مقتضی تھے۔ چنانچہ "ما تعبدون" اور "الھۃ" عام طور پر اصنام ہی کیلئے آتے ہیں، متبوعین کیلئے نہیں۔ لیکن پرویز صاحب اس کو عام مانتے ہیں، اور ہم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہمارا مدعا اس صورت میں بھی ثابت ہے۔ کیونکہ اس عام کے اندر اصنام بھی داخل ہوں گے اور یہی مقصود ہے۔

غرض اندر میاں سلامت اوست

(۴) اعراف کی جماعت پر مجھے اعتراض نہیں، ہ اسکا ذکر قرآن میں ہے اس پر اعتراض کی کہاں گنجائش ہے؛ سوال جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ آپکے اصول ارتقاء کے مطابق ان کو جنت میں جانے کا حق کیسے ہوا۔ انکی سیئات حسنات سے دبی نہیں۔ ان کے اندر صلح بالہم کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ دنیا عمل کی جگہ تھی، اس میں وہ منزل مقصود تک پہنچے نہیں۔ اب آخرت عمل کی جگہ نہیں کہ آگے بڑھ سکیں۔ پھر ان کو آپ کے اصول کے مطابق جنت میں جانے کا کیا حق ہے!! اور اگر وہ جنت میں گئے تو یقیناً وہ آپکے فلسفہ کے حدود کو توڑ کر جائیں گے اور غور فرمایئے یہ کتنی درد انگیز بات ہوگی کہ جس فلسفہ کو آپ ہی نے دنیا میں پہلی مرتبہ قائم کیا وہ آپ ہی کی قائم کی ہوئی ایک جماعت کے ہاتھوں برباد ہو کے رہ جائے!! پھر یہ کس دلیل سے آپ نے معلوم کیا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال صالحہ اور سیئات برابر

ہوں گے ایسے لوگوں کا ذکر تو اس موقع پر ہونا تھا جہاں وزن اعمال کا ذکر ہے۔ لیکن وہاں بھی اس بات کا کوئی مذکور نہیں جہاں اس جماعت کا ذکر ہے۔ کہیں اس کی بنیاد آپ نے ظن پر تو نہیں قائم کر لی ہے۔ مگر ایسا کاہے کو ہوگا۔ ظن سے تو آپ لوگوں کو بڑی نفرت ہے۔!

اب آخر میں فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ الآیہ پر غور کرنا چاہیئے کہ درحقیقت پرویز صاحب کے نظریہ کی اصل بنیاد یہی ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ "یہ بالکل صحیح ہے کہ اصل میں دو ہی جماعتیں ہیں۔ ایک خدا اور رسول کی ماننے والی اور دوسری منکر۔ اور باعتبار نتیجہ کے ایک کے لئے جنت ہے اور دوسری کیلئے دوزخ۔ اس لحاظ سے ایک مدت تک سزا جھیل کر جنت میں جانیوالی کوئی تیسری جماعت نہیں کہ حقیقۃً وہ بھی خدا اور رسول کے ماننے والوں میں شامل ہے اور بالآخر وہ جنت ہی کی مستحق ہوگی۔ اور چونکہ یہ ایک ضمنی جماعت ہے اس لئے جہاں قرآن نے اصولی تقسیم کی ہے وہاں اسکا ذکر ضروری نہیں سمجھا۔" اس لئے اس آیت کے متعلق ایک علیحدہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ اس آیت میں یا اس قسم کی دوسری آیات (مثلاً جن میں اعمالنامہ کے دہنے اور بائیں ہاتھ میں ملنے کا ذکر ہے) یہی اصولی تقسیم پیش نظر ہے۔ کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے۔ ورنہ یہ ضروری تھا کہ ان مواقع پر اعراف والی تیسری جماعت کا بھی ذکر ہوتا۔ لیکن اس کا ذکر نہیں ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ اس کو جب اعمالنامے ملیں گے تو اس کی صورت کیا ہوگی۔ حالانکہ یہ جماعت دہنے ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں اعمالنامے پانے والی دونوں جماعتوں سے یقیناً ایک الگ حالت رکھے گی۔ مگر اس کی تفصیل نہیں کی گئی کیونکہ یہاں ان جزئیات کی تفصیل کا محل نہ تھا صرف ایک اصولی اور کلی تقسیم پیش نظر تھی۔

اس آیت کا اعادہ سورہ اعراف اور سورہ زلزال میں بھی ہوا ہے۔ ان تمام مواقع کے مطالعہ سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اس کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یعنی میزان کی ثقل و خفت، اعمال صالحہ کی کثرت و قلت کی تعبیر نہیں ہے بلکہ اعمال کے نافع اور غیر نافع ہونے کی تعبیر ہے۔ جن کے اعمال مفید اور کارآمد ہوں گے اس کے پلڑے بھاری ہوں گے جنکے اعمال شرک و کفر کی وجہ سے کھوکھلے ہوں گے ان کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ ان میں سے پہلی جماعت اہل ایمان کی ہوگی کہ ان کے ایمان نے ان کے اعمال میں وزن پیدا کر دیا ہوگا اور دوسری جماعت کفار و مشرکین کی ہوگی کہ کفر و شرک کی وجہ سے ان کے اعمال بالکل بے وزن ہوں گے۔ انہی منکرین کے متعلق سورہ کہف میں ہے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ	وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیات کا اور
وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ	اس سے ملنے کا پس ان کے اعمال ڈھ گئے
لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا	ان کے لئے قیامت کے دن کوئی وزن نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے اعمال میں کوئی وزن نہ ہوگا اور اسی بے وزنی کو زیر بحث آیت میں خفت میزان سے تعبیر کیا ہے۔ ورنہ اگر فمن خفت موازینہ سے وہ لوگ مراد ہوتے جن کے اعمال حسنہ اعمال سیئہ سے کم ہوں گے تو اس موقع پر الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ کی صفت کے ساتھ ان کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو ایک عام بات ہوتی جس کا فرد مومن دونوں اس کی زد میں آتے۔ مگر معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اعمال کی حیثیت روح ایمان سے قائم ہوگی۔ جس کے پاس ایمان ہوگا ان کے اعمال میں وزن ہوگا اور جو ایمان سے خالی ہوں گے ان کے اعمال بالکل بے وزن ہوں گے۔ پس آپ کا یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ خدا کے یہاں بھی آپ کے اسکولوں کی طرح گنتی اور عدد پر کامیابی اور نجات کا فیصلہ ہوگا۔ اور وہاں کی میزان ایسی ہی اندھی ہوگی جیسی آپکے ہاتھ میں ہے کہ کوئلے اور اشرفیوں دونوں کو برابر تول دے گی

ادبیات

کلام سہیل

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ال ال بی علیگ

نوید نو بہار آئی گھٹا چھائی ہے گلشن پر
اسیران قفس قابض ہوئے شاخ نشیمن پر

نظر برق تپاں کی جب سے ہے میرے نشیمن پر
برستی ہے اداسی سی تجلی گاہ ایمن پر

سزا فریاد کی ہے یا کرم ہے میرے شیون پر
قفس اب بھی وہی ہے گرچہ ہے شاخ نشیمن پر

بڑھائے جاتے ہیں ہر روز حلقے دام گیسو کے
مگر صیاد کا احسان ہے پھر بھی اپنی گردن پر

نہیں اذن فغاں بھی رخصت پرواز کیا ہوتی
قفس والے بھی کھاتے ہیں ترس میرے نشیمن پر

ترے مشتاق ہیں مدت سے بزم راز کے پردے
بس اے دست جنوں یہ مشق تا کے جیب و دامن پر

تماشا گاہ موسیٰ کے بھی ٹکڑے جیب کے کر ڈالے
وہ بجلی کوندتی ہے اب سواد دشت ایمن پر

انہی تنکوں سے وابستہ مری تاریخ ہستی ہے
فدا کر دوں دو عالم اپنے خاشاک نشیمن پر

بہار داغ عصیاں دیکھ کر دامان رحمت میں
فرشتوں کی نظر اٹھتی ہے مجھ آلودہ دامن پر

نہیں اب کارگر کوئی فریب حسن کا افسوں
مدار اک رہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر

مرا ذوق نظر خوگر ہے منظر کی بلندی کا
کروں کیوں ان سے جلوے کا تقاضا دشت ایمن پر

یہ حاصل ہے سہیل خستہ اپنی سعی حاصل کا
کہ حسرت آرزو ہے التفات برق خرمن پر

تلخیصات

فلسطین

(یہ مضمون مسٹر عبدالحکیم علمی نے ہندوستان ٹائمز سے تلخیص کر کے عنایت فرمایا ہے۔ اڈیٹر)

دوران جنگ میں قوموں میں جو معاہدے ہوتے ہیں عموماً وہ دیرپا نہیں ہوتے۔ ان کا ہیولیٰ تیزی سے بدلنے والے حالات کے اندر تیار ہوتا ہے اس لئے ان کی بنیادیں کھوکھلی رہجاتی ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے چاہا کہ ترکوں کا تختہ الٹ دے۔ اس کے لئے عربوں کی حمایت کی ضرورت تھی۔ پس ان کو ہموار کرنے کے لئے جھٹ ان سے وعدہ کر لیا گیا کہ تمھیں کل آزادی دیدی جائے گی۔ ساتھ ہی برطانیہ کو یہودی سرمایہ اور امریکہ کے اخبارات کی اعانت کی بھی ضرورت تھی چنانچہ یہودیوں سے وعدہ کر لیا گیا کہ فلسطین کو ہم تمہارا قومی وطن بنا دیں گے۔ عرب آزادی کے عشق میں ایسے کھوئے گئے تھے کہ فوراً برطانیہ کے دام فریب میں آگئے، لیکن یہودی مہاجن قوم ہیں انھوں نے معاملہ چکانے سے پہلے ایک دستاویز کا مطالبہ کیا جو ضرورت کے وقت کام آوے۔

رائل کمیشن، جس کی رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہو اس نے بیس سال اُدھر کے دستاویزات اور معاہدوں کی چھان بین میں سر کھپانا ضروری نہیں خیال کیا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کا منہ بند کرنے کے لئے یہ دلیل بالکل کافی ہے کہ برطانوی حکومت نے عربوں کے مطالبات کبھی صحیح تسلیم نہیں کئے۔

گو یہ انتہائی بدبختی کی بات ہے کہ برطانوی حکومت زمانہ جنگ کی کشمکش میں اپنا ارادہ تفصیل و وضاحت کیساتھ تشریح کر کے بیان نہ کر سکی لیکن ابہام و اجمال بھی سیاسی تدبر کا ایک ضروری عنصر ہے۔ اسلئے نہ تو اس پر افسوس کرنا چاہیئے نہ تعجب!

۱۹۱۵ء میں انگریزوں کیلئے عربوں کی حمایت بڑی قیمتی چیز تھی۔ ترکوں کے خلاف پروپگنڈے کی جو آگ بھڑکائی گئی تھی اس کیلئے بہترین ایندھن عرب ہی ہوسکتے تھے۔ اسلئے ضروری ہوا کہ انکو زیادہ سے زیادہ قیمتی وعدوں کے ذریعہ خوش رکھا جائے چنانچہ مصر کے ہائی کمشنر سر ہنری میکموہن نے عربوں کے جذبات آزادی کو اور زیادہ شہ دی، انھوں نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں جو شریف مکہ کے نام لکھا تھا، آزاد عرب کا ایک جلوہ دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ خط حکومت کی طرف سے کبھی شائع نہیں ہوا اور یہ بتلانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ انگریز اپنے مفاد کے خلاف کسی قول و قرار کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے اس خط کی رو سے ترکی ولایت ادنہ، حلب و دمشق کے مغرب کے شامی اضلاع حدود عرب سے خارج سمجھے گئے۔ اس کے بعد مسٹر ونسٹن چرچل نے اس بنا پر کہ فلسطین سیریا سے ملحق ہے نہ صرف بیروت اور بیت المقدس کو بلکہ دریائے یردن کے مغرب کے تمام علاقہ کو ممالک عرب سے بالکل خارج قرار دیدیا۔ (یادداشت مورخہ ۳ جون ۱۹۲۲ء)

اس یادداشت سے برطانوی حکومت کا منشا معلوم ہوگیا۔ دوسری طرف ہنری میکموہن کے وعدوں کے بعد ہی برطانیہ اور فرانس میں خفیہ معاہدے ہونے لگے۔ بالآخر یہ خفیہ معاہدے سائکز پیکاٹ (Sykes Picot) کے صلحنامہ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس صلحنامہ کی رو سے برطانیہ اور فرانس نے شمالی عرب کو باہم تقسیم کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بقیہ عرب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت میں بدل دینا چاہا۔ نومبر ۱۹۱۷ء تک یہ صلحنامہ عربوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ لیکن روسی انقلاب کے بعد جب بالشویکی حکومت برسر اقتدار ہوئی تو عربوں پر حقیقت حال کھل گئی۔ عرب سخت غضبناک ہوئے، مگر اس وقت جب کہ سازش کی رات گذر چکی تھی اور نتائج کی صبح نمودار ہو چکی تھی۔

اعلان بالفور نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی اور صیہونی گفت و شنید تکمیل کو پہنچ گئی۔ مسٹر بالفور نے جو اس زمانہ میں برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے لارڈ روتھ شیلڈ کو لکھا "ہز مجسٹی کی حکومت فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کی تجویز کی پرزور حمایت کرتی ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنی

پوری کوشش صرف کرے گی، اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ فلسطین کی غیر یہودی آبادی کے مذہبی اور تمدنی حقوق یا غیر ممالک کے یہودیوں کے عام حقوق و اختیارات پر کسی قسم کی دست اندازی نہیں کیجائے گی۔

پرمنفعت سودا "قومی وطن" کی تجویز ایک پرمنفعت سودا تھی۔ مسٹر لائڈ جارج نے فرمایا ہے کہ "صیہونی لیڈروں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر دول متحدہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے میں آسانیاں فراہم کرنیکا وعدہ کریں تو ساری دنیا کے یہودی دول متحدہ کی اعانت وحمایت میں ہر ممکن ایثار وقربانی کے لئے تیار ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہود نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔"

یہودی ریاست کا تصور فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق مدبرین کی رائیں ہمیشہ مختلف رہی ہیں، کچھ سمجھتے تھے کہ فلسطین میں ایک یہودی حکومت کی بنیادیں استوار کیجائیں گی۔ اور بعض اس کا مطلب کچھ اور سمجھتے تھے لیکن ہز مجسٹی کی حکومت نے کبھی اس غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے ہر قسم کے خیالات اور ہر طرح کی امیدوں کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور کبھی تردید یا تصحیح کی زحمت نہیں اٹھائی۔ مسٹر لائڈ جارج نے جو اسوقت وزیر اعظم تھے، اب رائل کمیشن کو ایک بیان دیا ہے فرماتے ہیں "فلسطین میں اکثریت کی خواہش کے علی الرغم دفعۃً کسی یہودی سلطنت کی طرح ڈالدینا ہرگز پیش نظر نہ تھا۔ ابتدا سے یہ خیال تھا کہ جب فلسطین کو ملک کی نمایندہ اور ذمہ دار حکومت عطا کرنے کا وقت آئے گا اور یہود قومی وطن کے تصور کی رہنمائی میں، ملک میں اپنی اکثریت بنا چکے ہوں گے تو فلسطین کی حکومت خود بخود کلی طور پر ایک یہودی کامن ویلتھ کی شکل اختیار کرلے گی۔"

دول متحدہ کے دوسرے سیاسی مفکرین، یا وہ جو یہودیوں اور عربوں سے برطانوی معاہدوں کا حال جانتے تھے، زیادہ کھل گئے۔ انھوں نے بھی برطانیہ کی طرح ساری دنیا کو "مہذب" بنانیکا مصمم ارادہ

کرلیا - ۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو پریسیڈنٹ ولسن نے فرمایا مجھے یقین ہے کہ دول متحدہ جمہوریت امریکہ کے تعاون واشتراک سے فلسطین میں یہودی کا من ولیمتہ کی بنیاد رکھنے کے بارہ میں بالکل متفق ہیں۔ جنرل اسمٹس نے جو اعلان بالفور کے نفاذ میں کابینہ جنگ کے ایک ممبر تھے۔ ۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو فرمایا "میں سرزمین فلسطین پہ مستقبل کی جلیل القدر یہودی سلطنت کا ہیولیٰ تیار ہوتے دیکھ رہا ہوں" لیکن سب سے زیادہ صریح اور واضح بیان جو برطانوی حوصلوں کا حقیقی مظہر ہے وہ ہے جو وطن الیہود کے پہلے مجوز لارڈ بالفور نے دیا ہے۔ ۱۲ جولائی ۱۹۲۰ء کو لارڈ موصوف نے فرمایا "عربوں کو دل بیدار اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ عظمیٰ کا احسان فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محض ان کی اعانت وہمدردی سے عرب اپنے فاتحین یعنی ترکوں کے وحشیانہ مظالم سے نجات حاصل کرسکے مجھے امید ہے عرب اس حقیقت کو بھی نہ بھولیں گے کہ ہم ہی اب جو محض عرب کے مفاد کیلئے عراق میں ایک آزاد ذمہ دار حکومت کے قیام کیلئے فضا تیار کررہے ہیں۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عربوں کو اس بات پر ملال نہ ہونا چاہئے کہ سرزمین عرب کا ایک حقیر سا گوشہ (کیونکہ فلسطین تاریخی حیثیت سے جو کچھ بھی ہو لیکن جغرافی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک حقیر اور بے مایہ قطعہ زمین ہے) ان لوگوں کے حوالے کیا جارہا ہے جو ہزاروں برس گذرے اس سے بچھڑ گئے تھے" یہود نے دول متحدہ میں سے صرف برطانیہ عظمیٰ سے منشور حاصل کرلینا کافی سمجھا اور باوجود سخت مخالفت کے یہ منشور برطانیہ نے اپنے زور و اثر سے کام لیکر انجمن اقوام میں پیش کردیا۔ عربوں سے جتنے معاہدے کیے گئے تھے سب بھلا دیے گئے حتیٰ کہ یہود نوازی کے جوش میں سائکس پیکاٹ کا صلحنامہ بھی ٹھکرا دیا گیا۔ جون ۱۹۲۲ء میں یہود سے متعلق برطانوی پالیسی کی وضاحت مسٹر چرچل نے ان الفاظ میں کی "سوال کیا جاتا ہے کہ فلسطین میں یہود کے قومی وطن بنانے کی تجویز کو استحکام عطا کرنیکا کیا مفہوم ہے۔ جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ فلسطین میں دوسرے باشندوں پر یہود کو جماعتی حیثیت سے مسلط کردیا جائے۔ مقصود صرف اتنا ہے کہ یہود فلسطین کو باہر والے یہودیوں کی اعانت وتعاون سے اتنی شوکت وقوت بہم پہنچائی جائے کہ فلسطین عالم صیہونیت میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرے اور جو ابنائے یہود کے لئے مذہبی اور نسلی اعتبار سے باعث فخر بن سکے۔"

۵۰

جولائی ۱۹۲۲ء میں لیگ کاؤنسل نے منشور فلسطین پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء سے اس پر باقاعدہ عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اب عربوں کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ انہیں اپنی جائداد و املاک کی طرف سے بھی سخت اندیشہ پیدا ہو گیا چنانچہ ان کی دلجوئی یا ابلہ فریبی کیلئے دفتر نوآبادیات نے مسٹر چرچل کا میمورنڈم شائع کیا کہ فلسطین میں خالص یہودی حکومت کی بنیاد رکھنا برطانیہ کا منشا نہیں ہے اور نہ معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے عربوں کو یہود کا محکوم بنانا مقصود ہے منشا یہ ہے کہ فلسطین میں یہود کو دیگر اقوام کے برابر حقوق و اختیارات حاصل ہو جائیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر انھیں دنیا کے دیگر ممالک سے ہجرت کی اجازت دی گئی ہے۔ یہودیوں نے ملک کے وسائل دولت و معاش ایک ایک کر کے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور منشور کی ہر ہر دفعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے تہیہ کیا کہ فلسطین کو اپنا قومی وطن بنا کے چھوڑینگے جب کبھی سلف گورنمنٹ کے نقطہ نظر سے ان کی پوزیشن پر اعتراض کیا گیا انھوں نے منشور کو سپر بنایا۔ اس ہنگامہ میں آزاد عرب کا تصور بالکل غائب ہو گیا یہود اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے میں اس درجہ منہمک اور سرگرم تھے کہ ایک زبردست مدبر کی رائے کے مطابق دنیا میں کم یہود ایسے ہوں گے جو منشور کو برٹش مینڈیٹ کی "کتاب مقدس" نہ سمجھتے ہوں۔

شا کمیشن

اگر عرب فطرتاً شجاع اور جنگجو نہ ہوتے اور اپنی جائز خواہشات کو پامال ہوتے دیکھ کر فلسطین کو ہنگامہ زار نہ بنا دیتے تو اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اور یہود کے منصوبے کب کے پورے ہو چکے ہوتے لیکن جذبات آزادی اور اپنی فطرت سے مجبور ہو کر عرب مرنے اور مارنے پر تیار ہو گئے چنانچہ جب ۱۹۲۹ء کے ہنگاموں کے اسباب کی تحقیق کے لئے شا کمیشن کا تقرر ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ ابہام اور اجمال والی پالیسی کا دور گذر چکا ہے۔ اب اس سے کسی مزید فائدے کی توقع نہیں ہے۔ شا کمیشن کی رپورٹ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی کمیشن نے درخواست کی کہ برطانوی حکومت فلسطین کے متعلق اپنی پالیسی کی وضاحت کرے۔ ۱۹۲۲ء والے اعلان کی از سر نو توثیق و تصدیق کی جائے، اس لئے کہ منشور کی رو سے یہودیوں کو ملکی حکومت میں حصہ لینے کا کوئی استحقاق نہیں ہے

برطانوی وزیر اعظم مسٹر میکڈ نلڈ نے حکومت کے رویہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم فلسطین کی تمام جماعتوں کے ساتھ انصاف سے کام لینا چاہتے ہیں اور ۱۹۲۲ء کے اعلان کے باب میں فریقین کے ساتھ وہی معاملہ

ہو گا۔ جو حق و انصاف کا تقاضہ ہو گا۔" لیکن جب کمیشن کی رپوٹ اور مسٹر میکڈانلڈ کا توضیحی بیان دونوں مجلس اقوام کے مینڈیٹ کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تو ان پر سختی سے اعتراض کیا گیا۔ مینڈیٹ کمیشن اس فیصلے پر پہنچا کہ ہنگامہ و فساد کا بنیادی سبب گورنمنٹ کا اپنے فرائض کی طرف سے یکسر تغافل تھا۔ ملک کی زرعی اور تعلیمی حالت اور دیگر قومی عالیہ کے شعبوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بے اتفاقی فساد و انتشار کا باعث ہوئی، شاکمیشن کا یہ بیان کہ ہنگامہ و بغاوت کی آگ برطانوی حکومت کے خلاف نہیں بھڑکائی گئی ہے۔ حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

شاکمیشن نے بالکل غیر ارادی طور پر برطانوی پالیسی اور برطانوی نظم و نسق کو عالم آشکار کر دیا۔ عرب اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں لیڈروں نے اعلان کر دیا کہ گورنمنٹ کی پالیسی کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ عربوں کو وطن سے بے وطن کر کے یہودیوں کو ان کی جگہ دیدی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعلان میں کوئی بات بیجا نہ تھی۔ برطانوی مدبرین نے ۱۹۲۲ء میں جو کچھ کہا تھا یہ اس کا پرزور اور بے لاگ اعادہ تھا۔ یہودیوں کے اثر سے برطانیہ کیلئے یہ ناممکن ہو گیا کہ غیر ملکی یہودی مہاجرین کا داخلہ فلسطین میں ممنوع قرار دیدے۔ دوسری طرف عربوں سے حکومت کے غیر ہمدردانہ رویہ نے ان کو مفاد عامہ کے کاموں سے بالکل غافل کر دیا۔ لیکن یہ لطف کی بات ہے کہ سرکاری بیانات میں ہمیشہ فلسطین کی ترقیوں کا گیت گایا گیا۔ عربوں نے دیکھا ہم نہایت تیزی سے پستی و نامرادی کی طرف بڑھ رہے ہیں پس انھوں نے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں پے در پے بغاوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ ان بغاوتوں کی اصل وجہ مذہبی عصبیت ہے لیکن یہ بات نہیں ہے۔ ساری بغاوتیں برطانوی پالیسی کے ردعمل کے طور پر رونما ہوئیں۔ صیہونی انجمنیں ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء میں دو مرتبہ عربوں کی ذمہ دار اور آزاد حکومت کے مطالبات کی راہ میں پہاڑ کی طرح حائل ہو گئیں۔ خوفزدہ عرب آزادی کے مطالبے پر مصر ہیں اور "بہادر و شجاع" یہود برطانوی منشور کو سینے سے لگائے ہیں۔ بلاشبہ برطانیہ کے استعماری مقاصد کے لئے یہودیوں کا وجود ایک مفید بہانہ ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر روزین نے ایک دوسرے موقع پر کہا ہے۔

"یہود ہمیشہ ایک آسان اور مفید بہانے کا کام دیتے رہے ہیں"۔

تقسیم فلسطین | رائل کمیشن نے تقسیم فلسطین کی ایک تجویز پیش کی ہے۔ برطانوی حکومت اپنے زور قوت سے اس تجویز پر عمل کرنے کی پوری قدرت رکھتی ہے۔ یہودی ریاست کی بنیاد بھی رکھی جاسکتی ہے اور ساحل کے شاداب اور اہم مقامات پر برطانوی تسلط بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ رائل کمیشن نے مسئلہ کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے تاریخی حقائق سے کام لیا ہے ہم بھی چاہتے ہیں کہ "یہودی ریاست" کی بنیاد رکھنے سے پہلے ایک تاریخی نکتہ پر غور کرلیا جائے۔

ایک تاریخی نکتہ | یہود اور عرب کے تعلقات میں کبھی موجودہ تلخی اور ناگواری نہ تھی۔ یہ سعادت برطانیہ کیلئے مقدر تھی کہ دنیا کی ان گنت مشکلات میں عرب اور یہود کی نزاع سے ایک اور مشکل کا اضافہ کردے۔ ۱۳۵ء میں رومیوں نے بیت المقدس کو مسمار کرڈالا اور یہودیوں پر اتنے مظالم توڑے کہ وہ وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوگئے۔ اس زمانہ سے لیکر آج تک صرف ترک اور عرب یہودیوں کے ساتھ اخلاق و انسانیت کا برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ فلسطین پانچسو سال تک رومی اور بازنطینی حکومت میں رہنے کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ عربوں کی فتوحات کے ساتھ ہی یہود بھی افریقہ کے شمالی ساحل پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے یہاں تک کہ اسپین میں بھی پہنچ گئے۔ وطن کو خیرباد کہنے کے بعد اسپین ہی میں رفعت و ترقی کی بلند ترین سطح پر پہنچ سکے ان کو شہری زندگی کے تمام حقوق حاصل ہوئے۔ خلفاء انھیں اپنا وزیر تک بناتے تھے۔ حکومت کو انھیں اپنا وزیر مال تک بنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ یہود، سائنسداں، ڈاکٹر، طبیب اور فاضل و محقق سبھی کچھ ہوتے تھے۔ عبرانی شعر وادب اور عبرانی علوم و فنون کو بھی اسی زمانہ میں ترقی ہوئی مشہور فاضل و محقق میموتیڈس (   ) عرب اسپین میں پیدا ہوا بعد ازاں مصر
قاہرہ میں زندگی بسر کی۔

کامل ہم آہنگی | عرب اور یہود ہمیشہ پوری رواداری اور کامل ہم آہنگی کے ساتھ رہے یہودی قتل، غلط... پوری داستان جہاد و عیسائیت سے متعلق ہے۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں عیسائی مسلمانوں...

دونوں کے یکساں دشمن تھے۔ یورپ میں کسی یہودی کو قتل کرنا عیسائیوں کے نزدیک اتنا ہی بابرکت اور مستحق فعل تھا جتنا بیت المقدس میں کسی مسلمان کو قتل کرنا۔ پھر جب پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اسپین کی مذہبی عدالتیں منکروں اور ملحدوں کو زندہ جلانے لگیں تو وہ یہود جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے سے انکار کیا اسپین سے نکال دیئے گئے اور تاریخ کو یہ داستان یاد ہے کہ ان مظلوموں کو ترکی سلطنت کے بحر روم والے صوبوں، مصر، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ وغیرہ نے پناہ دی اور ترکی سلطنت کے زیر سایہ یہود ایک بار پھر رفعت و ترقی کے بلند ترین بام پر پہنچ گئے۔

اس تاریخی پس منظر کے ہوتے ہوئے یہ امر تعجب انگیز ہے کہ یہود برطانوی سامراج کے لئے بہانہ بننا تو پسند کریں لیکن عربوں کے ساتھ رواداری کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند نہ کریں۔ یقیناً ان کا یہ انتخاب کسی دور اندیشی اور دانشمندی پر مبنی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ عرب برطانوی اقتدار سے خوفزدہ ہوجائیں اور سپر ڈالدیں یا رشوت ان کے منہ کو بند اور ہاتھ پاؤں کو شل کر دے لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ برطانیہ زیادہ عرصہ تک اپنے استعماری مقاصد کو ایک حقیر سی یہودی ریاست کی خاطر قربان کرتی رہے گی۔ اور جب عربی حمیت اپنے حدود توڑ کر انتقام کے لئے آگے بڑھے گی تب وہ یہودیوں کی جانبازانہ حفاظت کرے گی۔

تفسیر سورۂ اخلاص (اردو)

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ نہایت عمدہ۔

قیمت :- ۵ر

مینیجر

تقریظ وتبصرہ

دعوت عمل :- مولفہ مولانا محفوظ الرحمن صاحب نگرامی تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۷۰ صفحات کاغذ متوسط کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت مرقوم نہیں۔ ملنے کا پتہ :- منصرم انجمن تبلیغ الاسلام نگرام ضلع لکھنؤ (اودھ)

انجمن تبلیغ الاسلام۔ نگرام ضلع لکھنؤ۔ ۱۵-۱۶ برس سے نہایت خاموشی کے ساتھ مفید تبلیغی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اچھوتوں اور بے خبر مسلمانوں کو اسلامی تعلیم وخصوصیات سے باخبر کرنے کے لئے ہر سال، آسان ہندوستانی اور ناگری زبان میں، تبلیغی کتابیں اور رسائل شائع کرتی ہے اور اسلامی خصوصیات سے متعلق چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ چھپوا کر مفت تقسیم کرتی ہے۔ ہمارے سامنے جو کتاب ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسکی اشاعت کا مقصد مؤلف محترم کے الفاظ میں یہ ہے۔

"آپکی لاعلمی میں دشمنان دین نے آپکے مقدس دین اسلام، شارع اسلام علیہ الصلاۃ والسلام علماء وامراء اسلام کی تحقیر وتذلیل کی جو انسانیت سوز تدبیریں اختیار کی ہیں اور کر رہے ہیں ان سے آپ کو باخبر کر دیا جائے اور اس کے بعد غیرت ایمانی اور حمیت قومی کے نام پر آپ سے اپیل کی جائے کہ آپ بیدار ہو کر وقت کے بہت بڑے فرض کا احساس فرمائیں۔"

ہمارے خیال میں عام مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ تبلیغ سے شغف رکھنے والوں کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

جامعہ ملیہ دہلی سے مندرجہ ذیل کتابیں موصول ہوئی ہیں۔

بچوں کی کہانیاں :- مصنفہ مولوی عبدالواحد صاحب۔ سندھی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۳۰ صفحے۔ کاغذ اچھا، کتابت وطباعت اور سرورق جاذب نظر قیمت ۲/

یہ کتاب بچوں کی مخصوص نفسیات اور ان کے طبعی میلانات کا لحاظ کرکے لکھی گئی ہے۔ اس میں چار چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں ہیں، جو بچوں کے لب و لہجہ اور انکی عام بول چال میں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف نے کہیں سے کوئی ایسا لفظ نہیں آنے دیا ہے جس کے سمجھنے میں بچوں کو دشواری پیش آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کوئی بچہ اپنے بستر پر یہ کہانیاں بیان کر رہا ہے۔ اور دوسرے سننے والے اس سے مزہ لے رہے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے کہانیوں کی مناسبت سے جا بجا تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ اس کتاب کو بچے تفریحاً پڑھیں گے۔ اور اپنے دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں محسوس کرینگے۔

ننھی مرغابی: ۔ مصنفہ مولوی عبدالواحد صاحب سندھی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ تقطیع ۳۰×۲۲/۱۶ حجم ۳۱ ص کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت روشن سرورق نہایت خوبصورت قیمت ۲ر

مصنف نے اس کتاب میں تین کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر ایک میں بچوں کے مذاق اور ان کے عام روزمرہ کی پابندی کی گئی ہے۔ انداز بیان اتنا دلچسپ و دلنشین ہے کہ کوئی بچہ شروع سے آخر تک ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حسب مواقع تصویریں دی گئی ہیں جن کی وجہ سے اس کو بچے، اور ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔

چھوٹا بچو: ۔ مصنفہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی جامعی اڈیٹر پیام تعلیم۔ تقطیع ۲۲×۳۰/۱۶ حجم ۲۹ صفحے کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ سرورق مصور۔ قیمت ۲ر

اس کتاب میں ایک بچو ہے کے بچے کی کہانی ہے۔ کہانی نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اسمیں بچوں کی عام فطرت کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہر بچہ کو پڑھنی چاہئے۔ بچے اس کو پڑھکر خوش ہوں گے اور والدین کی فرمانبرداری کا بہترین سبق حاصل کریں گے۔

چھڈو: ۔ مصنفہ رقیہ ریحانہ صاحبہ و دیگر حضرات۔ تقطیع ۲۰×۲۲/۱۶ حجم ۲۰ صفحے۔ کاغذ بہتر۔ کتابت و طباعت اور سرورق دیدہ زیب قیمت ۳ر

اس کتاب میں چار قصے ہیں۔ "چھدو اور باچھو" رقیہ ریحانہ صاحبہ نے لکھا ہے "آخری قدم" اور "پان کو" علی الترتیب ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب اور جناب امتیاز حسین صاحب کے نتائج فکر ہیں۔ ہر قصہ کی زبان نہایت شیریں اور صاف ہے۔ پہلے دو قصے بچوں میں سیاحت و ترقی کا شوق اور ہر چیز کو کرنے اور پرکھنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ آخر کے دو قصے نیکی و اخلاص کا سبق دیتے ہیں۔

کائنات :۔ مصنفہ جناب محمود علی خان صاحب جامعی۔ تقطیع ۲۲×۳۰/۱۶ حجم ۸۰ صفحے کاغذ سفید دبیز کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۵/

جغرافیہ طبیعی ایک مشکل فن ہے۔ بچوں کو تو چھوڑیئے۔ سیانوں کو اس فن کی باتیں سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ عام طور سے اسکولوں میں اس فن کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کا انداز بیان اسقدر ناقص اور مبہم ہوتا ہے کہ بچے مسائل رٹ لینے کے سوا اصل مطلب کو بہت کم سمجھتے ہیں۔ اور جو کچھ سمجھتے ہیں وہ بھی بار حافظ ہوتا ہے۔ لیکن پیش نظر کتاب کا حال یہ نہیں ہے۔ اس کا اسلوب بالکل نرالا ہے۔ اس میں ہر مسئلہ کو نہایت شگفتہ انداز میں سمجھا دیا گیا ہے۔ کوئی بات مبہم نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اس کتاب کو اگر جغرافیہ کے ابتدائی طلبہ اپنے سامنے رکھیں تو انکو اس سے بڑی مدد ملے گی۔

دنیا کے بچے :۔ مصنفہ مولوی محمد حسین حسان صاحب ندوی، جامعی اڈیٹر پیام تعلیم تقطیع ۲۲×۳۰/۱۶ حجم ۸۰ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، سرورق مصور، قیمت ۶/

اس کتاب میں افریقہ، فرانس، جاپان، رومانیا، چین، سوڈان، سوئٹزرلینڈ، اسپین، روس، جرمنی، اٹلی، اور ہالینڈ وغیرہ کے بچوں کے عادات و اطوار اور ان ملکوں کے عام جغرافیائی حالات خصوصیات افسانہ کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ بچے ہر ملک کی آب و ہوا، طبعی خصوصیات رسم و رواج، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طور طریق سے باتوں باتوں میں واقف ہو جائیں۔

یہ تمام کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی سے ملیں گی۔ ہماری رائے ہے کہ یہ کتابیں ابتدائی مدارس کے نصاب میں داخل کی جائیں۔

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتابِ الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ سو تحقیق حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بتلاتے ہیں۔ پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:۔ اس کتاب میں مولانا کی عام خصوصیاتِ تفسیر کے علاوہ چند باتیں مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ابتدا کی قسموں کا عمود سورہ (دنیونستہ) سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھلایا ہے اسی ضمن میں تمام اقوام معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے وقت موقع جو ایک نظریہ ہے اس کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے "خلق سے" اور "خلق زوجین" سے معاد اور رسالت پر استدلال کئے جو بیان ہوئے ہیں انکی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت: ۶۰۰ (باقی سرورق صفحہ ۳ پر دیکھئے)

نمبر ۱ | ماہِ رجب ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء | جلد ۲

فہرست مضامین

شذرات

ایک مخدوم بزرگ اپنے والانامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مدت سے خیال تھا کہ سیرت حمیدیہ پر آپ کو توجہ دلاؤں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ورع و تقویٰ اس زمانہ میں آپ اپنی نظیر تھا۔ ضروری ہے کہ ان چیزوں کے نمونے آپ حضرات کے قلم سے الاصلاح میں برابر نکلتے رہیں۔"

یہ خیال عرصہ سے سامنے ہے اور بار بار جی میں آیا کہ یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ لیکن مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ ہم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ حیدرآباد سے ترک تعلق کے بعد انھوں نے یہاں مستقلاً قیام شروع کیا اور ہم لوگوں کی صحبت و ملازمت کا زمانہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے کے تمام حالات زیادہ تر انکے صرف ان احباب و تلامذہ کو معلوم ہیں جو الہ آباد، کراچی اور حیدرآباد میں ان سے وابستگی رکھتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگوئیں ہمیشہ علمی مباحث پر ہوتی تھیں۔ زندگی کے عام احوال و واقعات کا ذکر کبھی شاذ و نادر مشکل ہی سے کرتے۔ اس وجہ سے بھی ہم لوگ ان کی پچھلی زندگی کی سرگذشتوں سے کچھ واقف نہ ہوسکے۔ ان اسباب سے جب جب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کا خیال سامنے آیا طبیعت ہچک گئی۔ لیکن یہ کام کرنا ہے۔ مولانا کے اکثر مخلصین کا تقاضا اسکے لئے اصرار کی حد تک بڑھ گیا ہے۔ پھر ایک ایسی زندگی جو اپنے اندر اتنے معانی رکھتی ہو، ہمارے لئے ایک بہترین علمی و عملی سرمایہ ہے اور اس کے بصیرت بخش حالات دنیا کے موجودہ دور میں جبکہ زندگی کے اچھے نمونے شاذ و نادر مشکل ہی سے کبھی دیکھنے کو ملتے ہیں، ہم کو بیشمار فائدے پہنچا سکتے ہیں۔ بس جی چاہتا ہے کہ الاصلاح کے صفحات میں یہ کام شروع کر دیا جائے، اگر مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے تو جو متفرق حالات سامنے ہیں وہی جمع کر دئے جائیں، ممکن ہے اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے احباب و تلامذہ کو بھی توجہ ہو اور وہ بھی اپنی معلومات سے فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں اور

آہستہ آہستہ مولانا کی مفصل سوانح حیات لکھنے کے لئے مواد فراہم ہو جائے۔

مولانا سے واقفیت رکھنے والے جن بزرگوں کی نگاہوں سے یہ سطریں گذریں ان سے التماس ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ہماری مدد کریں۔ اگر کوئی خاص مشغولیت مانع نہ ہوئی تو ان شاء اللہ اشاعت سے یہ کام کسی نہ کسی شکل میں شروع ہو جائے گا والامر بید اللہ۔

مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری (فاضل دیوبند) استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد نے مندرجہ ذیل تحریر اپنے ایک گرامی نامہ کے ساتھ الاصلاح میں اشاعت کے لئے ارسال فرمائی ہے۔

"ہندوستانی زبان اور تفسیر قرآن"

کے موضوع پر ایک کتاب کی ترتیب و تدوین ہو رہی ہے۔ جس میں ان تمام مصنفین و مؤلفین کا تذکرہ ہوگا جنھوں نے "ہندوستانی" (اردو) میں قرآن عزیز کی کوئی خدمت کی ہو، خواہ مستقل تفسیر ہو، یا کسی تفسیر کی عربی کتاب کا ترجمہ ہو یا کسی قرآنی مسئلہ پر کوئی تالیف ہو، وہ اپنا مختصر تذکرہ اپنی کتاب کے ہمراہ روانہ فرمائیں تاکہ ہم کو اپنی کتاب میں درج کرنے کا موقع ملے۔ اہل علم سے توقع ہے کہ وہ ضرور "قرآن اور ہندوستانی" کی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

معتمد دائرہ قرآنیہ، عمرآباد، ضلع شمالی ارکاٹ

جامعہ دارالسلام کے محترم اساتذہ قرآن مجید کی خدمت میں جس جوش سے حصہ لے رہے ہیں اس پر وہ تمام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اردو زبان اب قرآنی علوم و معارف سے ناآشنائے محض نہیں کہی جا سکتی۔ قدیم تحقیقات کے علاوہ بہت سی ایسی چیزیں بھی قرآن مجید سے متعلق اردو میں آگئی ہیں جو اس کی مخصوصات میں سے ہیں۔ اور اگر پورے لٹریچر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو میں قرآن مجید پر فکر و نظر کے مختلف اسکولوں کی اچھی خاصی ترجمانی ہو گئی ہے پس اگر کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس میں

ابتداسے لیکر اس وقت تک کی تمام کوششوں کے متعلق ضروری معلومات یکجا ہوجائیں تو یہ قرآن مجید اور اردو زبان دونوں کی ایک نہایت قابل قدر خدمت ہوگی۔ پس ہم امید کرتے ہیں کہ ارباب علم اس معاملہ میں دائرہ قرآنیہ کی پوری مدد کریں گے۔

موصوف ان لوگوں کی بھی فہرست معلوم کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ سے استفادہ کے بعد اردو زبان میں قرآن کی کوئی خدمت کی ہے۔ ہم کو اس بارہ میں معلومات نہیں ہیں۔ امید ہے مولاناؒ کے تلامذہ خود ضروری معلومات سے بختیاری صاحب کو مطلع کریں گے۔

فلسطین کے متعلق آجکل جو خبریں اخبارات میں آرہی ہیں ان کو پڑھکر مسلمانوں کی بیکسی پر کون دل ہے جو تڑپ نہ جاتا ہوگا۔ لیکن فلسطین سے زیادہ ہماری ابتری اور پراگندگی کا معاملہ دردانگیز ہے۔ ہندوستان میں رہکر ہم کرہی کیا سکتے تھے، لے دیکے سارا زور صدائے احتجاج کے جلسوں اور تجویزیں پاس کردینے والی کانفرنسوں تک محدود تھا۔ مگر اولاً تو ہمتوں پر موت طاری ہے ثانیاً اگر شرما شرمی میں بعض لوگ کچھ نمائش کرنا بھی چاہتے ہیں تو اغراض کا شیطان بیچ میں کود پڑتا ہے اور نمائش کا رہا سہا ڈھونگ بھی بگڑجاتا ہے۔ ایک جماعت اگر اعلان کرتی ہے کہ فلاں تاریخ کو جلسے کئے جائیں، صدائے احتجاج بلند کیجائے، دعائیں کی جائیں تو دوسری جماعت اٹھکر اس پر خط نسخ پھیر دیتی ہے اور ایک دوسری تاریخ اور ایک نئے پروگرام کا اعلان شایع کردیتی ہے۔ ایک جماعت کسی شہر میں ایک آل انڈیا فلسطین کانفرنس کا اعلان کرتی ہے تو دوسری جماعت کسی اور شہر میں پہنچکر دس دن پہلے ہی ایک آل انڈیا کانفرنس رچالیتی ہے۔ یہ قوم ہے جو قرآن پر ایمان رکھتی ہے اور محمد رسول اللہ کی امت میں شامل ہے!! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

ہماری قوم نے یہ ترقی اس وقت کی ہے جب برسوں سے ہندوستان کی گلی گلی میں تنظیم کے ہنگاموں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور جبکہ مصائب و شدائد کے احساس نے دنیا کی نالائق سے نالائق قوموں میں بھی

نہ صرف یکجہتی اور یگانگت کا احساس پیدا کر دیا ہے بلکہ ان کو بنیان مرصوص سے زیادہ محکم اور ٹھوس بنا دیا ہے۔ ابتک جب ہم مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی کوئی مثال ڈھونڈنا چاہتے تھے تو یہود کو یاد کر لیا کرتے تھے کہ مسلمان اسطرح تباہ و برباد ہو گئے جس طرح یہود۔ لیکن اب اپنی ناتقیوں کیلئے کوئی مثال تلاش کرنا چاہیں تو دنیا کے کس گوشہ میں جائیں!۔ وہی یہود جو کل تک مغضوب و ملعون تھے، اور جنکی مقدس زمین ان کی نااہیت کی وجہ سے معراج کی شب میں ہمارے سپرد کی گئی اب ایک ہی ، وہ طاقتور قوم بن گئے اور اپنی جگہ انھوں نے ہمارے لئے خالی کر دی اور دنیا کی تاریخ کا یہ عبرت انگیز تماشہ ہمارے حصہ میں آیا ہے کہ جو چیز ہم نے خدا کے ہاتھوں سے پائی تھی، برطانوی اقتدار کا ہاتھ اٹھا ہے کہ اسکو ہم سے چھین کر یہودیوں کے ہاتھ میں دیدے۔ اور ہمارے رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ

خانۂ شرع خراب است و ارباب صلاح
در عمارت گری گنبد دستار خود اند

کانگریس میں مت شریک ہوجو، وہ کفار کی جماعت ہے اور کفار کے ساتھ شرکت عمل حرام۔ وہ روٹی کی طمع دلا کر ہماری تمام اولوالعزمیوں کو پامال کر دینا چاہتی ہے اور وطن کو معبود بنا کر مسلمانوں کے عالمگیر نصب العین کو چھین لینا چاہتی ہے۔ ایسی جماعت گردن زدنی ہے۔ مسلمانوں کو صرف اپنے دین کی خدمت کرنی چاہئے اور اللہ کیلئے سربکف ہونا چاہئے۔ لیکن کیا یہ اللہ کا معاملہ نہیں ہے؟ کیا فلسطین کی سرزمین ہمارا دینی مرکز نہیں ہے؟ کیا اسکی مقدس مسجد ہمارا قبلۂ اولی نہیں ہے؟ کیا وہ ان تین مساجد میں سے ایک نہیں ہے جنکے لئے ہم شدرحال کر سکتے ہیں اور پھر کیا وہ حرم نہیں ہے جسکی حرمت کی حفاظت و صیانت سے بے پروا ہو کر ہم مسلمان نہیں رہ سکتے؟ کیا فاروق اعظمؓ کے کارنامے ہمکو فراموش ہو گئے؟ کیا صلاح الدین کی تلوار اس سرزمین کی حفاظت کیلئے نہیں چمکی! اور کیا یہ جھوٹ ہے کہ اس مجاہد اعظم اور محافظ ناموس و حرمت اسلام نے عین اس مقدس رات میں اس گھر کو نصاریٰ کے ہاتھوں سے چھینا جس مقدس رات میں اس گھر کی حفاظت و تولیت کی عظیم الشان امانت سرور کونین کو تفویض ہوئی؟ کیا ہماری تاریخ اور روایات کے

یہ تمام اوراق پارہ پارہ ہوگئے؟ پھر وہ مسلم لیگ کہاں ہے جو اس عہد میں ہمارے دین و مذہب کی تنہا پاسبان ہے۔ آخر وہ اسلام کی عظمت حفاظت کیلئے کیوں نہیں اٹھتی!۔ کیا اس معاملہ کو اتنی اسلامی اہمیت بھی حاصل نہیں ہے جتنی جھانسی کے الکشن کو حاصل تھی؟ اور ہمارے مسٹر جناح کہاں ہیں جنہوں نے شملہ میں فرمایا کہ وہ اسلام کی حرمت کیلئے توپوں کے دہانوں سے بھی نہیں ڈرینگے؟ آخر ان کے خروج کیلئے بدقسمت مسلمان کب تک راہ دیکھیں!

افسوس ہے کہ اس معاملہ میں جمعیتہ علمائے ہند نے بھی نہایت افسوسناک غفلت سے کام لیا۔ حالانکہ یہ کام اسی کے کرنیکا تھا۔ پار سال دہلی میں جو فلسطین کانفرنس ہوئی اسنے اولاً تو کوئی عملی پروگرام ہی مسلمانوں کے سامنے نہیں رکھا اور اگر چند تجویزیں پاس بھی کیں تو ان کیلئے ایک دن بھی عملی کام نہیں ہوا۔ الٰہ آباد میں جو کانفرنس ہوئی اسنے صرف صدائے احتجاج کا ریزولیشن پاس کیا اور عملی تجاویز کے معاملہ کو ایک مستقبل مجہول میں ہونیوالی کانفرنس کیلئے اٹھا رکھا اور اس صدائے احتجاج کیلئے بھی ملک میں کوئی باقاعدہ اور مؤثر پروپگنڈا نہیں کیا گیا۔ ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا دل اور دماغ دونوں مردہ ہوگیا ہے۔ ہم میں اولاً تو اپنے ملی مصائب کا صحیح احساس ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو دماغ اسکے تدارک کی عملی تجاویز سوچنے سے عاجز و مفلوج ہے۔ فلسطین کے حالات اول روز سے ایک ہی رخ پر ہیں۔ اور جو لوگ تھوڑی بہت بھی سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ جانتے تھے کہ رائل کمیشن کس نتیجہ تک پہنچنے والا ہے لیکن ہمارے ارباب سیاست نے، جو صرف حیلوں اور بہانوں کی تلاش میں رہتے ہیں جونہی سن پایا کہ ایک کمیشن معاملات کی تحقیق کر رہا ہے مطمئن ہو بیٹھے کہ اب آسمان سے خدا کی عدالت اتر آئی اور وہ ضرور مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہی کریگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان بالکل ہی بھول گئے کہ دنیا میں فلسطین نامی کوئی سرزمین بھی ہے اور اسکے لئے انھیں کچھ کرنا بھی ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ حالات پیش آگئے۔

جو مسلمان وزارت کے قلمدانوں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر متمکن ہیں، ان سے ہمکو کچھ کہنا نہیں ہے وہ دمشق اور بغداد کا تخت و تاج پاگئے اور اب وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو پھر واپس لائے بغیر تو وہاں سے ٹلتے نہیں!۔ ان کو

گورنروں نے سمجھا دیا ہے کہ فلسطین تمہارے حدودِ انتظام کے اندر شامل نہیں ہے، اور یہ حقیقت اس درجہ واضح ہے کہ وہ اسکا کسی طرح انکار نہیں کرسکتے۔ لیکن ان معصوموں سے کوئی پوچھے کہ اگر کل کو کوئی قوم خدانخواستہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ (حرسہما اللہ) پر گولہ باری کرے اور وہاں کے تمام علماء و مشائخ کو پکڑ پکڑ کے سولی، اور مالٹا کے جزیروں میں بند کرنا شروع کرے اور تم اس پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت مانگو اور وہ کہدیں کہ حجاز تمہارے حدودِ انتظام میں داخل نہیں ہے تو اس وقت تم کیا کروگے؟ کیا اسی طرح چپ ہو بیٹھو گے؟ اگر نہیں تو وہ راہِ عمل بتلاؤ جو اس وقت اختیار کروگے؟ اور پھر یہ بتلاؤ کہ وہ راہِ عمل تمہارے لئے آج کیوں بند ہے؟ کیا مسلمانوں کے قبلہ اولی کی حرمت تمہاری نگاہوں میں اتنی بھی نہیں ہے جتنی ان نام نہاد اسمبلیوں کی کرسیوں کی۔ کیا یہ حقیقت معلوم نہیں ہے کہ جو قوم کرسیوں اور جھوٹی عزتوں کیلئے اپنی حرمت و ناموس کی پروا نہیں کرتی اسکی تاریخ میں ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ وہ بھیک کے ٹھیکروں پر فخر کرتی ہے اور دوسروں کی گالیوں پر خوش ہو کر ناچتی ہے۔ پس کیا تم بھی اسی روزِ سعید کے منتظر ہو! اس دنیا کا ایک قانون ہے، جو ہے تو بہت پرانا مگر اب تمہارے لئے دنیا کی کونسی بات ہے جو نئی اور انوکھی نہیں ہوگئی ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ خدا جو کچھ ہمیں دیگا ہمارے عزم و حوصلہ کے پیمانہ سے ناپ کر دیگا۔ جب تم خدا کے کلمہ کے اعلاء کیلئے ہفت اقلیم کی بادشاہت کو بھی بالِ مگس کے برابر سمجھتے تھے اس وقت تمہارا رتبہ یہ ہوا کہ تمہارے ہاتھوں سے خدا نے اونٹوں کی مہار لی اور سارے عالم کی سیادت کی زمام دیدی اور اب کہ تمہیں غلام ہندستان کی کرسیاں تمہارے قبلہ اولی کی حفاظت و صیانت سے زیادہ عزیز ہوگئی ہیں، ایک دن آئیگا کہ تم اپنی بدبختی پر سر پیٹو گے اور کوئی نہ ہوگا جو تمہاری حالت پر دو آنسو بہادے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

ابھی کل کی بات ہے، لاہور میں حکومت ہند ایک مذبح بنوا رہی تھی۔ اور بالکل ٹھیک بنوا رہی تھی۔ ہندؤں کو اعتراض کا کوئی حق نہ تھا معاملہ کی مذہبی نوعیت یہ تھی کہ ہندوستان کی حکومت کو گائے کی عبادت سے

انکار ہے اور ہکی فوجی چھاؤنیوں میں گائے کا گوشت ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے اور برابر استعمال کیا جائیگا۔ اور اقتصادی حیثیت یہ تھی کہ یقیناً اس مذبح کی تعمیر سے گوناگوں فوائد تھے، حکومت کوئی مسرفانہ کارروائی نہیں کر رہی تھی لیکن مذبح کا نام سنتے ہی ہندو قوم کی پیشانی پر شکن پڑگئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ ہندوستان کی وہ حکومت جس کا حاکم نہ گھمنڈ جلیانوالہ باغ میں سیکڑوں ہندوستانیوں کے قتل عام سے بھی نہیں جھجکا، اس چین جبیں سے سہم گیا۔ اور ساری تجویز ختم کر دیگئی۔

اس واقعہ پر اگر غور کرو تو اس کے اندر عبرت و بصیرت کی اتنی داستانیں ہیں کہ بس یہی ایک واقعہ تمہاری آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ انگریزی حکومت وہی ہے جو آج سے دس برس پہلے تھی، دوسری نہیں ہوگئی ہے۔ لیکن کیا بات ہے کہ اب اپنی آن سے زیادہ اسکو اپنی محبوب رعایا کے جذبات کا احترام زیادہ عزیز ہوگیا ہے؟ اس ہندوستان کی پچھلی تاریخ کی بہت سے واقعات تمہیں یاد ہوں گے، جب حکومت کے ارادوں اور پبلک کے جذبات میں آویزشیں ہوئی ہیں، کیا اس سے پہلے بھی حکومتِ ہند کے آہنی ارادوں کی کیفیت اور پبلک کا یہی عالم تھا؟ پھر جو ارادہ اتنا سرکش اور تنک مزاج تھا، بتاؤ دفعتاً اسقدر حلیم اور بردبار کیوں ہوگیا؟۔

یہ اسلئے ہوا کہ ہندو قوم اب بالکل بدل چکی ہے۔ اس میں اب ایک زندہ اور حساس قوم کی صفات پیدا ہو چکی ہیں۔ وہ موحد نہیں ہے اور اس کا نصب العین بھی کچھ اونچا نہیں ہے، لیکن وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑ چکی ہے۔ اس میں "مادر وطن" کے لئے ایثار، قربانی، فدویت کے وہ عالی صفات و جذبات پیدا ہو چکے ہیں جو ہم میں خدا اور رسول کیلئے نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ وہ خود بدل گئے ہیں اسلئے اب دنیا بھی ان کیلئے بدل گئی ہے۔ اب انکی ہر چیز عزیز و محترم ہے اور ہماری ہر چیز بے وزن و بے قیمت۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

ایک دوست تحریر فرماتے ہیں۔

"پنجاب کے ایک معزز رسالے نے لکھا ہے "دھوپ کھانا"، غلط محاورہ ہے۔ مجھے بھی عرصہ سے یہ محاورہ کھٹک رہا تھا مرزا غالب سے بھی یہ غلطی ہوگئی ہے۔

آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

عزیز"

معارف قرآن

تفسیر سورہ عبس

(۲)

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ
ترجمہ امین احسن اصلاحی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

۵ مجاہد سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سرداران قریش میں سے کسی سے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے، آپ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ وہ قبول کرے گا کہ اسی بیچ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم پہنچ گئے۔ آنحضرت کی نظر پڑی تو آپ کو ان کا ایسے وقت میں آنا ناگوار ہوا کہ یہ قریشی کہے گا کہ محمدؐ کے پیرو اسی قسم کے اندھے بہرے، اور غریب و بے نوا لوگ ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

یہ تاویل حضرت مجاہد کی تاویل ہے۔ اور جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس واقعہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم و ارشاد کی درخواست کی اور آپ نے ان سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا اور اس قول کو وہ بعض اکابر سلف سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت کسی قریشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتومؓ نے پہنچکر درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ ان کی یہ بے موقع درخواست آپ کو ناگوار ہوئی اور یہ آیت اتری۔ بعض لوگ انہی حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مجلس میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے

صنادید شریک تھے۔ بعض لوگ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم عتبہ بن ربیعہ، عباس بن عبدالمطلب، ابوجہل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن ام مکتوم نے آکر درخواست پیش کی کہ علمنی مما علمک اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیے آپ کو ان کی یہ بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ بعض لوگ حضرت ضحاک سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت اشراف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتوم پہنچے اور انھوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ ایسے وقت میں آنحضرت صلعم کے پاس پہنچے کہ آپ عتبہ و شیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور روایت ابو مالک سے ہے کہ آپ کی گفتگو امیہ بن خلف سے تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔

ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب ایسے لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں جنہیں سے کوئی بھی شریک واقعہ نہ تھا۔ پس اگر ان کی صحت تسلیم بھی کرلی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہوگی، خبر کی نہ ہوگی۔ پھر ان میں باہمد گر اسقدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک تاویل اختراع کی اور جھٹ اس کے لئے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کردی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ باعتبار سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک بھی قابل اعتماد نہیں۔ اور قرآن مجید سے بوجوہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

(۱) آیت کے الفاظ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم نے نابینا کو دیکھکر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترش رو ہوئے (جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے) اور اگر آپ ایسا کرتے بھی تو ایک نابینا کو اس ترش روئی کا کیا احساس ہوتا! آپ کی آزردگی کا باعث محض ذکا آنا تھا کیونکہ اس سے ان سرکشوں کو موقع ملتا تھا کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ پر طعن کریں اور آپ کی مخالفت کا ایک بہانہ پیدا کریں۔ مکی زندگی میں

آنحضرت صلعم کی تمام دعوت کا تعلق، توحید، معاد اور رد شرک سے تھا اور یہ اس درجہ قطعی اور واضح مسائل تھے کہ مخالفین ان کے جواب میں معارضہ کا کوئی پہلو مشکل ہی سے پاتے اس لئے ہمیشہ اس گھات میں رہتے کہ اگر مجادلہ کا کوئی موقع نہیں ملتا تو استہزا و استخفاف ہی کا کوئی نکتہ ڈھونڈھ نکالیں اور یقیناً عبد اللہ بن ام مکتوم کے اس موقع پر آجانے سے ان کی یہ غرض پوری ہو رہی تھی۔

۲- (وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ) اس امر پر نہایت واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات بالکل نہیں معلوم تھی کہ نابینا کا آنا طلب علم اور حصول ہدایت کے لئے تھا۔ اگر یہ بات آپ کو معلوم ہوتی آپ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے کیونکہ طالب علم و ہدایت سے بڑھکر پیغمبر کو کوئی چیز محبوب نہیں ہو سکتی۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ کے اسلوب سے یہی بات ٹپکتی ہے۔ کیونکہ اس اسلوب کو اگر خوب پھیلا دو تو پوری بات گویا یوں ہو گی تم آزردہ ہوئے کہ اس کا آنا ایک ایسی حالت میں ہوا جو تمھیں ناپسند ہے حالانکہ تمھیں کیا خبر، ممکن ہے وہ اپنے ساتھ کوئی ایسا مقصد لے کر آیا ہو جسمیں تمھارے دل کی اصلی خوشی پوشیدہ ہو؛

غرض قرآن مجید سے یہ کسی طرح ثابت نہیں کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات معلوم تھی کہ نابینا کا آنا تعلیم و تذکر کے کسی دینی مقصد کیلئے ہے اور اس کے باوجود آپ نے ناخوشی کا اظہار کیا ہو۔

۳- [وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ] سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ تبلیغ و دعوت کے معاملہ میں آنحضرت صلعم نے انہماک کی غیر معتدل حالت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اس پر آپ کو ہدایت ہوئی کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کی بازپرس تم سے نہ ہو گی کہ خواہ مخواہ کو ان کے ایمان کے لئے تم ان کے پیچھے چمٹے رہو۔ اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ۔ تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنتَ بِمَلُومٍ ان سے اعراض کرو تم کو کوئی ملامت نہیں۔ فان تولوا فانما علیک البلاغ المبین اگر وہ اعراض کر جائیں تو کچھ غم نہیں تم پر تو صرف کھولکر

پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔

ان آیات کا حاصل مطلب سامنے رکھکر زیر بحث آیت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں باندازِ عتاب آنحضرت صلعم کے اس بوجھ کو ہلکا کیا گیا ہے جو تبلیغ و دعوت کے عشق میں آپ نے اپنے سر پر اٹھالیا تھا۔ یقیناً عتاب کا یہ انداز اس عتاب سے بالکل مختلف ہے۔ جو آنحضرت صلعم پر ہونا چاہئے تھا اگر آپ نے واقعۃً کسی کمزور مسلمان سے بربنائے استحقار اعراض کیا تھا۔ پھر اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى کے ٹکڑے سے واضح ہے کہ سرداروں اور اغنیا کے ساتھ آنحضرت صلعم کا یہ اعتنا محض عشقِ دعوت اور جوشِ تبلیغ کا نتیجہ تھا، یہ بات نہ تھی کہ آپ غربا کو حقیر سمجھتے رہے ہوں۔

(۴) ان آیات کے بعد والے ٹکڑے یعنی كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ میں اس امر کی کھلی ہوئی تعلیم ہے کہ آنحضرت صلعم ان لوگوں سے بالکل بے پروا ہو جائیں جو اللہ کی یاد سے بے پروا ہو گئے ہیں اور ان کی تالیف و دلجوئی کے لئے ہرگز اس قدر نیچے نہ اتریں جس قدر نیچے اترنا آپ نے گوارا فرمایا ہے۔ پھر فرمایا اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کی اس درجہ مشغولیت آپ کی اور کتاب الٰہی کی عظمت کے شایان شان نہیں ہے۔

۵۔ پھر اگر وہ تمام روایتیں تسلیم بھی کرلی جائیں جنمیں بیان کیا گیا ہے کہ ابن ام مکتوم قرآن مجید سیکھنے آئے تھے، یا کوئی مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے، یا طلب ہدایت کے لئے آئے تھے جب بھی یہاں کسی واقعی عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ آئندہ ہم اس کی مزید توضیح کریں گے۔

خلاصہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ ان آیات اور ان کے پیش و عقب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت صلعم کو استغنا اور شایان شان ترفع کی تعلیم دی گئی ہے اور نہایت بلیغ ترین اسلوب عتاب میں آپ کو تبلیغ و دعوت میں مفرط انہماک سے روکا گیا ہے۔ پھر اس میں آنحضرت صلعم کی دلداری، غربا کی دلجوئی اور اغنیا کی توبیخ کے نہایت لطیف پہلو ہیں جو آئندہ مباحث میں سامنے آئیں گے۔

پہلی غلطی سے بڑی غلطی

۶-صحیح تاویل کے واضح ہو جانے کے بعد ان باتوں کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے جو یکسر توہمات پر مبنی ہیں لیکن ہم ایک خاص امر کا ذکر یہاں ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ کمزور روایات پر اعتماد کرنے سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان سے کس درجہ احتیاط ضروری ہے۔

حضرت امام رازیؒ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ وہ اس بات کو تو سمجھ گئے کہ یہاں خفگی اور عتاب کا کوئی موقع نہیں تھا لیکن چونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرتؐ پر عتاب ہوا اسلئے ان کو فکر ہوئی کہ کسی نہ کسی شکل سے عتاب کا کوئی موقع پیدا کریں، چنانچہ انھوں نے پورے مقدمہ کو از سر نو مرتب کیا اور پھر جن نتائج تک پہنچے ان کی تفصیل سننے کے قابل ہے۔

وہ پہلے سوال قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آنحضرت صلعم پر عتاب کیوں فرمایا حالانکہ بوجوہ ذیل مستحق زجر و تنبیہ ابن ام مکتومؓ تھے۔

۱-مانا کہ ابن ام مکتوم نابینا تھے لیکن وہ سرداران قریش کے ساتھ آنحضرت صلعم کی گفتگو سن کر اس سے معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان کا بیچ میں مداخلت کرنا یقیناً آنحضرت صلعم کی ایذا کا باعث ہوا ہوگا اور یہ معصیت ہے۔

۲-یہ مسلم ہے کہ اس وقت جو اہمیت سرداران قریش کے معاملہ کو تھی وہ اہمیت ابن ام مکتوم کے معاملہ کو نہ تھی۔ ابن ام مکتومؓ بقدر ضرورت رسالت سے فیضیاب ہو چکے تھے اور یہ کفار ہنوز بالکل محروم تھے اس لئے ان سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے۔ پھر ان کے اسلام سے بہتوں کے قبول اسلام کی راہ باز ہوتی۔ پس ایسی حالت میں ابن ام مکتومؓ نے مداخلت کر کے اسلام کی ترقی کے ایک نہایت

مفید موقع کا خون کیا۔

۳- قرآن مجید میں وارد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَاءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں اکثر نا سمجھ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کو صحابہ کی تادیب و اصلاح کا اختیار حاصل تھا اور آپ بار بار مختلف امور پر صحابہ کو زجر و تنبیہ فرمایا کرتے تھے، پھر ایک ایسے امر پر آپ کیوں معتوب ہوئے جس کا آپ کو اختیار حاصل تھا۔

حضرت امام رازیؒ ابن ام مکتومؓ کے مستحق زجر و تنبیہ ہونے کے اتنے وجوہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اتنے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جواب کی تقریر یوں شروع کرتے ہیں۔

ان اشکالات کے دو جواب ہیں۔

اول یہ کہ اگرچہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی لیکن اس کی ظاہری شکل سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آنحضرت صلعم دولتمندوں کو غریبوں پر مقدم کرنا چاہتے ہیں اسلئے آپ پر عتاب ہوا۔

ہمارے نزدیک یہ وجہ ہر چند قبح سے خالی ہے لیکن ضعف سے محفوظ نہیں۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غیب کو جانتا ہے، اور اس کا عتاب ہمیشہ کسی بات سے روکنے کیلئے ہوتا ہے تو کیا یہاں پیغمبر صلعم کو صحابہ کی تنبیہ سے روکا گیا ہے، حالانکہ اس بات کی آپ کو اجازت حاصل تھی۔

امام رازیؒ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے فعل کے اس ظاہری نتیجہ پر عتاب نہ ہوا ہو بلکہ واقعتہً یہ بات ہوئی ہو کہ قرابت، شرافت، اور علوئے منصب کی وجہ سے آنحضرت صلعم کا دل ان سرداروں کی طرف مائل ہوگیا ہو اور ابن ام مکتومؓ چونکہ اندھے تھے اور رشتہ و قرابت کی کوئی وابستگی بھی آپ سے نہیں رکھتے تھے نیز شرف خاندانی کے اعتبار سے بھی فروتر تھے اس لئے ممکن ہے آپکے دل میں ان سے کچھ نفرت پیدا ہوگئی ہو۔ اور اس پر عتاب ہوا ہو۔

اس دوسرے جواب کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ حضرت امام رازی پر رحم

فرمائے، ام مکتوم ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی خالہ تھیں۔ اس تعلق کے بعد شرف و قرابت کی وہ کونسی بلندی باقی رہ گئی ہے جو ان کے بیٹے کو حاصل نہیں ہوگئی۔ پھر یہ کیسی دردانگیز بات ہوگی کہ ایک پیغمبر ایک شخص سے اس لئے نفرت کرے کہ وہ اندھا ہے۔ اندھے سے زیادہ ہمدردی و غمگساری کا حقدار کون ہے۔ اور اگر پیغمبر بھی اس سے نفرت کرے گا تو اس کی دلداری اور محبت کے لئے کون آئے گا! یہ بات تو ایک مومن کی شان سے بھی فروتر ہے۔ نبی اور رسول کا کیا ذکر!

غور کرو، معاملہ کی نوعیت کسقدر عجیب و غریب ہے۔ امام رازی پہلے وہلہ میں ٹھیک بات پاتے ہیں کہ یہاں آنحضرت صلعم پر عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن پھر ان کو تفسیر کی وہ تمام روایتیں یاد پڑجاتی ہیں جن میں آنحضرت کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بات بول اٹھتے ہیں جس کو سنکر آدمی کا کلیجہ کانپ اٹھے، انھوں نے اس بات کا تو خیال رکھا کہ اللہ تعالیٰ کو بے محل عتاب کا الزام سے بچالیں لیکن اس بات کو بالکل بھول گئے کہ ان کے جواب سے آنحضرت صلعم کے خلق عظیم کا دامن ایک نہایت سنگین الزام سے آلودہ ہورہا ہے۔

لیکن یہ ساری مشکلات تفسیری روایات کی پیدا کردہ ہیں۔ جن لوگوں کی نظر قرآن مجید کے سیاق و سباق اور آنحضرت صلعم کے حالات زندگی پر ہے ان کے نزدیک اس تاویل اور ان تمام ضعیف روایات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

ان آیات کا ربط آگے سے

ان آیات کے اندر آنحضرت صلعم کو آپ کے بلند منصب کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ آپ مغروروں اور سرکشوں کے ساتھ الحاح و اصرار کی ایسی شکل اختیار نہ کریں جو آپ کے رتبہ سے فروتر ہو۔ صرف مومنین کے ساتھ مشغول ہوں جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق ہیں۔ یہ مضمون متقضی ہوا کہ یہاں مختصراً اس چیز کی

رفعت شان بھی بیان کر دی جائے جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ تاکہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ ایسی اعز نامہ نعمت سے منہ پھیر رہے ہیں وہ اعراض ہی کے مستحق ہیں۔ فرمایا:۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۱۱) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۲) فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ
مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ (۱۴) بِاَيْدِىْ سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (۱۶) قُتِلَ
الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷) مِنْ اَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ (۱۸) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ
فَقَدَّرَهٗ (۱۹) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۲۰) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۲۱) ثُمَّ اِذَا
شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۲۲)

کچھ نہیں! یہ ایک یاد دلانا ہے (۱۱) سو جس کا جی چاہے اس کو یاد کرے (۱۲) قابل ادب، بلند اور پاک (وراق) میں (۱۳) (۱۴) ذی رتبہ۔ نیک۔ منشیوں کے ہاتھ میں (۱۵-۱۶) برا ہو آدمی کا یہ کتنا ناشکرا ہے (۱۷) اسے کس چیز سے بنایا (۱۸) ذرا سے پانی سے اسے بنایا تو اسمیں اندازہ رکھا (۱۹) پھر اسکی راہ اسے آسان کر دی (۲۰) پھر اسے مردہ کیا پھر اسے قبر میں رکھوایا (۲۱) پھر جب چاہے گا اسے اٹھائیگا (۲۲)

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

[كَلَّآ] تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے جو غیر معتدل حالت اختیار کر لی تھی، اور جس پر آپکو اوپر کی آیتیں تنبیہ فرمائی گئی، کلا اس کو مزید موکد کر رہا ہے۔ یعنی بے نیازی کی تعلیم کو یہ لفظ اور زیادہ زور قوت کے ساتھ نمایاں کر رہا ہے۔ اس کا پورا مضمون گویا یہ ہوگا کہ تمہیں ہرگز زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے ساتھ اس درجہ چپکو۔ بعد کے ٹکڑے سے اس کی پوری توضیح ہو جاتی ہے۔

[اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ] اوپر لفظ ذکریٰ گذر چکا ہے۔ ضمیر اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے مراد قرآن اور اس کی آیات ہیں۔ پہلے ذکریٰ کا لفظ تھا، بعد میں تذکرہ کا لفظ آیا ان دونوں کی رعایت تعقی

ہوتی کو ضمیر مؤنث کی لائی جائے۔ یہ جملہ دلیل کے موقع میں ہے۔ لفظ کلاّ میں تعلیم استغناکا جو مفہوم مضمر تھا، اس ٹکڑے نے اس کو کھول دیا۔

[فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ] یعنی جو یاددہانی تم ان کو سنا رہے ہو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔ یہاں چونکہ متبادر مفہوم کا خیال رکھا اسلئے ضمیر مذکر کی لائے۔ کیونکہ بادل وہلہ ذہن قرآن کی طرف منتقل ہوتا ہے یہ جملہ "انہا تذکرہ" کی تشریح کر رہا ہے یعنی قرآن محض ایک یاددہانی اور پیام ہے جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے، جس کا جی چاہے انکار کردے۔ اکراہ یا اصرار والحاح کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اس جملہ میں نہایت ایجاز ہے۔ بات کا صرف ایک حصہ مذکور ہوا ہے، مقابل کا دوسرا حصہ حذف کردیا گیا ہو کیونکہ مذکورہ حصہ خود محذوف کو واضح کر رہا ہے۔ اگر اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوئی، سو جس کا جی چاہے یاد کرے اور جس کا جی چاہے نہ یاد کرے، بعض مواقع پہ اسی مضمون کی تشریح ہوگئی ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

[صحف] جمع ہے صحیفہ کی۔ صحیفہ کے معنی ہیں لکھا ہوا ورق۔ صحیفہ المتلمس، صحیفہ الجور، وغیرہ نام اسی معنی کے اعتبار سے پڑے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ صفیحہ سے مقلوب ہو۔ صفیحہ چوڑی چکلی چیز کو کہتے ہیں۔ صفیحۃ الحجر، صفیحۃ السلف، صفیحۃ العنق نہایت مشہور استعمالات ہیں۔ لفظ اپنی جمع کی صورت میں بعض اوقات کتاب کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فی صحف، دراصل ھو فی صحف ہو۔ اوپر جس شے کا ذکر ہوا تھا اب اسکے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ اوصاف مابعد کے بیان میں مسند الیہ کا حذف ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ کسی مقام پر ہم اس مسئلہ کو واضح کر چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور ہم نے جو تاویل بیان کی ہے۔ قرآن کی ان صفتوں پر غور کرو۔ ان کے

بعینہ وہی حقیقت بول رہی ہے۔ یعنی یہ قرآن جو اپنے رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے، اس کو اس اصرار و الحاح کے ساتھ پیش کرنا ہرگز اس کے شایان شان نہیں ہے۔ پس آنحضرت صلعم کو جو استغنا کی تعلیم دی گئی تھی، قرآن کی ان صفات نے اس کی دلیل بیان کردی۔

[مَرْفُوْعَةٍ] اس لفظ میں بلندی اور درجہ دونوں کا مضمون پنہاں ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تشریح ہوگئی ہے۔ مثلاً وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ۔ دوسری جگہ فرمایا وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ اور یہ دونوں مضمون درحقیقت "مکرمہ" ہی کی تشریح ہیں۔

[مُطَهَّرَةٍ] یہ صفت بھی درحقیقت صفت تکریم ہی کے ایک پہلو کو واضح کر رہی ہے یعنی قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کے دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا ہے۔ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ لَّا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ ایک اور مقام میں ہے بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ اور جہاں جہاں قرآن مجید کو "کتاب عزیز" کہا ہے اس میں بھی عموماً اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

[سفرة] سافر کی جمع ہے، بمعنی قاری و کاتب۔ سفر کے معنی قرأت و کتابت کے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی زبان میں باقی ہے۔ اس کے اصل معنی زخم لگانے کے ہیں۔ اسی سے کتابت کا مفہوم پیدا ہوگیا کیونکہ ابتدا میں جب کوئی چیز لکھنا چاہتے تو آہنی قلم سے اس کو کسی چیز پر کھودتے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ قرأت و بیان کے معنوں کے لئے وسیع ہوگیا۔ عبرانی میں ספר (سفر) قرأت و کتابت اور زخم لگانے کے معنی میں موجود ہے اور ספר

فر) کاتب، فقیہ، امام اور قاری کے معنوں میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت قتادہ کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ سفرہ سے مراد قراء ہیں نیز حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ سفرہ نبطی میں قراء کو کہتے ہیں۔ زخم لگانے کے معنی میں ہماری عربی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ رؤبہ کا مصرع ہے۔

تسفیر موسی الصلیع الجلام

اسی طرح کتب کا مادہ عربی زبان میں اپنے اصل معنی میں باقی رہ گیا ہے۔

[کرام] یعنی اس امانت کے لئے پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔ ان کی شرافت کی وجہ سے ان پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

[بررۃ] بار کی جمع ہے۔ بار اس شخص کو کہتے ہیں جو فرمانبردار اور اپنی ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک پورا کرنے والا ہو۔ اس صفت نے ان کی امانت داری کے وصف کو اور زیادہ نمایاں کر دیا۔ اس مضمون کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات اشارہ کر رہی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ، دوسرے مقام پر ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ، ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔

ان آیتوں کا مفاد قرآن مجید کی عظمت و شان کو بیان کرنا ہے کہ اس قدر بلند رتبہ اور اشرف چیز اس لئے نہیں ہے کہ اس الحاح و اصرار کے ساتھ ان لوگوں پر پیش کی جائے اور یہ لوگ اس سے اعراض کریں۔

علاوہ ازیں ان آیات سے قرآن مجید کی بعض نہایت اہم صفتیں روشنی میں آگئی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا ہوا ہے۔ پڑھا جاتا ہے، ہر طرح کے اختلاط و امتزاج سے بالکل پاک ہے۔

ہاں ایک خاص بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہاں رفع، تطہیر اور صحیفہ وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ تمام تر ایسے حقائق کی تعبیر کے لئے اختیار کئے گئے ہیں جن کا تعلق

ملأ اعلیٰ سے ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف مفاد اور نتیجہ ہے باقی رہی ان کی اصلی تاویل تو یہ چیز اس مقام کے احوال و معاملات کے شایان شان ہوگی۔

[قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ] الانسان کے لفظ سے عموماً انسانوں کا غالب حصہ مراد ہوتا ہے یعنی کفار۔ پس یا تو لام عہد کا ہوتا ہے یا یہ ہوتا ہے کہ بلحاظ اکثریت پوری نوع پر ایک حکم لگا دیتے ہیں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ (قتل) اصل حقیقت سے ہٹکر محض اظہار غضب کے لئے استعمال ہوا ہے (مَآ اَكْفَرَهٗ) میں اس غضب کا سبب بیان ہوا ہے اور انسان کی اس روش پر اظہار نفرت ہے۔

[مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ] یہ استفہام تحقیر کے لئے ہے۔ اس کے بعد انسان کی حالت بیان ہوئی ہے، یہ ٹکڑا اس کی تمہید ہے۔

[نطفة] تھوڑا سا نچڑا ہوا پانی۔ ابو صعترہ بولانی کا شعر ہے۔

فما نطفة من حب مزن تقاذفت به جنبتا الجودی واللیل دامس

قرآن مجید میں ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۔ اس لفظ کی حقیقت پر غور کرو اور دیکھو بعث کے بارہ میں جو استبعاد لوگوں کو نظر آتا تھا اس کو اس نے کس طرح دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے صاف واضح ہے کہ انسان کی ابتدائی خلقت ہی اس طور پر ہے کہ اس کا مادہ مختلف گوشوں سے نچوڑ نچوڑ کر جمع کیا گیا ہے۔ پھر جب ایک بات زندگی کے ایک مرحلہ میں ممکن ہوئی تو وہی بات دوسرے مرحلہ میں کیوں ناممکن ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کو سمجھانے کیلئے قرآن مجید نے ایک جگہ نہایت لطیف اشارہ کیا ہے وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ اور تم اپنی پیدائش کا حال جان چکے ہو تو اس سے کیوں نہیں سبق حاصل کرتے۔

[قَدَّرَهٗ] یعنی اسکے اعضا اور قویٰ کے لئے اپنی مرضی کے مطابق ایک اندازہ ٹھہرایا۔ اس سے

مقصود انسان کے عجز و درماندگی اور خدا کے کمال تصرف و اقتدار کا اظہار ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے فِيٓ أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ اس میں اپنے کمال تصرف و احاطہ کے علاوہ اپنے مخصوص فضل و احسان کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس نے اپنے حسن تقدیر سے انسان کو اپنی بہترین مخلوق بنایا۔ ایک آیت نے اس مضمون کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ صَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ۔ یہاں اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، تفسیر سورۂ تین میں اس کی تفصیلات ملیں گی۔

[السبیل] اس میں الف لام عہد کے لئے ہے۔ یعنی وہ راستہ جس میں انسان اپنے اعضاء و قویٰ کی مدد و رہنمائی سے گامزن ہوتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے کہ اس نے اعضاء و قویٰ عنایت کئے اور پھر ان کے استعمال کرنے اور برتنے کا ڈھنگ بتایا۔ اور اس کیلئے تمام اسباب و وسائل فراہم کر دیئے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ، وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ، جس نے خلق کیا پھر تسویہ کیا اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر اس کی طرف رہنمائی کی۔ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيٓ أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ۔ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر رہنمائی کی۔ اور یہ بات قرآن مجید نیز اصول فطرت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے خیر و شر دونوں کی راہیں کھول دی ہیں اور دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے عقل و بصیرت بخش دی ہے، پس اب جس کو چاہے، اختیار کر لے۔ وہ ان میں سے کسی راہ پر مجبور نہیں کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

فَجَعَلْنَٰهُ سَمِيعًۢا بَصِيرًا	پس ہم نے اس کو سمیع و بصیر بنایا۔
إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا	بیشک ہم نے اسکو ہدایت کی راہ کی سوجھ بخشی ہے
شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا	(یہاں راستے سے مراد خیر کا راستہ ہے) اب چاہے وہ

دوسری جگہ فرمایا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا — اور دل اور جیسا اس کو بنایا، پس اسکو

فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ — سمجھ دی بدی اور نیکی کی کامیاب ہوا جس نے

مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (شمس) — اسے صاف کیا اور ناکام ہوا جس نے اسے

قرآن مجید، اور عقل ونقل کی تمام شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ تیسیر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند سے اپنے لئے جو راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس راہ کو آسان کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ — سو جس نے سخاوت کی اور ڈر ڈر چلا اور

بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى — اچھی بات کو سچ مانا، اس پر ہم سہج کر دینگے

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَ — آرام دینے والی اور جس نے بخالت کی اور بے

كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (لیل) — پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس پر

پس اس مقام پر تاویل یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اسکو برائی اور بھلائی کی تمیز دی اور اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان دونوں راہوں میں سے جس راہ کو چاہے اپنے لئے پسند کرے۔ ان میں سے کسی راہ پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ اور اس کے تمام اعضا و قویٰ اور اسباب کو اس کے ارادے کے ماتحت کیا، ان میں سے کسی چیز کو اس کے ارادہ پر حاکم نہیں بنایا۔ اور یہ وہ سب سے بڑی نعمت و سرفرازی ہے جو انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے حاصل ہوئی۔ اس کی پوری تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

[فَاَقْبَرَهٗ] قبرہ کے معنی ہیں اس کو دفن کر دیا۔ اور اقبرہ کے معنی ہیں اس کے لئے قبر بنائی۔

[اَنْشَرَهٗ] کھول دیا۔ پھیلا دیا۔ چھینٹ دیا۔ باب افعال مبالغہ کے مفہوم کے لئے بھی آتا ہے۔

یہاں مطلب ہوگا کہ دفن ہو جانے اور سڑ گل جانے کے بعد اس کو سیدھا اٹھا کھڑا کرے گا۔ (باقی)

تدبر قرآن

(۴)

امین احسن اصلاحی

ن کے داخلی
جی وسائل

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق ارادہ اور نیت کی تصحیح اور غایت و مقصد کی پاکی اور طہارت سے تھا جس طرح نماز کے لئے وضو اور نیت کا اخلاص و تزکیہ ہے، اسی طرح قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے شرط ہے کہ طالب دل کی سچی پاکی اور ارادہ کی بے لوث ت کے ساتھ اس کی طرف بڑھے۔ بغیر اس کے قرآن کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ یہ شرطیں خود قرآن مجید ن کی ہیں اور قرنوں کا تجربہ اس حقیقت کی تصدیق کر رہا ہے اور یہ اس درجہ واضح امر ہے کہ سلف میں ، لوگوں نے بھی مفسر کی ضروری خصوصیات کی تفصیل کرنی چاہی، انھوں نے سب سے پہلے اسی مقدمے کا

اس کے بعد قرآن مجید کے فہم و تدبر کے داخلی اور خارجی اسباب و وسائل کا سوال سامنے آتا ہے۔ یک تو یہ بات کہ قرآن مجید کو کس طرح پڑھنا چاہئے، کتنی مقدار میں پڑھنا چاہئے، کیا کیا ترتیبیں پیش ی چاہئیں، نظم کو کس طرح پکڑنا چاہئے، معانی کو کس طرح سلجھانا چاہئے، مشکلات میں کس طرح جمنا ہ، پھیلے ہوئے خیالات کو کس طرح سمیٹنا چاہئے، سمٹے ہوئے خیالات کو کس طرح پھیلانا چاہئے، یعنی ل یہ بات کہ قرآن کی مشکلات میں خود قرآن مجید کی رہنمائی سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے اور ری یہ بات کہ قرآن مجید سے باہر کیا کیا چیزیں ہیں جو قرآن کے فہم و تدبر میں ہماری مدد کر سکتی ہیں ن سے کن شکلوں میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ان میں سے پہلے سوال کا تعلق زیادہ تر نظم قرآن کے ابواب و مباحث سے ہے اس لئے ہم اس پر عنقریب ایک دوسرے سلسلہ مضامین میں، جو عرصے سے پیش نظر ہے، غور کریں گے۔ یہاں صرف پہلے سوال کی ایک اہم اصل اور دوسرے سوال کے بعض ضروری امور کی طرف بالاجمال اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے اصلی چیز خود قرآن مجید ہی ہے۔ اس لئے طالب کو چاہئے کہ وہ تمام مشکلات میں پہلے قرآن مجید ہی کی رہنمائی ڈھونڈھے۔ سلف کا مسلم مذہب یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً اور قرآن نے خود اپنی صفت "کتاباً متشابہاً" بیان کی ہے، نیز بعض مواقع پر اس امر کی بھی تشریح ہے کہ جس طرح وحی و تنزیل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اسی طرح اس کے بیان و تفصیل کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ ہر چند یہ بات اصول کی حیثیت سے ہر دور میں ارباب تاویل کے پیش نظر رہی، لیکن یہ بات کہ عالم کیونکر ہے، کبھی تفصیل و وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے نہیں آئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عموماً ارباب تفسیر کو یہ راہ نہایت دشوار نظر آئی اور وہ بعض ایسی وادیوں میں نکل گئے جو فہم قرآن سے نہایت دور کرنیوالی تھیں۔ حالانکہ فہم قرآن کی کلید خود قرآن ہی ہے۔ وہ اپنے تمام اجمالات کی خود تشریح کرتا ہے، اپنے مفہوم و معنی کی تعیین، اپنے مقاصد و مطالب کی تفسیر اور اپنے نکات و دقائق کی تشریح کیلئے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ بلاغت قرآن کا یہ ایک عجیب اعجاز ہے اور یقیناً اس آسمان کے نیچے صرف اسی کتاب عزیز کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے اکثر مشکل الفاظ اور دقیق اسالیب کے حل کے لئے اپنے اندر اشباہ و نظائر کا ایک قیمتی ذخیرہ بھی رکھتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں مثالوں کی تفصیل میں پڑنے کی گنجائش نہیں ورنہ ہم دکھاتے کہ کس طرح قرآن مجید عام عام بول چال کے اندر سے ایک معمولی لفظ اٹھا لیتا ہے اور اس کو اس کے معروف و متداول استعمال سے کہیں زیادہ ارفع و بلند معنی میں استعمال کرتا ہے اور پھر اپنے طریق استعمال کے تنوع سے اس کے لئے ایک ایسا مخصوص ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لسان اور صحاح جوہری کی رہنمائی کے بغیر قرآن کا ایک طالب، جس نے قرآن کی ممارست کی ہے اس لفظ کے پورے مالہ و ماعلیہ کو اسطرح سمجھ لیتا ہے کہ

کوئی چیز بھی اس کے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی۔ مفردات کے علاوہ اسالیب کلام اور نحوی تالیف وغیرہ کے باب میں بھی قرآن مجید کا یہی حال ہے۔ ارباب نحو قرآن مجید کی جن ترکیبوں میں نہایت الجھے ہیں اور کسی طرح ان کو نہیں سلجھا سکے ہیں، خود قرآن مجید میں ان کی مثالیں ڈھونڈھو تو ایک سے زیادہ مل جائینگی اور پیش و عقب کے ایسے دلائل و قرائن کے ساتھ کہ ان کے بارہ میں تمھارے اطمینان کو کوئی چیز مجروح نہیں کرسکتی۔ باقی رہیں قرآن مجید کی تلمیحات، اس کے تاریخی اشارات، اس کی مخفی تلمیحات تو یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کے باب میں ہر گروہ نے القرآن یفسر بعضہ بعضا کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ اس باب میں لوگوں سے جو کچھ کوتاہی ہوئی وہ صرف اسقدر ہے کہ پوری تدقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ جتنا اگلوں نے کیا لوگ اسی پر قانع ہوگئے، حالانکہ اس میں بہت وسعت ہے اور قرآن مجید کے شواہد اسقدر متنوع اور مختلف شکلوں میں اور اسقدر کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ ہر بات کو واضح کردینے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ پس جو لوگ قرآن مجید پر تدبر کرنا چاہیں ان کو چاہیے کہ وہ قرآن مجید ہی کو مضبوط پکڑیں اور اس کی ہر مشکل کو خود اسی کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کریں لیکن اس کا ایک مخصوص ضابطہ ہے جس پر ہم ان شاء اللہ کسی صحبت میں مفصل بحث کریں گے۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ تفسیروں کی مدد سے شروع کیا جائے اس راہ میں طرح طرح کے خطرے ہیں۔ ہم تفسیروں کی حالت پر ان صفحات میں بحث کرچکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس جو تفسیریں ہیں وہ دو ہی قسم کی ہیں۔ یا تو وہ کسی خاص اسکول کی ترجمانی کر رہی ہیں یا روایات اور اقوال سلف کے تمام رطب و یابس کا مجموعہ ہیں اور ایک تحقیقی طالب کی راہ میں یہ دونوں چیزیں روک ہوسکتی ہیں۔ طالب جب ان کے چکر میں پھنس جاتا ہے، اس کی جستجو اور تحقیق کی روح طبعی نہیں رہ جاتی، مصنوعی اور غیر طبعی ہوجاتی ہے۔ وہ اس راہ پر پڑ جانے کے بعد قرآن کے لفظوں کی رہنمائی سے محروم اور اس کا مذاق آہستہ آہستہ دوسروں کے خیالات و افکار سے مغلوب ہوجاتا ہے۔ پس صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے، صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے، اس کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے۔ ٹھیک مفہوم

متعین کرے، طبیعت میں جو سوال پیدا ہو، اس پر بار بار غور کرے، جو بات سمجھ میں آئے اس کے امثال و شواہد تلاش کرے، سیاق و سباق سے اس کی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع و محل دیکھے، عمود کلام کے پہلو سے اس کی مناسبت کو جانچے، پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک وارد کرے اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے، اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے، تب تفسیروں میں اس کو دیکھے اور ہمیشہ روایات صحیحہ پر نگاہ رکھے، ضعیف اور کمزور روایات جن سے کتب تفسیر بھری ہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ انشاء اللہ روایات صحیحہ سے اس کی تائید ہوگی اور اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی، اعتماد اور عشق و محبت قرآن کی نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ممزوج ہوں گی۔

لیکن فرض کرو، یہ سب جتن کرنے کے بعد تم کسی آیت کے باب میں ایک نتیجہ تک پہنچے اور جب کتب تفسیر کی مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ اور اقوال سلف تمہارے قرار دادہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی قابل اعتنا تائید بھی تمہارے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کرو گے؟ روایات اور اقوال سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جاؤ گے؟ نہیں۔ طالب کی راہ یہ نہیں ہے۔ اب تم ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کرو گے، اور اگر دقیقہ سنجی سے کام لو گے تو تم پر (اگر تم غلطی پر ہو گے) تمہاری غلطی خود واضح ہو جائے گی۔ لیکن فرض کرو، تم نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر تم کو اپنی ہی تاویل واضح معلوم ہوتی ہے۔ اب کیا کرو گے؟ اب خود حدیث پر غور کرو گے، اس کو ہر پہلو سے پرکھو گے، ہر کسوٹی پر جانچو گے، انشاء اللہ یہ چیز تمہارے لئے مفید ہوگی۔ یا تمہاری تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا، یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائیگی، لیکن طالب کے لئے یہ مرحلے نہایت سخت ہیں۔ ان میں صبر و ثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ عجلت اور تیز گامی اس منزل میں معصیت ہے۔ ان مواقع پر عرصہ تک توقف کرنا چاہئے، تحقیق و کاوش جاری رکھنی چاہئے۔ ارباب علم سے مشورہ کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے، اور جب قلب پوری طرح سے ایک بات کیلئے کھل جائے، کسی طرح کی کوئی خلش باقی نہ رہ جائے تو اس بات کو اختیار کر لینا چاہئے اور پھر اس امر کی اصلاح را

نہ کرنی چاہئے کہ کوئی چیز اس کے خلاف ہے۔

ہم نے روایات صحیحہ اور اقوال سلف کی افادی حیثیت پر اپنے مضمون تیسیر قرآن میں ایک فصل لکھی ہے، یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو پڑھ لو۔ ہمارا خیال ہے کہ جن لوگوں کے اندر تحقیق وکاوش کا ذوق ہے، اور جہل وغباوت نے ان کے قلوب مردہ نہیں کر دیئے ہیں، وہ اعتراف کریں گے کہ ایک طالب قرآن کو اس کی طلب وتجسّس کی راہ میں جو رہنمائی ان سے ملتی ہے، وہ اور کسی چیز سے نہیں ملتی، پس جو لوگ ان سے مستغنی ہو جائیں گے وہ قرآن کے طالب نہیں ہیں، اپنی خواہشوں کے پرستار ہیں۔

اس طریقہ فکر ونظر کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، یہ اس کی تحقیق وکاوش کا ثمرہ ہوتا ہے اور ہمارے دل کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کمائی کو بہت عزیز رکھتا ہے، اس کی محبت اس کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہو جاتی ہے اور اس کی حفاظت کی راہ میں وہ کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ گویا اصلی ایمانی کیفیت جو قرآن کی اصلی منزل مقصود ہے اسی طریقہ فکر ونظر سے ملتی ہے۔ پھر اس سے طالب کے زاویہ نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ٹھوکریں کھا کر اور سختیاں جھیل کر فکر وتدبر کے میدان کا آزمودہ کار سپاہی بنجاتا ہے اور تحقیق وکاوش کے مورچوں پر بددل اور پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ گھسنے کی تمام راہوں اور نکلنے کے تمام منافذ کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کی ایک راہ بند کر دو، دوسری راہ کھول لے گا، ایک دروازہ نہیں کھلے گا، دوسرے دروازہ پر دستک دے گا۔ اس طرح درجہ بدرجہ وہ اپنی منزلیں طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچ جائے گا جو حکمت اور معارف نبوت کی اصلی جلوہ گاہ ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی معلومات تمہاری معلومات سے بالکل مختلف ہونگی، تم جس چیز کو معبود بنا کر پوجتے ہو اس کو وہ بال مگس کے برابر بھی وقعت نہ دیگا اور جسکو پتھر سمجھکر ٹھکرا دوگے اسکو وہ حرز جاں بنا کر گرہ کرے گا۔ یہ اس لئے کہ تمہارے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے پاس بیشمار تجربات کی رہنمائی ہے، وہ اس سمندر کے عجائب سے واقف ہے۔ تم اس منزل کے رسم وراہ سے واقف نہیں ہو تو خاموش رہو بلکہ اپنی محرومیوں پر افسوس کرو، مگر تم کو ہنسنے سے بھی کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ تم

یا تو اقوال کے غلام ہو یا خواہشوں کے اور تحقیق کی راہ ان دونوں سے الگ ہے۔

قرآن مجید کے تدبر میں عہد نزول قرآن اور قدیم عرب اور ان سے متعلق اقوام کی تاریخ بھی ایک ضروری عنصر ہے۔ قرآن کی بے شمار آیتیں عرب کی قدیم تاریخ اور اس سے متعلق اقوام و جماعات کے احوال و ایام کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بالعموم یہ اشارات اس درجہ مجمل و مبہم ہیں کہ ان کا صحیح تصور ذہن میں قائم ہونا مشکل ہوتا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید کی تعلیمات کے سمجھ لینے میں یہ ابہام و اجمال مانع نہیں ہے لیکن ان اشارات کے صحیح تصور سے کلام کی تاثیر میں ایسا اہم اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس سے اغماض نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کی جن سورتوں کو سنکر عہد نزول قرآن میں ایک عرب بے خود ہو جاتا ہو تمہارے لئے بالکل بے اثر ہو جائے۔ پھر قرآن مجید کی تاریخ پر پوری ۱۳ صدیاں گزر چکی ہیں اور ہم کو موجودہ دنیا کے سامنے اس کو پیش کرنا ہے۔ عہد نزول میں جو واقعات و احوال ہر شخص کے جانے بوجھے ہوئے تھے، موجودہ دنیا کے لئے بالکل نامعلوم ہیں۔ اور علم و تحقیق کی ترقیوں نے کسی امر کے رد و قبول کا معیار اسقدر بلند کر دیا ہے کہ جب تک اس عہد کی پوری دنیا اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ سامنے نہ آجائے لوگوں کے لئے کسی بات کو باور کرنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں اس عہد کی تاریخ کی بے شمار چیزیں ہم کو اس لئے بھی معلوم ہونی چاہئیں کہ بغیر ان کو سمجھے ہوئے قرآن مجید کی تعلیمات کا اصلی وزن نہیں معلوم ہو سکتا مثلاً اس عہد کی تمدنی حالت، سیاسی رجحانات، مذہبی عقائد و تصورات، اخلاقی معیار، مختلف قوموں کے باہمی تعلقات، دستور و مراسم، اصنام و انصاب اور ان کے سیاسی و تمدنی اثرات وغیرہ وغیرہ۔ قرآن مجید پر غور کرنے والوں کو، اگر فکر و نظر صحیح نہج پر ہے، ان امور کے متعلق طرح طرح کی کاوشیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک تفسیر بھی ایسی نہیں ہے جو ان چیزوں کے متعلق کوئی رہنمائی کرے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ عرب کی تاریخ سے متعلق ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ نہایت مسخ شدہ ہیں اور ان سے بجائے اس کے کہ کوئی فائدہ پہنچے، نہایت شدید نقصان پہنچتا ہے۔ پس اس معاملہ میں بھی صحیح مسلک یہی ہے کہ

ن مجید ہی کو بنایا جائے اور تاریخوں کی پیش کردہ معلومات پر قرآن کی روشنی میں غور کرکے
صہ کو اختیار کیا جائے جتنا قرآن مجید سے موافق پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں استاذ امام کے
اندازہ کرنے کے لئے سورہ فیل کی تفسیر پڑھنی چاہئے۔ ان کا اصلی اعتماد قرآن مجید کے اشارات
پر ہوتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس باب میں دو چیزوں کے سوا کسی تیسری چیز سے شکل
و ملتی ہے۔

ا مجید کی زبان اور اس کے اسالیب کی مشکلات حل کرنے اور اس کے محاسن بے نقاب
طرح کی چیزیں مدد دے سکتی ہیں۔

کتب لغت

کتب نحو

کتب بلاغت

لغت میں نسبتاً لسان سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ جامع ہے۔
قال و قیل اس میں یکجا مل جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے الفاظ کے بارہ میں عموماً ارباب تاویل
ں کر دیتا ہے اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ مراجعت کا اصلی فائدہ فوت ہو جاتا ہے۔
لوگ مفردات امام راغب کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ بے شبہ یہ ایک کارآمد چیز ہے اور
قابل قدر کہ خالص قرآن کا لغت ہے لیکن حل مشکلات کے اعتبار سے اس کا کوئی وزن
ن مبتدیوں کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کا نہج صحیح ہے لیکن نہ تو اس میں
تقصاء ہے نہ شہادات کلام عرب اور نظیران کے فائدہ معلوم!

یزیں جن کی ایک طالب کو ضرورت پڑتی ہے یہ ہیں کہ ایک لفظ کے صحیح حدود و اطراف
ا عربی ہے یا مولد، پھر اس کے اصلی معنی کیا ہیں اور اس کے معانی میں سے کس پر اس کا

اطلاق حقیقۃً ہے اور کن پر بطریق مجاز۔ لیکن یہ باتیں لغتوں سے مشکل ہی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی لغت بھی کارآمد نہیں ہے۔ کہیں کہیں صحاح جوہری میں بعض چیزوں کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ مگر بہت کم۔

پس قابل اعتماد چیز اس باب میں بھی کلام عرب ہی ہے۔ لفظ کے اصلی حقایق اسی سے کھلتے ہیں پھر اسالیب کلام کا معاملہ تو سرتاسر اسی سے متعلق ہے۔ لغت سے ان کے باب میں کوئی رہبری نہیں ہوتی۔ لیکن کلام عرب میں بھی اصلی اور منحول دونوں ہیں۔ آدمی کو ایک عرصہ تک ممارست کے بعد، اگر ذوق اچھا ہو۔ اصلی و نقلی کے مابین امتیاز ہوتا ہے اور یہ شے ضروری ہے ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بالکل شاذ معنی کو اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً بعض لوگوں نے تمنی کے معنی تلاوت کے یا نحر کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے لے لئے۔ اسکی مثال تفسیروں میں بہت ملتی ہے۔

استاذ امام کا تمام تر اعتماد کلام عرب پر تھا۔ وہ جس لفظ یا اسلوب کے بارہ میں متردد ہوتے اس کو صرف قرآن مجید اور کلام عرب میں ڈھونڈتے۔ بعض الفاظ و اسالیب کی تلاش میں انھوں نے مدتیں صرف کر دیں۔ ان کی کتاب الاسالیب اور مفردات میں اس سلسلہ کے تمام مرکے ملیں گے۔ غُثاءً احوی میں لفظ غثاء کے باب میں خود فرماتے تھے کہ میں نے برسوں صرف کر دیئے۔ اس لفظ کے بارہ میں ان کو تمام اہل لغت اور ارب تفسیر سے اختلاف تھا۔ ایک مدت تک وہ اس کی تحقیق میں کلام عرب کا ذخیرہ چھانتے رہے۔ اور فرماتے تھے کہ جس روز میری تحقیق مکمل ہوئی مجھے وہ خوشی حاصل ہوئی جو بادشاہوں کو ملکوں کی تسخیر میں بھی نہیں ہوتی ہے۔

کتب نحو کا معاملہ کتب لغت سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ یہ لوگ قرآن کی نحوی مشکلات کو بالعموم شواذ کے سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن عرب کے سب سے زیادہ معروف اسلوب پر اترا ہے۔ ارباب تفسیر میں سے زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کے سوا اور لوگوں نے اس پتھر کو اٹھنے کی

بہت کم کوشش کی، اور یہ کام تنہا ایک شخص کے بس کا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں اس باب کی مشکلات حل کرنے کیلئے ہم کوئی قیمتی رہنمائی نہیں ملتی۔ اور چونکہ اپنے اندر مزید کاوش و تحقیق کی ہمت بھی نہیں پاتے اسلئے مجبور ہیں کہ ارباب نحو نے جو اصول بیان کر دیئے ہیں انہی پر اعتماد کریں اور کسی نہ کسی طرح قرآن مجید کو انہی کے مطابق ثابت کر دکھائیں۔ حالانکہ اسکی وجہ سے تاویل کی بے شمار لاینحل مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ پس قرآن کے طلبہ کو چاہئے کہ نحوی مشکلات میں کلام عرب پر اعتماد کریں تاکہ ایک طرف صحیح تاویل کی راہ کھلے دوسری طرف دنیا پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ درحقیقت قرآن ہی کا اسلوب اعلیٰ اور معروف اسلوب ہے۔ استاذ امام کے مطبوعہ رسائل میں ان کے طریق تحقیق کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور آئندہ ان کی دوسری تصنیفات میں بھی انکی کاوشیں ملیں گی۔ انکی رہنمائی سے اس سلسلہ میں بہت کچھ خدمت انجام دیجا سکتی ہے۔

فن بلاغت کی نارسائیوں کا حال سب سے زیادہ یاس انگیز ہے۔ ارباب بلاغت کا تمامتر ماخذ شعراء کا کلام ہے۔ اور شعر کی تنگ دامانیوں کا حال معلوم۔ اسلئے انکی تمام جولانیاں ورد و بست کی نزاکتوں، الفاظ کے حسن و قبح اور بدیع کی گلکاریوں تک محدود رہ گئیں۔ باقی یہ باتیں کہ حسن استدلال کے کیا کیا پہلو ہیں، ربط معنی کی کیا کیا ادائیں ہیں، امثال و قصص سے عبرت پذیری کے کیا کیا اطوار ہیں، کلام کس کس طرح چلتا ہے کس کس طرح اپنے مرکز اور عمود کی طرف مڑتا ہے، تہدید و زجر کے کیا کیا اسلوب ہیں، متکلم اپنی شدت یقین کو کس طرح ظاہر کرتا ہے، مترفعانہ اعراض کے کیا کیا ڈھب اختیار کرتا ہے۔ ایک شفیق معلم کن کن شکلوں میں حسرت کرتا ہے۔ عتاب میں محبت کی دلنوازیاں کس طرح ہوتی ہیں، خطاب کے عجائب تصرفات کا کیا عالم ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث سے ہمارا تمام دفتر بلاغت بالکل خالی ہے۔ یہ چیزیں خطباء کے کلام میں مل سکتی تھیں یا وحی الٰہی میں، خطباء کا کلام ملا نہیں، اور وحی الٰہی کو لوگوں نے ماخذ نہیں بنایا۔ اس سلسلہ میں باقلانی رحمہ اللہ کی کوشش قابل قدر ہے لیکن وہ بھی مجبور ہوئے کہ اصول کے استنباط کے لئے شعروں ہی کو ماخذ قرار دیں، خطباء کے کلام کی طرف اولاً تو پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے اور ہوئے تو محض اسقدر کہ انکے کچھ سرسری نمونے پیش کر کے گذر گئے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات میں بعض جواہر ریزے ملتے ہیں لیکن کاوش اور تلاش کی ضرورت ہے۔ استاذ امام کی جمہرۃ البلاغہ شائع ہو تو یہ چہرہ بے نقاب ہو۔ انھوں نے اس فن کی ترتیب ہی

بدل دی ہے اور نئے اصول دریافت کئے ہیں جو بلاغت قرآن کے جانچنے کیلئے صحیح معیار قرار پاسکتے ہیں۔

قرآن کے طالب کو کتب سابقہ پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ بلاشبہ احکام و حقائق کے باب میں، ہم کتب سابقہ کے محتاج نہیں ہیں۔ آفتاب کی تابانی کے بعد ستاروں کی رہنمائی کی ضرورت نہیں باقی رہ جاتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے نزول قرآن کے بعد ان محرف کتابوں سے اعراض کیا۔

لیکن بعض مقاصد ضرور ایسے ہیں جن میں کتب سابقہ کا مطالعہ نہایت مفید ہوتا ہے۔ یہ قطعی ہے کہ قرآن مجید کتب منزلہ میں سے ایک ہے اور ہمارے پیغمبر صلعم سلسلہ انبیا کی آخری کڑی ہیں پس ان کتابوں کے مطالعہ سے ہم کو طرح طرح کے فائدے ہونگے۔ ہم پر قرآن مجید کی حقیقی عظمت آشکارا ہوگی۔ قرآن کی تمام تلمیحات بے نقاب ہوں گی، اہل کتاب کے اسکات کے دلائل ہاتھ آئیں گے۔ یہ آخری چیز اس زمانہ میں نہایت اہم ہوگئی ہے۔ اہل کتاب کو قرآن کے بعض حوالوں پر طرح طرح کے اعتراضات ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونا اسی وقت ممکن ہے جب توریت و انجیل اور ان سے متعلق اہل کتاب کے تمام لٹریچر پر آدمی کی نظر ناقدانہ ہو۔

قرآن مجید کی تلمیحات و اشارات کا معاملہ بھی نہایت دقیق ہے۔ قرآن مجید پر ابتدائی ایمان لانے والے یا تو اہل کتاب تھے جو اپنی گھر کی باتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ یا مسلمان تھے جو اہل کتاب سے اختلاط و تعلق رکھنے کی وجہ سے ان امور سے باخبر تھے۔ اس لئے قرآن مجید نے اہل کتاب کے عقائد، ان کے مزعومات، ان کی تحریفات اور ان کے تاریخی واقعات وغیرہ کے متعلق اس قدر اجمالی اشارات کئے ہیں کہ ان کا صحیح تصور قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور آج یہ اسی وقت ممکن ہے جب اہل کتاب کے صحیفوں اور ان کے مذہبی لٹریچر پر پوری نظر ہو۔

پھر قرآن مجید نے بعض مقامات میں ان کی کتابوں کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ اس میں ایک حد تک حذف و تحریف کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ	ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھدیا ہے کہ زمین کے وارث
الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ	ہمارے صالح بندے ہوں گے
الصَّالِحُونَ	. . . . .

دوسری جگہ فرمایا

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ	بیشک یہ بات پہلی کتابوں میں بھی لکھی ہوئی
صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ	ہے ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں۔

تاریخی احوال و ایام کی طرف اشارہ کرنے کا یہ اسلوب ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ	اور ہم نے بنی اسرائیل سے کتاب میں کہہ دیا
لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ	تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد ڈالو گے

غرض کتب سابقہ کا مطالعہ اگر پوری تحقیق و تنقید سے کیا جائے تو قرآن مجید کا طالب اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن ان کتابوں کے باب میں اللہ تعالیٰ نے ہیمن قرآن مجید ہی کو قرار دیا ہے، پس جہاں ان کتابوں میں اور قرآن میں اختلاف ہوگا، وہاں ہم قرآن کو اختیار کریں گے، ان کتابوں کو چھوڑ دیں گے۔ استاذ امام ان سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر جس طرح ان کی غلطیاں اور قرآن مجید کی حقانیت واضح کرتے ہیں اس کی مثالیں ان کی تمام تصنیفات میں مل سکتی ہیں لیکن بالخصوص رسالہ ذبیح میں ان کا زور دیکھنا چاہیئے۔ سلف میں سے علامہ ابن تیمیہ کی واقفیت اہل کتاب کے متعلق براہ راست معلوم ہوتی ہے۔

یہ چند ضروری چیزیں جو طلبۂ قرآن کے لئے نافع ہیں ہم نے بیان کر دی ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اہم بات اور بتانے کی تھی یعنی طریقہ فکر و تدبر لیکن اس کے لئے ہم ایک مستقل سلسلہ مضامین لکھنا چاہتے

ہیں اس لئے فی الحال ملتوی کرتے ہیں۔

مگر یہ خارجی وسائل و ذرائع جو بیان ہوئے ہیں یہ سب ثانوی چیزیں ہیں اصلی امور وہی ہیں جو اس سے پہلے ہم نے تین نمبروں میں بیان کئے ہیں ان کے بغیر آدمی کے لئے یہ تمام وسائل و ذرائع یکقلم بیکار ہیں، ہاں اگر ان تمام امور کے ساتھ ان چیزوں کا پورا اہتمام ہو تو ہم کو یقین ہے کہ طالب کی راہ بہت آسان ہوجائے گی اور یہ زیادہ سے زیادہ کامیابی ہے جو اس راہ میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان وادیوں کے قطع کرنے کے بعد بھی کسی شخص کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ پورا قرآن سمجھ لے گا۔ یہ معاملہ کا تمامتر انحصار صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت پر ہے، وہی راہیں کھولتا ہے اور مشکلوں میں رہنمائی کی روشنی دکھاتا ہے، پس طالب قرآن کو دل ہمیشہ اسی کے سامنے جھکا رہنا چاہئے۔ جو کچھ مل جائے اس کے لئے شکرگذار ہو۔ اور جو نہ ملے اس کے لئے امیدوار رہے، مگر نہ تو فخر کرے نہ کبھی مایوس ہو اور تجارت و حصول شہرت کا ذریعہ تو قرآن مجید کو کبھی نہ بنائے۔ آج جو لوگ ان راہوں سے گذرے بغیر تحقیق و اجتہاد کے مقامات عالیہ تک پہنچ گئے ہیں، ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

مذاکرہ

حروف مقطعات

از مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی

مدراس سے ایک محترم بزرگ نے حروف مقطعات اور بعض دوسری چیزوں کے متعلق استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے خیالات دریافت فرمائے ہیں۔ ہم کو افسوس ہے کہ بجز ان چیزوں کے جن کو مولاناؒ نے اپنی مطبوعہ تصنیفات میں لکھ دیا ہے، کسی چیز کے متعلق ہم مولانا کے خیالات تعین کیسا تھ نہیں پیش کرسکتے۔ زیادہ سے زیادہ جو کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کے جو خیالات حافظہ میں محفوظ ہیں ان کو اپنے لفظوں میں بیان کردیں۔ ان کے اصلی خیالات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ اسی وقت معلوم ہوسکیں گے جب ان کی تصنیفات شائع ہوجائیں۔ آج کی صحبت میں حروف مقطعات پر بحث کریں گے۔ انشاءاللہ آئندہ اشاعتوں میں محترم مستفسر کے دوسرے سوالات پر بھی گفتگو ہوگی۔

حروف مقطعات کو مقطعات کیوں کہتے ہیں؟ چونکہ ان حرفوں کی قرات، عام حروف کے خلاف ہے۔ یعنی یہ حروف ہمیشہ الگ الگ کرکے ساکنۃ الاواخر پڑھے جاتے ہیں، مثلاً الٓمٓ کو الف، لام، میم پڑھیں گے۔ اس لئے ان کو "مقطعات" کہا جاتا ہے۔

یہ حروف قرآن مجید میں جہاں جہاں آئے ہیں، سورتوں کے بالکل شروع میں آئے ہیں۔ اور ان کے مواقع پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حروف جن سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان سورتوں کے نام ہیں۔

قرآن مجید میں اکثر جگہ ان حرفوں کے بعد ذٰلِكَ اور تِلْكَ وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں، مثلاً سورہ لقمان میں فرمایا گیا ہے۔

الٓمٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ — الم یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں

سورۃ الشعراء میں آیا ہے:۔

طٰسٓمٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ — طسم یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔

سورۂ حجر میں ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ — الر یہ کتاب اور قرآن مبین کی آیتیں ہیں۔

سورۃ البقرہ میں ہے

الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ — الم یہ آسمانی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں

اس قسم کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

ان تمام آیتوں میں حروف مقطعات کے بعد ہی فرمایا گیا ہے کہ "تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ" یہ کتاب آسمانی کی آیتیں ہیں "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" یہ کتاب ہے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اسم اشارہ کا مشار الیہ کون ہے؟ یہ تو معلوم ہے کہ قرآن نے ان تمام مقامات میں اسماء اشارہ میں سے صرف "ذٰلِكَ" اور "تِلْكَ" استعمال کئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ ذٰلِكَ اور تِلْكَ عام طور پر ماسبق ہی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے خاص ہیں اور اہل نحو جو یہ کہتے ہیں کہ یہ اشارہ بعید کے لئے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے۔ ارباب تفسیر جو ذٰلِكَ کو هٰذَا کے معنی میں لیتے ہیں تو محض تقریب فہم کیلئے یہ کہتے ہیں ورنہ مطلب ان کا بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ بحث تفصیل کی محتاج ہے کسی موقع پر ہم اس پر مفصل لکھیں گے۔ اسلئے انہی حرف مقطعات کو جو ان کے پہلے مذکور ہیں، ان اسماء اشارہ کا مشار الیہ ماننا پڑیگا اگر ان حرفوں کو مشار الیہ نہ مانئے تو پھر ذٰلِكَ کو هٰذَا کے معنی میں لینا پڑے گا۔ اور ان دونوں میں

جو عظیم فرق ہے وہ زبان کے جاننے والوں سے مخفی نہیں، خود قرآن مجید میں اس فرق کی متعدد واضح مثالیں موجود ہیں۔ پس جب یہی حروف ان اسمارِ اشارہ کے مشارٌ الیہ ہیں، تو پھر آیت کا ترجمہ یہ ہوا کہ "یہ (یعنی الٓمٓ) کتاب حکیم کی آیتیں ہیں"۔ جس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورہ جس کا نام الٓمٓ ہے کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔

غور کیجئے آیتوں کے سیاق اور لفظوں کے اشارہ سے یہ بات کسقدر واضح ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں۔

اس موقع پر ایک اہم مغالطہ کو رفع کردینا ضروری ہے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ جب یہ سورتوں کے نام ہیں تو ان کو قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حروف گو سورتوں کے نام ہیں لیکن پھر بھی منجملۂ قرآن ہیں، دو وجہوں سے، ایک تو یہ کہ جیسا اوپر گذر چکا قرآن نے انہی حرف کو مشارٌ الیہ قرار دیا ہے۔ پس قرآن جب خود ان کی طرف اشارہ کررہا ہے تو وہ حروف بھی قرآن ہی میں داخل ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ حروف بھی قرآن ہی کے ساتھ نازل ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کو کسی طرح ترک نہیں کیا سکتا، مابین الدفتین جو صحیفہ ہمارے پاس موجود ہے وہ عہد رسالت سے حرف بحرف محفوظ و مصئون چلا آتا ہے اور ہم کو اسی کی قرأت و تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے ان حروف مقطعات کو کسی طرح بھی قرآن سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ایک شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض سورتوں کے نام ایسے حروف سے رکھنا جن کے معنی عمیق و مستور ہیں قرآن کے عربی مبین ہونے کے منافی ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمام حروف ہجا عربوں کو معلوم تھے۔ اور ان کی عام بول چال میں ان کا رواج تھا اس لئے تمام مفرد اسمائے سور مثلاً صٓ، قٓ، نٓ عربی مبین کے حکم میں ہیں۔ باقی رہے مرکبات مثلاً حٰمٓ، الٓمٓ، المٓص، حٰمٓ عسٓق تو جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں جن کے شروع میں یہ واقع ہیں تو یہ بھی

عربی مبین کے حکم میں داخل ہو گئے، اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اہل عرب ان کلمات سے بالکل ناواقف تھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ عرب اس طرح کے مرکبات سے نام رکھتے تھے۔ اور ان کے معنی بالکل ایسے مخصوص اصطلاحی قرار دے لیتے تھے جو ان کے مفردات سے نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ ان کے اشخاص گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں کے اسماء میں اس کی مثالیں تلاش سے دستیاب ہو سکتی ہیں آہستہ آہستہ یہ اسماء اس وضع جدید کے لئے متعارف ہو جاتے تھے اور سامع ان کو سنکر ان سے اس جدید معنی کو سمجھ جاتا تھا۔ اس لئے یہ مرکب اسماء بھی عربی مبین کے حکم سے خارج نہیں ہوئے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی سورہ کا نام الم کسی کا الر، کسی کا طسم کیوں رکھا گیا؟ ان ناموں میں اور ان سورتوں میں جن کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں، کوئی معنوی ربط اور مناسبت بھی ہے یا نہیں؟

اگلے علماء نے بھی اس حقیقت کے کھوج میں بڑی بڑی تحقیقیں کی ہیں اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس بارہ میں ان کے ۲۹ اقوال ہیں۔ لیکن ان تمام اقوال میں سے کسی قول میں بھی قرآن سے تمسک نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم ان اقوال سے کوئی بحث نہیں کریں گے۔ قرآن کی روشنی میں ہم نے جو معنوی مناسبت سمجھی ہے صرف اسی کے بیان پر اکتفا کریں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حقیقت مستور کی طرف قرآن کے اشاروں کی روشنی رہنمائی نہ کرتی تو ہم اس بحث کو ہاتھ نہ لگاتے ولکنی انست نارا لعلی اتیکم منھا بقبس واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی چیز کا نیا نام رکھتے تو اس چیز کا خاص خیال رکھتے کہ اسم اپنے مسمی کی مخصوص خصوصیات کا حامل ضرور ہو۔ عربوں کے القاب پر نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجائیگی "الملک الضلیل" امراء القیس کا لقب ہے۔ دیکھو یہ مختصر لقب، صاحب لقب کی مخصوص خصوصیات کا کس درجہ حامل ہے؟ اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ اسم دراصل وسم سے مشتق ہے۔

پس اسمیت کے لئے وہی چیز صالح اور مناسب ہوسکتی ہے جو علامت کا کام دے سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی چیز کا کوئی نام رکھا جائے تو اس میں اتنی صلاحیت تو ضرور ہو کہ اگر سب نہیں تو مسمی کی بعض ابھری ہوئی اور نمایاں خصوصیتوں کو واضح کرسکے۔ قرآن مجید میں جو سورتوں کے نام رکھے گئے ہیں ان میں اسی طرح کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے ان ناموں سے کم ازکم ان سورتوں کی کوئی نمایاں علامت ضرور سامنے آجاتی ہیں پس جب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ حروف مقطعات بھی سورتوں کے نام ہیں تو ضروری ہے کہ یہ حروف بھی بامعانی ہوں۔ اور ان حروف سے جو مرکبات بنائے گئے ہیں وہ بھی عربی زبان کے عام مرکب ناموں کی طرح بامعانی ہوں۔

یہ معلوم ہے کہ قدیم عربی زبان میں ہندی اور انگریزی کی طرح حرفوں کے نام مجرد آوازوں کے نام نہیں تھے بلکہ یہ نام درحقیقت چیزوں کے نام ہوتے تھے۔ اور انہی کی شکلوں پر بنائے جاتے تھے آج بھی باوجودیکہ زبان پر ہزاروں انقلابات آچکے ہیں اور بے شمار تبدیلیاں ہوچکی ہیں، بہت سے حروف انہی چیزوں کے ناموں کے لئے بولے جاتے ہیں اور کسیقدر انہی کی شکلوں میں لکھے بھی جاتے ہیں، عربی حروف کے ناموں کے اصل معانی کے بعض گوشے ظاہر ہوچکے ہیں مثلاً الف اپنی اصل و قدیم شکل میں گائے کے سر کی شکل کا ہوتا تھا۔ اور الف گائے کا نام تھا۔ اور با عبرانی زبان میں بیت کا نام تھا جس کو عربی میں بیت کہتے ہیں اور جیم عبرانی میں جمل کو کہتے تھے جس کو عربی میں جمل کہتے ہیں۔ غور کرو ج کی موجودہ شکل اونٹ کی بگڑی ہوئی صورت سے کسقدر ملتی جلتی ہے۔

ہم نے جس حقیقت کی طرف اوپر اشارہ کیا ہے وہ نہایت معروف ہے۔ عربی کتابت کی تاریخ جاننے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ موجودہ عربی حروف دراصل عبرانی حرفوں سے ماخوذ شکلیں ہیں۔ اور عبرانی حروف مصر کے قدیم حرفوں سے ماخوذ تھے۔ اہرام مصر پر قبطیوں کی تمثالی کتابت کے جو کتبے آج بھی موجود ہیں وہ تمام کے تمام قبطیوں نے عربوں ہی سے سیکھے تھے لیکن چونکہ ایک چیز دوسرے قالب میں جاکر کچھ نہ کچھ ضرور بدل جاتی ہے اس لئے

عربوں کے تمثالی حروف جب قبطیوں کے ہاتھ میں پہنچے تو انھوں نے اپنے افکار و عوائد کے مطابق بہت کچھ ان میں تبدیلیاں کر دیں۔ اس طرح پر عرب قدیم کی تمثالی کتابت شکوک و مشتبہ ہو کر رہ گئی۔

عربی حرفوں کے ناموں کے متعلق اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کوئی افسانہ یا من گڑھت بات نہیں ہے۔ اگر غور کیجئے تو خود قرآن مجید بھی اس راز کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ مثلاً دیکھئے قرآن مجید نے ایک سورہ کا نام ن رکھا ہے۔ ن ایک ایسا حرف ہے جو موجودہ عربی زبان میں بھی با معنی سمجھا جاتا ہے۔ نون کے معنی مچھلی کے ہیں۔ اور جس سورہ کا یہ نام ہے اُس میں صرف یونس علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں یونس علیہ السلام کو "صاحب الحوت" (مچھلی والے) ہی کے نام سے یاد بھی فرمایا ہے۔ غور کرو: ان تمام باتوں میں ایک متوسم کے لئے سورہ کے وجہ تسمیہ کو سمجھنے کیلئے کتنا واضح اشارہ موجود ہے۔ کیا کوئی اسم اس سے بھی زیادہ اپنے مسمی کے ساتھ ربط اور مناسبت کا حامل ہو سکتا ہے؟

پس تفصیل بالا سے جب یہ ثابت ہو چکا کہ سورہ ن کا نام ن حرف ن کی معنوی مناسبت کے بنا پر رکھا گیا ہے تو ہم کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ باقی اور سورتوں کے نام بھی جن کے نام حروف مقطعات پر رکھے گئے ہیں، ان حروف کے ابتدائی معانی کے مطابق اپنی اپنی سورتوں کے ساتھ معنوی مناسبت رکھتے ہوں گے۔ اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ ہم خط تمثالی میں حرفوں کے جو معانی رہے ہوں انکا سراغ لگائیں۔ اگر ہم کو یہ تمام معانی صحیح صحیح معلوم ہو جائیں تو حروف مقطعات کی اقرب الی الصحۃ تاویل متعین کیجا سکتی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید ایک اور حرف سے بھی ہوتی ہے۔ جس کو ہماری بولی میں ط کہتے ہیں، ط کی صورت عبرانی زبان میں ט ہے اس کی ظاہری صورت عین اس کی معنوی حقیقت کے مطابق ہے۔ عبرانی زبان میں ط کے معنی سانپ کے ہیں اور دیکھئے یہ حرف بنایا بھی گیا ہے بالکل سانپ ہی کی صورت پر۔ حرف کی اس صورت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سانپ ہے جو اپنے سر کو اٹھائے ہوئے کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اب حرف کی اس حقیقت کو سامنے رکھکر غور کیجئے

تو سمجھ میں آتا ہے کہ جن سورتوں کے نام میں ط ہوگا ان کو سانپ سے کسی نہ کسی طرح کی مناسبت ضرور ہوگی۔ اچھا آیئے قرآن مجید میں ان سورتوں کی تلاوت کریں جو ط سے شروع ہوتی ہیں اور دیکھیں کہ اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ قرآن مجید میں ایک سورہ ہے جس کا نام ہے طٰہٰ۔ اس سورہ میں ابتدائی تمہید کے بعد ہی فوراً موسیٰ علیہ السلام کی حکایت اور ان کے عصا کے سانپ بنجانے کا معجزہ بیان فرمایا گیا ہے۔ دیکھئے اس سورہ میں سورہ کے نام اور اس کے معنی میں کتنی واضح معنوی مناسبت موجود ہے۔ سورہ طٰہٰ کے علاوہ اور دوسری سورتیں بھی جن کو اللہ تعالیٰ نے ط سے شروع فرمایا ہے مثلاً طٰسٓمٓ، طٰسٓ، اور طٰسٓمٓ سب کی سب موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے شروع ہوتی ہیں اور سب میں ان کے عصا کے سانپ بنجانے کا تذکرہ صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ پھر اس نکتہ کو بھی سامنے رکھئے کہ ان چار سورتوں (طٰہٰ، طٰسٓمٓ، طٰسٓ، طٰسٓمٓ) کو جو ط سے شروع ہوتی ہیں چھوڑ کر باقی تمام سورتوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ سورتیں تو ایسی ہیں جس میں سرے سے حضرت موسیٰؑ کا قصہ ہی مذکور نہیں ہے۔ اور اکثر سورتیں ایسی ہیں جن میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تو مذکور ہے لیکن لٹھیا کے سانپ بننے کا واقعہ مذکور نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن سورتوں میں لٹھیا کے سانپ بننے کا واقعہ مذکور تھا وہی اس نام کی مستحق تھیں۔ اور ط کا تسمیہ انہی سورتوں کو سزاوار تھا۔ پورے قرآن میں صرف سورۃ الاعراف ایک ایسی سورہ ہے جس نے عصا کے سانپ بننے کا معجزہ بھی بیان کیا ہے اور اس کے ابتدا میں ط بھی نہیں ہے۔ لیکن اس سے ہمارے نظریہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس سورہ کو امعان نظر سے پڑھو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ حضرات انبیاء سابقین۔ حضرت نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام کے قصوں کے سلسلہ میں تبعاً آگیا ہے۔ اسی وجہ سے اس سورہ کو ط سے نہیں شروع کیا گیا۔ ورنہ جن سورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ کو بطور اصل کے بیان فرمایا گیا ہے۔ آپنے دیکھا کہ ان تمام سورتوں

طٰ سے شروع کیا گیا تھا۔ طٰ والی تمام سورتیں حضرت موسیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ ان سورتوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے مخصوص قرار دینا تنہا ہمارا ہی خیال نہیں ہے۔ بعض علمائے متقدمین نے بھی یہی سمجھا ہے۔ سخاوی کا قول ہے کہ سورہ طٰہٰ کا نام سورہ کلیم ہے اور ہذلی نے بھی کامل میں اس سورہ کا نام سورہ موسیٰ لکھا ہے۔

بہرحال ان تمام تفصیلات سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ جن سورتوں کے بھی ناموں میں طٰ موجود ہے ان کے ناموں میں اور مسمیٰ میں نہایت ہی گہری معنوی مناسبت ہے اسی طرح دائرہ فکر و نظر کو اگر اور وسیع کیجئے تو سمجھ میں آتا ہے کہ الٓمٓ اور الٓرٰ کی قسم کے ناموں میں بھی انکی سورتوں کے ساتھ خاص معنوی مناسبت پائی جاتی ہے۔ اوپر گذر چکا ہے کہ خط نمثالی میں الف کی شکل گائے کے سر کے طرح ہوتی تھی نیز یہ حرف ان کے نزدیک " الواحد " پر دلالت کرتا تھا۔ قرآن مجید کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ جن جن سورتوں کے نام کے شروع میں الف آیا ہے " ایمان باللہ " ان کے اعظم مطالب میں سے ہے۔ اس لئے ان ناموں کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے اپنے مسمیٰ سے گہرا ربط نہیں رکھتے ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ اگر اسی طرح ہر حرف کے متعلق صحیح معلومات حاصل کی جا سکیں، تو امید ہے کہ تمام حروف مقطعات کی مناسبت واضح ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں پوری کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی ہی سے ممکن ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی چیز سے ناواقفیت اس کے عدم کو مستلزم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز موجود ہو مگر ہم اس سے واقف نہ ہوں، پس تلاش جاری رہنی چاہئے اور خدا پر پورا بھروسہ رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہر شکل میں مدد فرماتا ہے۔

موعظۂ حسنۃ

خلوص

از جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

مذہب اسلام کوئی خیالی مذہب نہیں ہے۔ سراسر عمل اور یکسر جد و جہد ہے۔ اس کے نزدیک علم کے بعد عمل کا ظہور ضروری ہے۔ اگر اس میں تخلف ہو تو ایسا علم ایک لفظ بے معنی ہے جس کی اسکی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں، یہودیوں کے دعوائے ایمان کو کیوں بے حقیقت کہا گیا؟ منافقین کے عقاید کو کیوں بے بنیاد قرار دیا گیا؟ اگر ان سوالات پر غور کیجئے تو آپ تسلیم کریں گے کہ ان کے علم اور ایمان سے جیسے اعمال بطور نتیجہ کے ظہور میں آنے تھے اس کا کوئی اثر بھی ان کی عملی زندگی میں موجود نہ تھا بلکہ اس کے برعکس ان سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی تھیں جو اہل ایمان کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہیں اس لئے قرآن پاک نے نہ صرف یہی کہا کہ تم ایمان میں کچے ہو بلکہ ان کو سرے سے مومنین کے زمرہ ہی سے خارج کر دیا (۸ - ۹ بقرہ)

ایک طرف تو مذہب میں عمل کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر دعوائے ایمان سراب سے زیادہ نہیں۔ دوسری طرف میدان عمل میں اترنے سے پہلے ہر شخص سے اس کا ایک اور مطالبہ بھی نہایت شدت سے ہے جس کے بغیر انسان کے کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ یعنی خلوص۔ واقعہ یہ ہے کہ منہ سے کسی کی عقیدت و محبت کا دم بھرنا اور شے ہے اور اس کی محبت کے لئے دنیا کے تمام رشتوں اور ناتوں کو تج کر کے بس اسی کا ہو رہنا اور چیز ہے۔ ایک سرتاسر فریب ہے دوسرا حقیقت۔

خصوص تمام تعلیمات دین | قرآن مجید اور دیگر صحف سماویہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلوص مذہب
کی اساس ہے | کی تمام تعلیمات کی جان ہے خواہ وہ تعلیمات کلیات دین سے متعلق ہوں یا عام

عبادات و معاملات سے۔ اس کے بغیر نہ توعقیدۂ توحید، عقیدۂ توحید ہے اور نہ معاد و رسالت کا اعتقاد اعتقاد ہے، نہ روزہ و نماز کی کوئی حقیقت ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ	اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا
وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ	اور یوم آخر پر ایمان لائے حالانکہ وہ سچے مومن نہیں ہیں
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	وہ خدا کو اور مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ
وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ	وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں لیکن ان کو
وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۸ - ۹ بقرہ)	خبر نہیں۔

ایک دوسرے مقام پر یوں مذکور ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ	اے رسول جو لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان
يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ	لائے اور ان کے دل مومن نہیں ہیں، کفر کی
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ	راہ میں ان لوگوں کی بھاگ دوڑ تم کو غم میں
قُلُوْبُهُمْ (آیۃ ۴۱ - مائدہ)	نہ ڈالے۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ چونکہ منافقین کا دعویٰ ایمان خلوص سے خالی تھا اسلئے انھیں مومنین کے زمرہ سے یکقلم خارج کر دیا ہے۔

حضرت مسیح سے بھی جب پوچھا گیا کہ اے استاد شرع میں سب سے بڑا حکم کون ہے؟ تو آپنے فرمایا "خداوند کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح اور اپنی ساری عقل سے پیار کر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حکم یہی ہے"۔ (متی - ۲۲)

حضرت مسیحؑ کے اس قول میں ایک بہت ہی گہری حقیقت کی جانب ایک نہایت لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ محبت الٰہی خلاصہ کتاب اور بنیاد شریعت ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شریعت کا سرچشمہ یہی ہے۔ تمام عقائد و اعمال یہیں سے ابلتے ہیں اور جملہ اخلاق و معاملات کا یہی مرکز ہے۔ مگر خدا کی محبت میں جلا اسی وقت آسکتی ہے جب تمام باطل اثرات کو بالکل مٹا کر انسان بس اسی ایک کا ہو رہے، لفظ ساری کی قید اور تکرار میں یہی رمز ہے۔

خلوص عبادت کی روح رواں ہے

مذہب اسلام میں ہر عمل جو خلق خدا کی فائدہ رسانی اور خدا کی خوشنودی کیلئے کیا جائے عبادت میں داخل ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد اس کے بڑے بڑے ارکان ہیں۔ مگر ان میں سے ہر فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں خلوص ہو۔ نہ اس میں ریا و نمائش کی خواہش ہو اور نہ کسی طمع و خوف کا دباؤ۔ ورنہ اسکی تمام عبادت اکارت ہو جائے گی

نماز میں خلوص شرط ہے

قرآن پاک میں بہت سی ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کیلئے ضروری ہے کہ وہ ریا و نمائش سے پاک ہو۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ	پس تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی
صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ	نماز سے غافل ہیں وہ جو نمائش کرتے ہیں اور چھوٹی
يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۷، ماعون)	چیز بھی مانگے سے نہیں دیتے۔

حضرت مسیحؑ نے بھی اس نماز کی جس میں ریا و نمائش کا شائبہ ہو نہایت سختی سے مذمت کی ہے فرماتے ہیں۔

"اور جب تو دعا مانگے ریاکاروں کے مانند مت ہو کیونکہ وہ عبادت خانوں میں اور راستوں کے کونوں پر کھڑے ہوئے دعا مانگنے کو دوست رکھتے ہیں تاکہ لوگ انہیں دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ

۱۰ اپنا بدلہ پاچکے لیکن جب تو دعا مانگے اپنی کوٹھری میں جا اور اپنا دروازہ بند کرکے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دعا مانگ (متی-۶)

زکوٰۃ میں بھی خلوص شرط ہے | قرآن پاک اور دیگر صحائف میں بے شمار ایسی آیات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ یا کوئی دوسری پیشکش اس وقت تک خدا کی بارگاہ بے نیاز میں شرف قبولیت حاصل نہیں کرسکتی جب تک کہ اس میں پورا خلوص نہ ہو۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور ان لوگوں کے کام کی مثال جو خدا کی خوشی
ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ	اور اپنے نفس کی تثبیت کے لئے اپنا مال خرچ
اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ	کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک باغ بلندی پر
اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا	واقع ہے جس پر پانی پڑا پس لایا اپنا پھل دوگنا
ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ	اگر پانی نہ پڑا تو شبنم ہی اس کو کافی ہوئی اور
فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲۶۵ بقرہ)	خدا تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

فرمایا "ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" خدا کی رضا جوئی کے لئے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں تھوڑا بہت خلوص نیت کے ساتھ خرچ کرتے ہیں انہی لوگوں کا انفاق قبول ہوگا اور جو لوگ اس مقصد سے خالی ہوں گے اگر وہ ہفت اقلیم کی سلطنت بھی خدا کی راہ میں لٹا دیں تو اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں مذکور ہے۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ	اور اس پر کسی کا احسان نہیں کہ اس کا بدلہ دینا
تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ	ہو محض اپنے برتر پروردگار کی خوشنودی کے لئے
الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى	اور جلد وہ نہال ہو جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر یوں ہے۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۲۷ مائدہ) خدا تو تقویٰ والوں ہی کی پیشکش قبول فرماتا ہے

اس آیت میں تصریح ہے کہ خدا کی بارگاہ بے نیاز میں اسی کی پیشکش شرف قبولیت حاصل کر سکتی ہے جو خلوص کا ہدیہ لیکر آتے ہیں۔ ریاکاروں اور شہرت پسندوں کے نذرانوں کی اس کے دربار میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

اسی حقیقت کو حضرت مسیح نے بھی بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"خبردار رہو کہ تم اپنے نیک کاموں کو لوگوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو نہیں تو تمھارے باپ کے جو آسمان پر ہے اجر نہ ملے گا۔ اس لئے جب کہ تو خیرات کرے اپنے سامنے نرسنگی مت بجا جیسے ریاکار عبادت خانوں اور راستوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے پر جب تو خیرات کرے تو چاہئے کہ تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے جو تیرا دایاں ہاتھ کرتا ہے تاکہ تیری خیرات پوشیدہ رہے اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے ظاہر میں تجھے بدلہ دے۔ (متی باب ۶)

روزہ میں بھی خلوص شرط ہے | قرآن مجید میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا اصلی مقصود حصول تقویٰ ہے اس لحاظ سے روزہ میں سب سے مقدم شے خلوص ہی کو ہونا چاہئے کیونکہ بغیر اس کے روزہ سے تقویٰ کا حصول ناممکن ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۸۳ بقرہ)

اے مسلمانو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسے ان لوگوں پر فرض کیا گیا جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں تاکہ تم متقی ہو جاؤ

حضرت مسیح نے بھی روزہ میں خلوص نیت کو ضروری شرط قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے

"جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ

لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے۔ پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنائی لگا اور منہ دھو تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے۔ روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے۔ (متی۔ باب ۶)

حج میں بھی یہ اصل ملحوظ ہونی چاہئے

حج اسلام کا ایک بہت بڑا رکن ہے اور تمام ارکان کی طرح اس کی مقبولیت کے لئے بھی قرآن مجید اور احادیث میں خلوص کی شرط لگائی گئی ہے۔ بغیر اس کے یہ عظیم الشان عبادت بالکل رائگاں ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمایا ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ	... لوگوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے
رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ	ہیں کہ اے پروردگار ہمیں دنیا میں تو دے
مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ	اور ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کچھ
رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي	لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اے پروردگار ہماری
الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ	دنیا بھی بہتر بنا اور آخرت بھی اور ہمیں عذاب جہنم
النَّارِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا	سے بچا یہی لوگ ہیں جنھیں ان کے اعمال کی (پوری)
وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲۰۰-۲۰۲ بقرہ)	جزا ملے گی اور خدا جلد حساب کرنے والا ہے۔

اس دعا کے اوپر کے حصہ میں ان لوگوں کی ترجمانی ہے جن کی تمام طلب و جستجو صرف دنیا کیلئے ہے۔ آخرت کی زندگی کی نہ انھیں خبر ہے اور نہ اس کے لئے کوئی خلش اور بےچینی۔ وہ حج کے لئے بھی سفر کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر صرف ان کے دنیاوی اغراض و مقاصد ہوتے ہیں اور انہی کے لئے خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔

جہاد میں بھی خلوص کی شرط ہے

قرآن پاک میں جہاں جہاد پر زور دیا گیا ہے اکثر مقامات میں فی سبیل اللہ کی قید لگائی گئی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ کام محض اللہ کی راہ میں ہونا چاہئے۔ طلب دنیا، تمنائے شہرت

اور عشق ناموری میں نہیں ہونا چاہئے ورنہ تمام عمل باطل ہوجائے گا۔

مسلم کی ایک حدیث میں، اس حقیقت کی پوری تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

قیامت کے دن سب سے پہلے شہید کا معاملہ عدالت الٰہیہ میں پیش ہوگا۔ پس خدا اسے اپنی نعمتیں پہچنوائے گا پس وہ انھیں پہچان لے گا تو خدا فرمائے گا کہ تو نے کون سا کام کیا ہے تو بندہ کہیگا بار الہا! تیری راہ میں میں لڑا یہاں تک کہ درجہ شہادت تک پہنچ گیا تو خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے تو محض اس لئے لڑا کہ جاں باز کہا جائے سو یہ مقصد تو حاصل ہوگیا پھر حکم ہوگا کہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں ڈالدیا جائے۔ (مسلم جلد ۲ ص ۱۴۳)

"مسلم" پٹنہ کا انقلابی دور

مُدیر مسئول: سید محمد منظر ندوی۔ مدیران خصوصی: مولانا عبدالباقی بی اے جامعی، مولانا اسمٰعیل وحشی ایم اے، مولانا سید محی الدین ندوی۔

ہفتہ میں دوبار پابندی وقت کے ساتھ ۱۶ صفحات پر شائع ہوتا ہے سالانہ چندہ ۵ روپیہ ششماہی ۳ روپیہ سہ ماہی عہ۱ فی پرچہ تین پیسے۔

پانچ سال کی مستقل زندگی کے بعد مسلم کا دور جدید شروع ہوگیا ہے مسلم کا ادارۂ تحریر ہندوستان کے کسی بہتر سے بہتر جریدہ کے صوری و معنوی محاسن کا ضامن ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ "مسلم" گوناگوں دلچسپیوں اور ادبی شاہکاروں کا بہترین مرقع سمجھا جا رہا ہے۔ اہم ترین مقالوں، ضروری شذرات اور نو بہ نو خبروں کے علاوہ بصیرت افروز نظمیں، عالم اسلام، معلومات واکتشافات وغیرہ کے مستقل عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں "آئینۂ عالم" کے جدید عنوان کے ماتحت ساری دنیا کی تازہ ترین سیاسیات پر نئے اسلوب بیان میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔ "مسلم" کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ عنوان "علم وادب" کوئی خشک موضوع نہیں بلکہ علم وادب کیلئے زندگی کا پیغام ہے اور یہ جمود میں ادبی زندگی کی روح پھونکنا چاہتا ہے کی باتوں میں دریا کو کوزے میں بند کرنیکی کوشش کیجاتی ہے۔ "تفکہات" کے مزاحیہ کالم میں دل بہلانے کا کافی ذخیرہ موجود رہتا ہے۔

اگر آپ نئے مضامین، نیا طرز بیان اور نئی باتوں سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو آج ہی سے "مسلم" کے خریدار بنجائیے۔

ملنے کا پتہ:- منیجر اخبار "مسلم" بانکی پور (پٹنہ)

ایفائے عہد اسلام اور تہذیب جدید کی نظر میں

از جناب حافظ عبدالاحد صاحب اصلاحی

انسانی اخلاقیات کے باب میں ایفائے عہد کو وہی اہمیت اسلام میں حاصل ہے جو اہمیت جسم کے اندر روح کو حاصل ہے چنانچہ اسلام نے ایفائے عہد کو انسانیت کا اصلی جمال اور مجد و شرف کا نشان ٹھہرایا ہے اور جنگ و صلح، دشمنی اور دوستی دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی تاکید کی ہے، قرآن پاک میں اس مضمون کی آیات بکثرت ہیں جن میں سے کچھ یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس باب میں اسلام کا حکم کیا ہے؟۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا	عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی،
فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ	ان سے پورا کرو ان کا عہد ان کے عہد تک بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے
وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (سورہ ۴۸۔ آیت ۱۰)	اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو دیگا بدلا بہت بڑا۔
وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا	اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم کسی سے معاہدہ کرلو اور اپنی قسموں کو مضبوط کرنے

وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا
اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ وَلَا
تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا
مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ
اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ
اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ

(سورہ ۱۶۔ آیت ۹۱-۹۲)

... اور اللہ کو اپنے پر ضامن کرنے کے بعد نہ توڑو
جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کا حال بالیقین
معلوم ہے اور تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ
جس نے اپنا ہی کاتا ہوا تاگا محنت سے کاتنے
کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تم اپنی قسموں کو
باہم دغا کے طور پر استعمال کرتے ہو کہ
کہیں ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ
وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ
يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ
يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
... اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى
الدَّارِ (سورہ ۱۳۔ آیت ۲۲)

جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور
عہد و پیمان نہیں توڑتے اور اللہ نے
جس رشتہ کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے
جوڑے رکھتے ہیں انھیں لوگوں کیلئے
آخرت کا گھر ہے

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُوْنَ ۝ (سورہ ۲۔ آیت ۱۷۷)

وہ لوگ جو عہد کرنے کے بعد اسے پورا
کرتے ہیں اور وہ جو سختی و تکلیف اور
لڑائی کی مصیبت میں ثابت قدم رہتے
ہیں یہی لوگ ہیں سچے اور یہی لوگ
پرہیزگار ہیں۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى

ہاں جو کوئی پورا کرے اپنا قرار اور وہ

فَاِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۔ اِنَّ	پرہیزگار ہے تو اللہ کو محبت ہی پرہیزگاروں
الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰہِ	سے۔ جو لوگ تھوڑی قیمت پر عہد کو بیچ ڈالتے
وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ	ہیں ان کا کچھ حصہ آخرت میں نہیں ہے اللہ
لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا	نہ ان سے بات کریگا اور نہ قیامت کے دن
یُكَلِّمُهُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ	ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ انکو پاکیزگی
یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ	بخشے گا ان کے لئے دردناک عذاب
عَذَابٌ عَظِیْمٌ (سورہ ۳۔ آیت ۷۷۔۷۷)	ہے۔
وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْكَانَ	اور جب بات کہو توحق کہو اگرچہ وہ شخص
ذَاقُرْبٰی وَبِعَهْدِ اللّٰہِ اَوْفُوْا	جس کے خلاف کہ رہے ہوا پنا قریب ہی ہو
ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ	اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو اسکا حکم کردیا ہے
تَذَكَّرُوْنَ ۔ (سورہ ۶۔ آیت ۱۵۲)	تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

آیات مذکورہ بالا میں بتلایا گیا ہے کہ اسلامی اخلاقیات کی بنیادی چیزوں میں سے وفاء عہد ایک نہایت اہم چیز ہے انسان کے گردوپیش کے حالات کتنے ہی ناسازگار اور مخالف ہوں اسے اپنے عہد پر قائم رہنا چاہئے کسی حالت اور کسی شکل میں بدعہدی نہیں کرنی چاہئے۔ بدعہدی تقویٰ اور پاکیزگی نفس کے خلاف ہے۔ خدا کے نزدیک یہ عمل نہایت مبغوض ہے اور اس کا انجام حد درجہ ہلاکت خیز ہے۔ انسان کو بدعہدی سے کتنا ہی عظیم فائدہ پہنچنے کی امید ہو اور ایفائے عہد سے کتنا ہی نقصان کا خطرہ ہو، اس کو چاہئے کہ وفاء عہد کرے کیونکہ بدعہدی سے جو نفع حاصل ہوگا اس سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی جو انسان کے اخلاق اور روح کو اس سے پہنچتا ہے اور ایفائے عہد سے بظاہر جو نقصان ہوگا اس سے انسان کے وہ اخلاقی اور روحانی فوائد کسی طرح کم نہیں ہوسکتے جو ایفائے عہد کے لازمی

نتائج ہیں۔ انسان کیلئے لازم ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں عہد وپیمان پر قائم رہے تاکہ اس کی زندگی پاکیزگی کی زندگی ہو۔

آنحضرت صلعم نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ ذیل کی حدیث کے الفاظ سے ہوگا۔

لا دین لمن لا عہد لہ۔ جس کے اندر وفاء عہد نہیں اس کے اندر دین نہیں۔
(رواہ ابن حنبل فی المسند)

گویا ایفائے عہد پر دین کی بنیاد استوار ہے۔ ایک مسلم کی زندگی اسی وقت تک اسلامی زندگی ہے جبتک وہ عہد پر قائم ہے

اس تعلیم کی عملی مثال | قرآنی آیات وحدیث کی روشنی میں ایفائے عہد کی اہمیت یہ ہے اب یہ دیکھئے عملی زندگی میں اس تعلیم کو کہاں تک اختیار کیا گیا اور اسے کتنی اہمیت دی گئی۔ ذیل کے واقعات سے اس کی تصدیق ہوگی۔

صلح حدیبیہ میں جن شرائط کے ماتحت کفار قریش سے مصالحت طے پائی تھی ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے کوئی آدمی مسلمانوں کے پاس بھاگ کر جائے گا تو مسلمان اسے واپس کر دینگے اور مسلمانوں کا کوئی آدمی مکہ جائے گا تو کفار اسے واپس نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ قلمبند ہو رہا تھا کہ ابو جندل ابن سہیل جو کفار مکہ کے قیدی تھے کسی طرح ان کی قید سے چھوٹ کر لشکر اسلام میں آگئے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں، جسم پر زخموں کے نشانات ہیں، چہرے پر شدت آلام کے آثار نمودار ہیں۔ سرور کونین سے آکر فریاد کرتے ہیں، خدا را اس مصیبت سے مجھے نجات دلائیے، جاں نثاران اسلام ان کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔ چودہ سو تلواریں شہنشاہ کونین کے اک اشارہ کی منتظر تھیں اور ان کی ملی اخوت اپنے ایک مسلمان بھائی کے چھڑانے

سکے لئے بھیجی تھی مگر چونکہ شرائط صلح طے پا چکی تھیں عہدنامہ لکھا جا رہا تھا اس لئے پیغمبر نے
کو چھڑانے سے انکار فرمایا حضور کے الفاظ یہ ہیں

یا ابا جندل اصبر واحتسب — ابوجندل صبر کر اللہ تعالیٰ تیرے
فانا لا نغدر وان اللہ جاعل لك — کی کوئی صورت پیدا کرے گا
فرجا ومخرجا (فتح الباری باب الشروط فی الجہاد)

جنگ بدر میں کفار کی جمعیت مسلمانوں سے سہ گنی تھی۔ مسلمانوں کو اپنی تعداد بڑ
بھی بڑی قیمتی چیز ہو سکتا تھا، حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد حسیل ابن جابر اسلامی فوج
راستہ میں کفار نے ان کو روک دیا اور کہا تم لوگ محمد کی اعانت کیلئے جا رہے ہو۔ انھوا
مدینہ کے ارادہ سے جا رہے ہیں۔ اس پر کفار نے ان سے یہ عہد لیکر چھوڑ دیا کہ وہ جنگ میں
یہ لوگ کفار کی گرفت سے چھوٹ کر میدان بدر میں آئے اور آنحضرت صلعم کی خدمت
یہ واقعہ دہرایا آپ نے سنکر فرمایا تم لوگ مدینہ چلے جاؤ ہم عہد کو پورا کریں گے اور ا
اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت مانگیں گے (مسلم شریف)

صلح حدیبیہ کے بعد آپ مدینہ تشریف لائے۔ تو ابوبصیر ایک صحابی کفار مکہ کی قید
آپ کے پاس حاضر ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے کفار کے بھی دو آدمی مدینہ پہنچے ان
میں حاضر ہو کر ابوبصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا رسول اللہ صلعم کو معلوم تھا کہ مکہ میں
کتنا ظالمانہ برتاؤ ہوتا ہے اور خصوصاً بھاگ کر واپس جانے والے قیدی کے ساتھ
پاس عہد ان سب پر مقدم تھا آپ نے اس مظلوم مسلمان کو دشمنان اسلام کے
گوارا نہ کیا (فتح الباری باب الشروط فی الجہاد)

جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم کی فوج لاکھوں کی تعداد میں مسا

جمع ہوتی ہے تمام اہل فلسطین سے مسلمانوں کو نکال دینے اور ان کی قوت کو کچل دینے پر تلی ہوئی ہے اس وقت مسلمانوں کو اپنی قوت کے تحفظ کیلئے پیسہ پیسہ کی ضرورت ہے مگر اس کے باوجود وہ حمص کے باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور جو رقم بطور خراج ان سے وصول کی تھی اسے یہ کہکر واپس کر دیتے ہیں کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے اس لئے یہ رقم واپس ہے۔ مسلمانوں کیلئے یہ کتنی کٹھن گھڑی ہے ایک درم ایک دینار سے زیادہ قیمت رکھتا ہے مگر چونکہ خلاف عہد تھا اسلئے کوڑی کوڑی واپس کر دی۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں لیکن یہاں واقعات کا استقصار مقصود نہیں ہے اسلئے اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

تہذیب جدید میں ایفاء عہد کی اہمیت آج جدید تہذیب کی بڑی دھوم ہے اس کا کوئی گوشہ اچھائیوں اور اخلاقی بلندیوں سے خالی نہیں سمجھا جاتا بلکہ ساری اچھائیوں کی مالک مہذب قومیں ہی سمجھی جاتی ہیں مگر ایفاء عہد جو اخلاق انسانی کا روشن ترین باب ہے ان کے یہاں یکسر سادہ ہے۔ وفاء عہد کی جو قدر و قیمت ہے اس کی تفسیر لوئی یازدہم شہنشاہ فرانس کا یہ مقولہ ہے۔

"جو شخص دغا و فریب سے کام نہیں لیتا وہ حکومت نہیں کر سکتا، سیاسیات میں اصل چیز کامیابی ہے اور اس کامیابی کیلئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں"

(تاریخ یورپ صفحہ ۴۴۴)

مہذب دنیا میں اس کے علاوہ ایک ایسے نظریہ اور اصول پر عمل ہو رہا ہے جو اس سے بھی زیادہ عہد و پیمان کو بے وقعت بنا دیتا ہے۔

"جسے طاقت ہے وہ حاصل کرنے کا حقدار ہے اور قبضہ اسی کا ہے جسے قبضہ پر قدرت ہے" (تاریخ یورپ صفحہ ۶۱۳)

"تنازع للبقاء کے محک پر آکر تمام معاہدات کی پابندی ختم ہو جاتی ہے جو بڑی بڑی

سلطنتوں میں طے پا چکے ہوتے ہیں۔" (تاریخ یورپ جدید صفحہ ۶۸۰)

یہ نظریہ محض نظریہ اور اصول تک محدود نہیں اس پر جس شدت سے عمل ہوتا ہے اس کا استقصاء ناممکن ہے، تاریخ تہذیب جدید بد عہدی کے واقعات سے بھری پڑی ہے یہاں ایک دو واقعہ تاریخ یورپ جدید سے مثالاً نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو صحیح اندازہ ہو سکے کہ نظریہ اور عمل میں کتنا کامل اتحاد ہے۔

"وائنا اور محالفہ مقدسہ کے عہدنامجات سلاطین کی باہمی رقیبانہ کشاکش کے خلاف برسرکار لائے گئے تھے۔ اصول قومیت نے ان عہدنامجات کو درہم برہم کر کے رقابت بین الاقوامی کو جگہ دیدی۔"

"۱۸۸۳ء میں اسٹریا، جرمنی، اور اٹلی کے درمیان اتحاد ثلاثہ کے نام سے ایک عہدنامہ ہوا تھا جس کے مقاصد میں سے یہ تھا کہ اگر حلیفوں میں سے کسی ایک پر روس نے حملہ کیا تو اس میں سے ہر ایک متفقہ طور پر اس کا تدارک کریگا۔ مگر جرمنی نے اس معاہدہ کے خلاف روس سے غیر جانبدار رہنے کا ایک خفیہ معاہدہ کر لیا اور محالفہ ثلاثہ کو پس پشت ڈالدیا مئی ۱۹۱۵ء میں اطالیہ نے اسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا حالانکہ اس کا یہ اعلان معاہدہ ۱۸۸۳ء کے بالکل خلاف تھا۔"

شاہ انگلستان اور لوئی چہاردہم کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا جو معاہدۂ ڈوور (Dover) کے نام سے مشہور ہے، شاہ انگلستان نے بوقت ضرورت لوئی چہاردہم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اسلئے ۱۶۷۲ء میں جب فرانس اور ہالینڈ میں جنگ چھڑ گئی تو ہالینڈ تن تنہا رہ گیا بالآخر انگلستان کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کو اس وعدے کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا جو اس نے لوئی چہاردہم سے کیا تھا انگلستان ہالینڈ

پر حملہ کرنے سے تو باز رہا اور کچھ دنوں کے بعد اس کی تائید میں اٹلی فرانس پر حملہ کر بیٹھا۔

یہ نظریے اور واقعات جو ہم نے پیش کئے ہیں مہذب قوموں کے اجتماعی اخلاق کی بنیاد اور انکے قومی اخلاق کا آئینہ ہیں تاہم شخصی اور انفرادی حیثیت سے ان کے نزدیک بھی یہ شرمناک اور قابل نفرت ہے مگر یہ تو اک اندھیر ہے اور تہذیب کی ناقابل تلافی خامکاری ہے کہ جو کام شخصی اور انفرادی حیثیت سے قابل نفرت اور شرمناک ہو وہی کام اجتماعی اور قومی حیثیت سے بے تکلف جائز ہو اس کے کرنے میں کسی قسم کا عیب نہ سمجھا جائے آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ مدبرین سلطنت اور رہبران قوم اپنی شخصی زندگی میں کتنا ہی محاسن اخلاق کا مجموعہ ہوں مگر اپنی سلطنتوں کے مصالح اور مفاد اور اپنی قوم کی سود و بہبود کیلئے جھوٹ بولنا، وعدہ خلافیاں کرنا، ایمان و ضمیر کے خلاف کام کرنا بالکل جائز سمجھتے ہیں اور بے تکلف اسکے مرتکب ہوتے ہیں گویا یہ کوئی اخلاقی جرم نہیں ہے بلکہ تدبیر و سیاست میں سب سے زیادہ دوراندیش اور مدبر وہی سمجھا جاتا ہے جو عہد شکنی میں سب سے زیادہ بیباک ہو لیکن اسلام اس معاملہ میں شخص، جماعت، راعی، رعایا، قوم اور قبیلہ یگانہ اور بیگانہ کسی میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا، نقض عہد اور بدعہدی کو کسی حال میں کسی مقصد کے لئے جائز نہیں قرار دیتا۔

اجتماعی عہد و میثاق کا دائرہ اثر شخصی عہد و میثاق کا اخلاقی تمدن کی تعمیر میں ایک خاص حصہ ہے، مگر اس کا دائرہ محدود ہے اسلئے اسکے اثرات و نتائج بھی محدود ہوں گے لیکن قومی اور اجتماعی عہد و میثاق کا حال اس سے بالکل مختلف ہے اس کی فطرت میں ایک عالمگیر اخلاقی تہذیب و تمدن کی قوت تعمیر پنہاں ہے کیونکہ اسکے ذریعہ مختلف اقوام اور مختلف ممالک کو بہترین دوستانہ فضا میں ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن اور ملکی اور قومی خصوصیات کے مطالعہ کرنے کا پورا موقع ملتا ہے اور بخوبی کے ساتھ ساری ذہنی اور دماغی قوتیں تعمیر میں لگا دیجا سکتی ہیں۔ اجتماعی عہد و میثاق کا اثر صرف ایک جماعت اور ایک ملک ہی پر نہیں پڑتا اس کا اثر ایک قوم و ملک سے گذر کر دوسری قوم

اور ملک پر پڑتا ہے، شخص واحد نے عہد و میثاق کیا ہے اس کا اثر شخصی زندگی کے دائرہ کے اندر محدود ہوگا، ایک خاندان نے کیا ہے اس کا اثر زیادہ سے زیادہ دو ایک خاندانوں تک وسیع ہوگا مگر یہی عہد و پیمان اگر ایک قوم اور ملک کے درمیان ہے تو اس کا اثر لازماً پورے ملک اور قوم پر پڑیگا، ایفاء عہد کی حالت میں اطمینان و سکون دوستی اور دلجمعی کی فضا پیدا ہوگی اور اس کے برعکس بدعہدی کی حالت میں اضطراب، بےچینی اور عداوت کی فضا۔

اسلام کا بلند نقطۂ نظر اسلام چونکہ اپنے پیرؤوں کے اندر ایک عالمگیر صداقت اور راست بازی کی روح پیدا کرنی چاہتا تھا اسلئے اس نے اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر ہر قسم کی بدعہدی کی قطعی ممانعت کردی اور شخصی و اجتماعی دونوں صورتوں میں ایفاء عہد کو لازم قرار دیا اور اس مجرمانہ ذہنیت کی جڑ اکھاڑ کر پھینکدی جس سے قومی اور اجتماعی عہد و پیمان کی روح پامال اور طبعی امن و سکون کی فضا مکدر ہو رہی تھی جو تمدن کی جان ہے مگر تہذیب جدید کی رسائی اس حقیقت تک نہیں ہوسکی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا مقصد اک محدود نقطۂ نظر کی تعمیر ہے بخلاف اسکے اسلام کا مقصد غیر محدود اور عالمگیر انسانیت کے نقطۂ نظر کی تعمیر ہے، پہلا مقصد محدود اور غیر وسیع ہے دوسرا عالمگیر وسیع اور بلند تر، یہی سبب ہے کہ وفاء عہد کے باب میں تہذیب کا قدم شخصی حدود تک پہنچکر رک گیا اور اس وسیع حقیقت تک نہیں پہنچ سکا جہاں اسلام کا قدم پہنچا۔

خطبات مدراس کا نیا ایڈیشن

خطبات مدراس کا مجموعہ جو سیرۃ نبوی کے تمام مباحث کا نچوڑ ہے، اور جو ہر طبقہ کے مسلمانوں میں بیدار ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے، اس کا تیسرا نیا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی کے بعد چھپ کر تیار ہے۔ طلبہ کے مذاق کو دیکھ کر اسکی تقطیع ۱۸×۲۲/۱۸ یعنی چھوٹی رکھی گئی، لکھائی چھپائی کاغذ بہتر، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت عمر

منیجر (دار المصنفین اعظم گڈھ)

ادبیات

غزل

از جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڈھ

کیا ہوا اس شاہد پنہاں کی تمنا مجھکو
نظر آتا نہیں جب اپنا ہی جلوا مجھکو

شورش عشق میں اس کی نہیں پروا مجھکو
حال کیا ہے مرا، کیا کہتی ہے دنیا مجھکو

یوں ہی رکھنا تھا جو محروم تماشا مجھکو
کر دیا کس لئے پھر محو تماشا مجھکو

ہوں میں دیوانہ، مگر ہوش ہے اتنا مجھکو
ذرے ذرے میں نظر آتی ہے دنیا مجھکو

جذبۂ ذوق طلب کی ہے یہ مستی کیا کم
لاکھ رکھے کوئی محروم تماشا مجھکو

اور ہی کچھ ہے مری شورش دل کا عالم
غم بھی آتا ہے نظر کیف سراپا مجھکو

لذت زیست ہے وابستہ بے تابی دل
پھر غم ہجر کا ہو کس سے شکوا مجھکو

مست و رقصاں میں ابھرتا ہی رہا گو ہر چند
موج طوفان حوادث نے ڈبویا مجھکو

تشنہ کامی ہی میں ہے عشق کا کل راز سرور
دے نہ اے ذوق ہوس دعوت صہبا مجھکو

لاکھ سامان تعیش ہو قفس میں لیکن
بھول سکتی نہیں آزادی صحرا مجھکو

نہ تصور ہو کسی کا نہ تمنا ہو نہ یاس
بیخودی چھوڑ دے یوں ہی کبھی تنہا مجھکو

تقریظ و تبصرہ

فکر و نشاط:- جوش ملیح آبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی صفحات ۱۱۵، قیمت عہ

یہ کتاب عرصہ سے سامنے ہی میز پر پڑی ہوئی ہے جلد نہایت خوبصورت، کتابت وطباعت نہایت دیدہ زیب، کاغذ نہایت عمدہ اور کلام جوش ملیح آبادی کا۔ ان میں سے ہر چیز بار بار نگاہ کو دعوتِ نظر دی لیکن سیاست کی ثقیل اور الاصلاح کے خشک طالب العلمانہ مباحث کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دیتے کہ گھڑی دو گھڑی ان چیزوں کو جی بہلائیں۔ آج بہت دنوں کے بعد اسکو اٹھایا ہے کہ یہ صفحات کسی نہ کسی طرح بھر دئے جائیں۔ ہمارے نزدیک ترتیب تقریظ و تبصرہ کی حقدار یہی کتاب ہو سکتی ہے۔ میں اگر کتاب کی قدردانی کا صحیح حق ادا نہ ہو سکے تو کارکنان مکتبہ جامعہ کی کرم نفسی سے امید وار ہیں کہ معاف کر دیں گے۔

جوش صاحب کی شاعری کی یہ خصوصیت ہم کو نہایت پسند ہے کہ وہ ان کے دل کے واردات و تاثرات کی صحیح ترجمان ہے اور ان کی طبیعت اور عمر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، وہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو خود تو بوڑھے ہوں مگر ان کی شاعری جوان ہو، یا خود جوان ہوں مگر ان کی شاعری کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہوں، جوش کے چہرہ پہ کبھی اس قسم کی بناوٹی شکن نظر نہیں آتی۔ ایک سچے شاعر کی طرح (حالانکہ شاعر اکثر جھوٹے ہوتے ہیں) ان کے دل پر جو کیفیات طاری ہوئیں موزوں لفظوں کے قالب میں ڈھل گئیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سوسائٹی پر، اخلاق پر، مذہب پر، دنیا کی روایات پر ان کا کیا اثر پڑے گا جوش اپنے دل کے ترجمان ہیں، دوسروں کے دل کے ترجمان نہیں ہیں بیدھڑک شعر کہتے ہیں، سوسائٹی خفا ہوتی ہے خفا ہو جائے، نظام اخلاق درہم برہم ہوتا ہے درہم برہم ہو جائے۔

پریشاں نفت کرتے ہیں انھیں مطلب ہے شوخی سے
بکھر جائے اگر شیرازۂ عالم بکھر جائے

جوش صاحب کے کلام کے تین مجموعے ہماری نظر سے گذرے ہیں، ایک بہت عرصہ ہوا اور وہی غالباً

پہلا مجموعہ ہے، دوسرا سرسری طور پر، ایک دوست کے ہاتھ میں دیکھا تھا، اور وہ انکی "شبابیات" کا مجموعہ تھا اور تیسرا یہ جو اس وقت پیش نظر ہے۔ ان تینوں میں سے چند ہی چند نظمیں ہم نے پڑھی ہیں، لیکن ہم اعتراف کریں گے کہ جوش قدم بقدم اپنی طبیعت اور عمر کے ساتھ چلتے ہیں۔ چنانچہ جو توقعات اس سے پہلے جوش صاحب کی سرمستیاں دیکھ کر بہت بدحظ ہوئے ہوں گے وہ اس مجموعہ کو دیکھ کر نہایت حیرت کریں گے کہ اب شاعر کے محسوسات کی دنیا بالکل بدل چکی ہے۔ جوانی کی وہ سرمستیاں، اور بیباکیاں جو ان کے کلام کی خصوصیت تھیں اس مجموعہ میں بالکل نظر نہیں آتیں۔ وہ کالی گھٹائیں برس کر کھل گئیں اور عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاعر کی طبیعت نے بالکل دوسرا چولا بدل لیا۔ جوش اب رندی و ہوسناکی کے میکدہ سے نکلکر معرفت کے حریم قدس میں قدم رکھ رہے ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں جو عالم برزخ ہے اس وقت اس کی کشمکش سے دوچار ہیں۔ کہتے ہیں۔

عقل حیران ہے ہو تو کیوں کر ہو،   شرح اسرار بن نہیں پڑتا،
جانتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور،   پھر بھی اظہار بن نہیں پڑتا۔

دل کو اقرار میں تامل ہے
اور انکار بن نہیں پڑتا،

افسوس ہے ان صفحات میں کلام کی مثالیں پیش کرنیکی گنجائش نہیں ورنہ "پراسرار صدا" اور "ناقابل فہم"، اور "کون ہے"، وغیرہ عنوانات سے انھوں نے جو کچھ کہا ہے سننے کے قابل ہے۔

جوش کی شاعری کی ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ امنگ اور حوصلہ سے معمور تھی لیکن اس مجموعہ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے شاعر کے دل کو بالکل توڑ دیا ہے، اب یا تو کوئی ولولہ انگیز منظر اسے نظر ہی نہیں آتا، یا نظر آتا ہے تو نگاہ غم آشنا اس میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو درد و غم کا ڈھونڈھ لیتی ہے۔ ہرچند وہ اپنی "دیدہ دری" سے مایوسی کی تاریکی میں بھی امید کی جھلک دیکھ لیتے ہیں، لیکن اس مجموعہ میں اس طرح کی جو نظمیں ہیں، ان میں وہ زور نہیں ہے جو شاعر کے کلام کی خصوصیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے جوش گری ہوئی طبیعت کو زبردستی سہارا دے رہے ہیں اور وہ سہارا

سکتا نہیں۔

جوش زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب کے داعی ہیں، لیکن اس مجموعہ کی دو نظمیں۔ جو "مفتوحہ خاتون" اور "خاتون مغرب" کے عنوانوں سے لکھی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو ان تک اس قوم میں بعض مستثنیات تھے، یا اب شاعر کی نگاہ اس قدر گہری ہوتی جا رہی ہو کہ ہمارے تودۂ خس و خاشاک کے اندر بھی اسے بعض جواہر ریزے مل جاتے ہیں۔ اس نظم کے چند شعر تو سن ہی لیجئے۔

عورتیں اقوام عالم کی بھٹک جائیں گی جب — تو رہے گی بن کے اس طوفاں میں ایک موج طرب
حسن ہو جائیگا جب بازار کا وقف خاص و عام — دیدنی ہوگا ترے خلوتکدے کا اہتمام
عالم نسواں پہ کالی رات جب چھا جائے گی — یہ ترے ماتھے کی بندی صبح کو شرمائیگی
عورتیں پہنینگی جب اسٹیج پر بار رقص و چنگ — اپنی آنکھوں کی لگاوٹ اپنے رخساروں کا رنگ
انکے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ — اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ
گودیاں پھیلا کے جب مانگیں گی با صدق و صفا — عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا
مژدہ باد اے ایشیا کی دختر پاکیزہ تر! — آنچ آئیگی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر

آگے چلکر فرماتے ہیں۔

اے شعاع ارض مشرق! تیری عفت کا شعار — کج کریگا ملک و ملت کی کلاہ افتخار
آبرو ہوگا گھرانے بھر کی تیرا رکھ رکھاؤ — دیگا تیرا باپ شان فخر سے مونچھوں پہ تاؤ
تیری آنکھوں کی کرن سے لے جہان اعتبار — جگمگائیگی نسب ناموں کی لوح زرنگار
بوالہوس کا سر جھکا دیگی تری ادنیٰ جھلک — ہوگی لہجے میں ترے نبض طہارت کی دھمک

تیری پیشانی پہ جھلکے گا مثال برق طور
طفل کا ناز شرارت اور شوہر کا غرور،

تصویر کا دوسرا رخ "خاتونِ مشرق" بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

سب نو ویس کو اس مجموعہ میں بھی نہیں ملتے ہیں۔ [illegible]

سے عبارت بھی یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔ جوش رنگین و درشت ترکیبوں کے لیے [illegible]

دے خیالات کے لیے بھی ایسا پیرایہ بیان اختیار کر لیتے ہیں کہ آدمی سمجھتا ہے کہ کوئی بہت بھاری بات کہیں گے، حالانکہ بات کچھ نہیں ہوتی مگر اس مجموعہ میں بعض نظمیں نہایت سادہ و شیریں زبان میں ہیں۔

الفاظ کے انتخاب میں جوش بہت احتیاط کے عادی نہیں ہیں۔ کہتے ہیں۔

ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے، سرد ہے
ہندوستاں میں آپ سخنداں ہوئے تو کیا

یہاں غزلخواں اور سخنور وغیرہ کا ہم معنی کوئی لفظ ہونا تھا۔

کیا ہے نسبت بہشت کی تخئیل
دل کو کرتی ہے سنگ میں تبدیل

یہاں تخئیل کا لفظ بالکل بے موقع ہے۔

وہ حلق جس کی گرج میں تھا شور بادِ سموم
نفس کی آمد و شد سے بھی آج ہے محروم

رخ پہ جاتی تھی غنم نے واں کاڑھی
اس طرف تھی گھنی ہوئی داڑھی،

سن مری بات، میرا کہنا مان
یا غفور الرحیم یا رحمٰن

ان شعروں میں خط کشیدہ الفاظ قابل غور ہیں۔ یہ سرسری نگاہ میں بعض چیزیں سامنے آگئی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ غور سے پورے مجموعہ کا جائزہ لیا جائے تو اس طرح کے اسقام بہت ہیں۔ بعض اشعار پر مطلق نظر ثانی نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً

جس کا دل ہو حقیقت وہ رصدگاہ عظیم
جو ہو فطرت کی ہر ایک گردش کا محرم و ندیم

کون رصدگاہ عظیم؟ جوش صاحب نے اس کی تشریح نہیں فرمائی۔ ممکن ہے چھاپہ کی غلطی ہو۔

یہاں تک لکھ چکے تھے کہ دفعتہً ہماری نظر اس نظم پر پڑ گئی جس میں جوش نے نقاد کو مخاطب کیا ہے

"دریا" کو پڑھکر ہم نے محسوس کیا کہ اگر تنقید کیلئے یہ سب شرائط ہیں تو انصاف یہ ہے کہ ہم کو جوش کا کلام پڑھنے کا بھی حق نہیں ہے اس پر لکھنے کا حق تو درکنار۔

ایک عنوان ہے "موسیقی کا جزیرہ" اس کے نیچے جوش نے جو شعر لکھے ہیں ان کو پڑھئے اور داد دیجئے، جو شاعر ایسے اشعار لکھ سکتا ہے اس کے کلام پر اس طرح کی خردہ گیریاں جائز بھی نہیں۔

کانپتی ہیں انگلیاں مطرب کی جب مستانہ وار — راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار

عشق کا جب نغمۂ آہن میں مچلتا ہے لہو — حسن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہے دل کی آرزو

نغمۂ شیریں کا جب گرتا ہے رنگیں آبشار — دل کو چھو لیتی ہے ایک موم سی باریک دھار

درد سے کھاتی ہیں جب موج صبا کی پیچ و تاب — خود بخود اٹھ جاتی ہے جب سلمائے ماضی کی نقاب

دن ہی رہتا ہے نظر کے سامنے باقی نہ رات — ساز کے پردوں میں چھپ جاتی ہے ساری کائنات

بے مئے لغزش کی طرح جس وقت لہراتا ہے دل — ایک جنوں پرور جزیرے میں پہنچ جاتا ہے دل

روح ہوتی ہے جہاں اس گمشدہ شے سے دوچار — جسکے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار

پھر بھی پانے کی طرح اس چیز کو پاتا نہیں،
شکل سی پہچانتا ہوں نام یاد آتا نہیں،

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

تصنیفات استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر نظام القرآن

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتابِ الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ سو تحقیق حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر نظام القرآن سے بڑھکر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں پھر آیات کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ و اسرار اور غوامض و حکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صحیح نقل و صحیح عقل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر سے منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں۔ اہل علم ان کی قدر کریں تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الذاریات:- اس کتاب میں مولف رحمہ اللہ کی عام خصوصیات تفسیر کے علاوہ چند باتیں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے طریقے کے مطابق ابتدائی قسموں کا عمود سورہ سے تعلق نہایت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے اسی ضمن میں تمام اقوام معذبہ مذکورہ قرآن کے اسباب ہلاکت کی تفصیل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقوام معذبہ کی ہلاکت میں ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے بنی اسرائیل کے معدود سے چند واقعات کے ذیل میں "قسمت موت" پر نظریۂ صبر کی عظیم الشان تحقیق بھی اس ضمن میں آگئی ہے "خلق ثمود" اور "خلق زوجین" سے معاد و رسالت پر استدلال کے جو پہلو بیان ہوئے ہیں ان کی قدر صرف اہل ذوق کر سکتے ہیں۔

قیمت:- ۱۰ / ۔ فی سرورق صفحہ ۱۰ مرحلہ۔

جلد ۲ | ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۱۱

فہرست مضامین

شذرات

مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی اصلی راہ تو یہ تھی کہ کوئی مردِ کار اٹھتا اور وہ اپنی مجددانہ دعوت اور پیغمبرانہ عزیمت سے ہمارے مردہ دلوں کو زندہ کر دیتا، ہمارے عقائد کی تمام خرابیاں مٹا دیتا، ہمارے اعمال کی تمام آلودگیاں دھو دیتا، یہاں تک کہ وہ قوم جو آج ہزاروں فرقوں میں بٹ چکی ہے ایک جسم کے اعضاء جوارح کی طرح جڑ جاتی۔ جو آج ہزاروں سمتوں اور ہزاروں راہوں میں بھاگ رہی ہے صرف ایک ہی صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاتی۔ جس نے آج لاکھوں اصنام تراش لئے ہیں سب کو توڑ کر بس ایک ہی حیّ و قیوم کے سامنے جھک جاتی، جو آج لاتعداد قانونوں اور آئینوں کی محکوم ہے وہ صرف ایک ہی ملکوتی اسوہ کی متبع ہو جاتی، جس پر آج جمود و تعطل کی موت طاری ہے اس میں ایک حساس اور فعال روح دوڑ جاتی، اور پھر وہ طوفان بنکر نہیں بلکہ رحمت کا ابرِ کرم بنکر اٹھتی اور عالم کے گوشہ گوشہ پر چھا جاتی اور تمام دنیا نیکی اور عدل سے بھر جاتی۔ نہ کمیونزم باقی رہتی نہ سوشلزم، نہ فیشزم باقی رہتی نہ ہٹلرزم۔ اس کا بے پناہ سیلاب دنیا کے سارے فتنوں کو بہا لیجاتا۔ تمام طاغوتی طاقتوں کو توڑ کر رکھ دیتا۔ اور خدا کی زمین میں صرف خدا کا قانون حق و عدل نافذ ہو جاتا۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

کتنی اچھی آرزوئیں ہیں!

اے دل من چہ آرزوئے خوش است!

اے کاش یہ پوری ہو جائیں! پوری نہ ہو جائیں ان کے آثار ہی نظر آئیں، آثار بھی نہ سہی اس کے امکان ہی کی کوئی تجلی ہم ذرا دیکھ لیں۔ پھر ہم اپنے زبان و قلم کی پوری طاقت سے اپنی قوم کو دعوت دیں گے کہ

ن گوشہ سے یہ کرنیں نمودار ہوں، پس اس سمت کو دوڑ کھڑی ہو اور جو فئۃ صالحہ ان پاک اور بلند مقاصد کے لئے اپنا سفر شروع کرے، خواہ اس کی تعداد کتنی ہی قلیل ہو، اس کا سروسامان کتنا ہی کم ہو، اور اس کی منزل کتنی ہی کٹھن ہو لیکن اسی کا ساتھ دے۔ اس آسمان کے نیچے حق صرف اسی جماعت کے ساتھ ہے اور بالآخر یہی جماعت غالب اور فتحمند ہوگی۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

لیکن یہ جماعت کہاں ہے؟ دنیا کے کس گوشہ میں ہم اس کو ڈھونڈنے جائیں؟ ہم اس جماعت کے عشق وطلب میں تڑپ رہے ہیں، تم ہمارا ہاتھ پکڑ کر اس تک پہنچا دو، ممکن ہے تم کہو، یہ جماعت ابھی موجود نہیں ہے۔ بنانی چاہئے۔ لیکن یاد رکھو، اس طرح کی جماعتیں بنائی نہیں جاتیں۔ خدا کی طرف سے مبعوث ہوتی ہیں۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب خدا کسی قوم پر مخصوص مہر و نوازش فرمائے۔ ہم اتنا تو ضرور کر سکتے ہیں کہ اپنے گھروں کو مٹی کے چراغوں یا بجلی کے قمقموں سے روشن کرلیں، لیکن ان کو جگمگا دینے کے لئے آفتاب یا ماہتاب نہیں نکال دے سکتے۔ مشرق سے سورج کو لانا اور شب کی تاریکیوں کو چاند کی ضیا پاشیوں سے کافور کر دینا تو بس تنہا اسی کے بس کا معاملہ ہے جو سورج اور چاند کا خالق ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس جماعت کو بنانے کے لئے دوسروں کو مشورے نہیں دیئے جاتے یعنی اگر آپ نے اخباروں یا رسالوں میں مضامین لکھ دیئے کہ صحابہ کے انداز کی ایک جماعت بنانی چاہئے۔ تو یہ نہ سمجھئے کہ آپ نے کوئی تیر مار دیا، اس آرزو سے کسی مسلمان کا دل بھی خالی نہیں ہے۔ اس راہ کی اصلی مشکل یہ نہیں ہے کہ یہ نکتہ سمجھنے والے موجود نہیں ہیں۔ اس کو تو سب ہی جانتے ہیں اور سب ہی چاہتے ہیں لیکن چاہنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے۔ جو لوگ آج دوسری راہوں پر لگ لئے ہیں ان کو سمجھ لیجئے کہ وہ اس دشوار گذار منزل کی ہمت اور مصیبتوں کے لئے اپنے کو اہل نہیں سمجھتے۔ اب اگر آپ میں ہمت ہے تو یہ نہ کہئے کہ یہ ہونا چاہئے۔ بس اس راہ پر چل کھڑے ہوجئے اگر آپ سچے ہیں اور عزم راسخ رکھتے ہیں تو بغیر کسی دعوت و تبلیغ کے تمام دنیا کے دل آپ کی طرف کھنچ جائیں گے، اور اگر محض باتیں بنانی ہے تو باتیں بنانے کے لئے یہ عنوان برا نہیں۔ آخر آدمی باتیں بنائے تو اچھی ہی باتیں کیوں نہ بنائے!!

ظاہر ہے کہ جو لوگ معاملہ کو اس نظر سے دیکھ رہے ہوں۔ ان کے سامنے مسلم لیگ اور کانگریس کا نام بھی نہیں آنا چاہیے۔ ان دونوں اداروں میں سے کسی ادارہ کو بھی ہمارے ان مقاصد سے کوئی ادنیٰ شائبہ تعلق بھی نہیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ صحابہ جیسی مقدس جماعت کے سراغ میں نکلے تھے اور جن کی نگاہ کی آسمان پیمائی و مقصد کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ سدرہ و طوبیٰ سے نیچے کی بات بھی نہیں کرتے تھے، دفعتہً مسلم لیگ کو پا کر اس طرح خوشی سے بے قابو ہو گئے ہیں گویا خیر القرون کے غزاۃ و مجاہدین کا کوئی مقدس قافلہ اس بیسویں صدی میں لکھنؤ سے گذر رہا تھا اور ہمارے یہ مقدس متلاشیان حق کہیں اس سے دوچار ہو گئے ہیں۔ بس اب مگن ہیں کہ یوسف گم گشتہ مل گیا اور سمجھتے ہیں کہ جو مسلمان ان کی دید سے محروم رہا وہ دین و دنیا کی تمام سعادتوں سے محروم رہا۔ اب نجات کی راہ صرف ایک ہی ہے کہ ہر آدمی مسلم لیگ کا کلمہ پڑھے اسی سے مسلمانوں کے تمام اعمال و عقائد اور تمام احوال و معاملات درست ہو جائینگے۔ انکی سوئی ہوئی قسمت جاگ جائے گی۔ اور مدینہ، دمشق، بغداد، سمرقند، دہلی اور مصر و اندلس کے جو افسانے آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں ان کو اپنی آنکھوں سے لکھنؤ میں دیکھیں گے! اور اس نئے اسلامی مرکز خلافت کے امیر المومنین، ہماری دینی کشتی کے ناخدا مسٹر محمد علی جناح ہوں گے۔

دراز دستی این کوتہ آستیناں بیں!

لکھنؤ میں لیگ کا جو جلسہ ہوا اس پر بعض لوگوں کو نہ صرف اعتما بلکہ بڑا ناز ہے۔ لیگ مسلمانوں کے پولیٹیکل ادارہ کی حیثیت سے تو خیر بہت دنوں سے معروف ہی لیکن لکھنؤ کے جلسہ کے بعد سے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کا حق بھی اب اسی کو حاصل ہو گیا ہے۔ اب صرف اسی کو حق ہے کہ تمام شرعی معاملات پر حکم لگائے اور لوگوں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرے۔ اس نے مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اداروں کا حق نمایندگی سے محروم کر کے سب کی ذمہ داریاں تنہا اختیار کرلی ہیں۔ اب وہ صرف مسلم لیگ نہیں ہے۔ بلکہ "مقدس مسلم لیگ" ہے۔ جن طلبہ نے رومن امپائر کی تاریخ پڑھی ہوگی وہ جانتے ہیں کہ ایک زمانہ میں رومن امپائر نے اپنا نام "ہولی رومن امپائر" (مقدس رومن شاہنشاہی) اختیار کرلیا تھا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ اب جبکہ لیگ نے از راہ نوازش ہماری دینی پیشوائی کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لی ہیں تو اپنے نام کے آگے ہولی (مقدس) کا لفظ بھی بڑھالے تا کہ اسکے نام ہی سے واضح

ہوگئے کہ وہ مسلمانوں کی جامع الشروط خلافت مقدسہ ہے۔ بجنور میں ہم لیگ کے مجاہدین و غزاۃ اور اس کے متقیوں کا رنامے دیکھکر نہایت محظوظ ہوئے۔ الحمدللہ فتوے دینے میں سب طاق ہیں۔ یہ لوگ اپنے ووٹروں کو نجات کا پروانہ راہداری (passport) بھی بانٹتے ہیں، گو اس کیلئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت تو مسلمانوں کے ایک ہی پیشوائے دینی جناب آغا خان عالیجناب کی ہوتی لیکن بیچارے کو تو یورپ کی فتوحات سے فرصت نہیں۔ تاہم جو لوگ اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں، پوری قابلیت کیساتھ انجام دے رہے ہیں۔ ایک عظیم ہستی کی نگرانی میں محکمۂ احتساب (Inquisition) بھی قائم ہے اور جبکہ مجروح سینے، زخمی سر، اور بیجان لاشیں بھی شفاخانوں میں تڑپ رہی ہیں تو کون انکار کرسکتا ہے کہ تاریخ نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں جو سبق یورپ میں پڑھے تھے، ان کو اس بیسویں صدی میں ہندوستان میں نہیں دہرا رہی ہے۔!

لیکن "ہولی رومن امپائر" پر جو تبصرہ والٹیر نے کیا تھا، وہی تبصرہ ہمارا "مقدس مسلم لیگ" پر ہے۔ اس نے کہا تھا "نہ یہ مقدس ہے، نہ رومن ہے، نہ شہنشاہی ہے"۔ ہم کہتے ہیں کہ نہ تو یہ "مقدس ہے"، "نہ مسلم ہے، نہ لیگ ہے"۔ یہ عافیت پسندوں، خوشامدیوں، خوش خوراکوں، نوابوں، سروں، راجاؤں کی ایک تفریح ہے۔ یہ جو آج اس میں کسی قدر ہما ہمی نظر آتی ہے تو اسکا باعث محض یہ ہے کہ کانگریس کے اقتدار نے سرمایہ داروں اور دولتمندوں کو بدحواس کر دیا ہے۔ اب وہ کچھ چیخنا چلانا چاہتے ہیں لیکن انکا چیخنا چلانا بالکل ویسا ہی ہے جیسے چور کسی کوئی جماعت کو توال کو دیکھکر "چور چور" چلانے لگے کہ وہ خود چور سمجھکر نہ پکڑا جائے۔ یہی حرکت لیگ والے بھی کر رہے ہیں۔ "کسان" "مزدور" "انصاف" "مذہب" وغیرہ جیسے عجیب غریب الفاظ آج ان حلقوں سے نکل رہے ہیں جو کبھی خدا اور انصاف کے نام سے آشنا نہ ہوئیں جنھوں نے اپنی نفس اور انگریزی گورنمنٹ کی غلامی اور انگریزی کلچر اور تمدن کی مشاطگی کے سوا کوئی کام بھی بھلے آدمیوں کا نہیں کیا۔ یہ حضرات تڑپ رہے ہیں کہ مذہب خطرہ میں ہے، بیقرار ہیں کہ اسلامی کلچر تباہ ہو رہا ہے، غمگین ہیں کہ اردو کی جگہ ہندی لے رہی ہے، دردمند ہیں کہ عربی زبان تمام ہندوستان کی زبان کیوں نہیں ہے، اندوہگیں ہیں کہ تمام مسلمان ہندو ہو رہے ہیں، متاسف ہیں کہ محمود غزنوی، شہاب الدین، بابر اور اکبر و عالمگیر کے بعد اب مسلم لیگ کی حکومت کیوں نہیں قائم ہے؟ اور ان لوگوں کے نزدیک ان تمام جرائم کے ذمہ دار

مولانا حسین احمد، ارکانِ جمعیۃ علمائے ہند، اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہیں! ایک دن وہ بھی تھا جب آپ ان کے عمل پر چلاتے تھے کہ مسلمان مغربی تہذیب و تمدن اور عیسائیت کے سیلاب میں بہہ رہے ہیں تو یہی تھے جو عیسائیت اور فرنگیت کے علمبردار تھے اور مولویوں کی چیخ پکار پر غصہ سے اپنے سر نوچتے تھے کہ یہ دیوانے مسلمانوں کو ترقی کی جنت سے روکتے ہیں۔ لیکن اب یہی ہیں جو اسلامی کلچر اور اسلامی روایات و تمدن کے لیے اگلے زمانہ کے مسلمانوں سے زیادہ سرگرم ہیں۔ لیکن ہم ان حماۃ دین سے صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ کل جب آپ عیسائی بنتے نہیں شرمائے، مسلمانوں کی فرنگیت آپ کی نظر میں نہیں آزردہ ہوئے عربی تمدن، عربی علوم، اور قرآن کی تباہی میں آپ کے شریک رہے تو آج ہندو ہونے سے اس قدر شرم کیوں ہے؟ کفر و شرک ہونے میں تو دونوں برابر ہیں۔ کیا محض اس لئے کہ عیسائی ہونے میں صرف خدا کی ناخوشی تھی لیکن یہ دنیاوی آقا خوش تھے۔ اور ہندو ہونے سے ڈاؤننگ اسٹریٹ کے صنم اکبر کا قہر و غضب بھڑکتا ہے!!

لوگوں کو بڑا ناز ہے کہ لیگ نے لکھنؤ میں وہ تجویزیں پاس کر دی ہیں کہ جن کے بعد اب کانگریس بھی اس کے سامنے گرد ہے۔ اب وہ مکمل آزادی بھی چاہتی ہے اور مزدوروں و کسانوں کی ہمدرد بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی ہندوستان میں تنہا محافظ جماعت ہے اب ایک طرف انگریزی گورنمنٹ سے غزوہ کرے گی کہ وہ مکمل آزادی دے کر ہندوستان سے رخصت ہو جائے، دوسری طرف ہندوؤں سے جہاد کرے گی کہ وہ تمام اقلیتوں کے حقوق پہلے سے بانٹ دیں۔ تیسری طرف ایک خانقاہ تعمیر کرے گی جس میں ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمانوں کو جمع کر کے ان کو اصحاب صفہ کی طرح دینی تعلیم و تربیت کا ایک کامل نمونہ بنا دے گی۔ معلوم نہیں ہم جیسے بدقسمت لوگ، لیگ کی ان پیغمبرانہ کارفرمائیوں کو دیکھنے کے لئے زندہ رہیں گے یا نہیں۔ کیسے مبارک دن ہوں گے! اور ایسا مسعود زمانہ ہوگا! حضرت مسیح نے "آسمان کی بادشاہت" کے نام سے شاید اسی دور کی بشارت دی تھی!! پھر یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ یہ سب کارنامے حسین احمد، ابوالکلام، کفایت اللہ، احمد سعید نہیں انجام دیں گے۔ یہ تو سب ہندوؤں کے غلام ہیں، کافر و بیدین ہو گئے ہیں! اس کے لئے مسٹر جناح، فضل حق، سر سکندر، راجہ محمود آباد جیسے مجددین ملت اور مصلحین امت میدان میں آئیں گے!۔

لیکن ہم نے لیگ کا چہرہ غور سے دیکھا ہے جھریاں صاف نمایاں ہیں، البتہ اس نے پوڈر ضرور مل لیا ہے اور یہ پوڈر غالباً اسی آنند بھون سے چرایا گیا ہے جس کے حریفانہ چشمک نے لیگ کو ان نئے زیوروں سے مسلح ہونے پر مجبور کیا ہے۔ ہاں اتنی بات نئی ہے کہ اب سینہ پر صلیب کے نشان کے بجائے بغل میں تسبیح و سجادہ ہے۔ وہی تسبیح و سجادہ جو کل تک دقیانوسیت کی یادگار تھا۔ جو مسلمانوں کی بربادی کا تنہا باعث تھا۔ لیکن آج لیگ

بہت محبوب تھے آپ سمجھے ان چیزوں کی لیگ کو کیوں ضرورت پیش آئی؟ کامل آزادی کا پودا اسلئے لگایا گیا ہے کہ بغیر اسکے نوجوانوں کو شکار کرنا ناممکن تھا۔ اور تسبیح وسجادہ بغل میں اسلئے ہے کہ بغیر اسکے الکشن جیتنا ناممکن ۔ پھر اسپر غضب یہ کہ اب فیس بھی صرف دو ہی آنہ ہے یعنی کانگریس سے بھی کم۔ غور کرو اس ارزانی کے ساتھ ساتھ جب لیگ کی دلربائیوں اور ہوش فگنیوں کا یہ عالم ہوگا تو کون ہے جو اپنے صبر و تقویٰ کو سلامت بچا کے لیجا سکے گا۔

الوداع اے صبر و تقویٰ الوداع اے ہوش و دیں!

گویا آجتک لیگ پر صرف یہ الزام تھا کہ اسکا نصب العین بلند نہیں ہے۔ لیکن جبکہ اس نے اپنا نصب العین اونچا سے اونچا قرار دے دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اب تمام مسلمان اسکے اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہو جائیں۔ بلاشبہ لیگ کا نصب العین اب بہت بلند ہو گیا ہے لیکن خدارا یہ بھی ارشاد ہو کہ کیا لیگ والوں کا نصب العین بھی بلند ہو گیا ہے۔ کاغذ پر تو سیاہ نقوش بہت ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم نے دیکھے لیکن دلوں میں بھی جرأت حق کی کوئی کرن اتری ہے؟ زبانوں کی روانی اور تقریروں کی بے پناہی تو اللہ اکبر! طوفان ہے طوفان! پنجاب سے لیکر بنگال تک سب دہل گئے! لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ہاتھوں کی چابکدستی اور پاؤں کی پھرتی و چستی کا کیا حال ہوتا ہے۔ انکی جہانگیری صرف کھانے کی میزوں اور اسمبلی کی گیلریوں ہی تک ہے، یا کچھ ان سے آگے بھی۔ سنتے ہیں مسٹر جناح کی خدمت میں تلوار پیش کی گئی اور انھوں نے تلوار بڑی خوشی سے قبول فرمائی، بعض بزرگوں کا ادب مانع ہے ورنہ حضرت سعدی کا ایک مصرع بالکل زبان ہی پر ہے۔ لیکن کچھ سنا آپنے؟ اس تلوار کو پاکر آپ کیا کریں گے؟ مصطفیٰ کمال بنیں گے؟ کون مصطفیٰ کمال؟ وہی "بے دین" ترک جس نے ٹرکی میں اسلامی خلافت، اسلامی تمدن، عربی زبان، عربی مدارس، عربی دینی علماء سب کو پیس کے پامال کر دیا۔ آپ بھی مصطفیٰ کمال بنیں گے۔ اور ہندوستان میں ہمارے ان دوستوں کی آرزوئیں پوری ہونگی جنھوں نے پہلی صدی ہجری کے بعد سے یہ قسم کھا کے آنکھیں بند کر لی تھیں کہ جبتک دنیا میں ایمان و صداقت کی بہار پھر نہ لوٹے گی اسوقت تک آنکھیں نہ کھولیں گے۔ اب وہ آنکھیں کھولیں کہ وہ دور میمون آگیا۔ اور وہ مؤید بروح القدس پیدا ہو گیا جو دنیا کو پھر ایمان اور نیکی سے بھر دے گا!

مبارک تھے وہ جو سوکے رہے کیونکہ اب انکی آسودگی کا وقت آگیا ہے!!

مسلم (بانکی پور پٹنہ) نہایت عمدہ اخبار ہے۔ اس کا مسلک نہایت مستقیم ہے اور ادھر
اس نے نہایت حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سیاسی بلندی کے ساتھ ساتھ اب اس میں کافی ......
پیدا ہوگئی ہے اور ہم کو یقین ہے کہ اسکے کارکنوں نے اگر استقلال، پامردی اور ایثار و سرگرمی کیسا
تو انشاءاللہ یہ اخبار نہ صرف بہار بلکہ پورے ہندوستان کے اردو اخبارات میں نہایت بلند جگہ
بہار کے بعض حلقوں میں اسکی مخالفت کیجارہی ہے اور شاید کچھ لوگ اسکو بائیکاٹ بھی کرنا چاہتے ہیں
امرا بدالافق اعتنا نہیں۔ اگر مسلم کے کارکنوں نے اسکو اہمیت دی یا اس سے بددل یا ہراساں ہوئے
کا مشغلہ ترک کرکے کوئی اور دھندا اختیار کرنا چاہئے۔ اس راہ کی تو پہلی منزل ہی اسی خارزار سے شروع
جس اخبار یا رسالہ کو یہ افتاد نہ پیش آئے سمجھ لو کہ وہ اخبار نہیں محض کاغذ کا پرزہ ہے۔ بس حق و صداقت
خدا مدد کرے گا۔

اس سے کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ ہمیں مسلم کی ہر بات سے اتفاق ہے۔ ہمیں اسکی بہت سی باتوں
ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ اسکی غیر معتدل نکتہ چینیوں اور بدگمانیوں سے ہم کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔
ہے کہ کسی اخبار میں یہ بات نہ ہو لیکن اس وبائے عام میں کون مبتلا نہیں !!

بہر حال اس ابتلا میں ہمارا ناچیز مشورہ تو بس یہ ہے کہ

اذا ھم القی بین عینیہ عزمہ ونکب عن ذکر العوا

تفسیر سورۃ الفیل اردو نومبر کے اخیر تک شائع ہو جائیگی اور وسط دسمبر تک
سورۃ الکافرون اور سورۃ العصر کے ترجمے بھی چھپ جائیں گے تفسیر سورۃ الفیل ۱۲۳ صفحات
الکافرون اور والعصر کی قیمتوں کا اعلان انشاءاللہ دسمبر کے پرچہ میں ہو سکے گا۔ ۵

معارف قرآن

تفسیر سورہ عبس

(۳)

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ امین احسن اصلاحی

ان آیات کا باہمی نظم اور پیش و عقب سے تعلق

۹ پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن مجید نہایت بلند و برتر کتاب اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کے بعد اس نعمت عظمیٰ سے انسان کی بے پروائی کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے اپنی قدرت کاملہ کے پہلو بہ پہلو انسان کے عجز و درماندگی کا حال بیان کیا تاکہ کمال فضل و احسان کے آئینہ میں انسان اچھی طرح دیکھ لے کہ باہمہ ضعف و عجز اس کی بدبختیوں اور ناسپاسیوں کا کیا عالم ہے۔

اور چونکہ اسلوب بیان مقتضی تھا کہ انسان ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرے اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا شکر گذار ہو اس لئے اس کے بعد فرمایا [ما اکفرہ] انسان کتنا ناشکرا ہے! یعنی ان تمام افضال و عنایات کے باوجود اس کی ناسپاسیوں اور کفر و عصیان کا معاملہ کتنا عجیب ہے!

[من نطفۃ] سے لیکر [فاقبرہ] تک غور کرو تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ان چند لفظوں کے اندر انسانی زندگی کے تینوں مرحلے۔ اول، وسط، آخر، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اس تھوڑے سے پانی سے پیدا ہوا، جو خدائے حکیم و قدیر کی حکمت و قدرت سے تمام جسم کے اطراف سے چھن چھن کے جمع ہوا۔ اس کے بعد اس پر اللہ تعالیٰ کے تمام تصرفات جاری ہوئے۔ یہ تمام تفصیل جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، لفظ "نطفۃ" سے سمجھی جاتی ہے۔

مرحلۂ وسطی یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و فعل کے تمام گوشوں میں جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر سے کرتا ہے، بغیر اس کے اس کو کسی چیز پر بھی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

آخری مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مارتا ہے، اور قبر میں رکھواتا ہے۔ اس سے انسان کی کمال بے بسی اور عجز و درماندگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یکسر اپنے پروردگار کے قبضہ و تصرف میں ہے۔

ان حالات کے بعد، جو خدا کی قدرت اور پروردگاری پر مختلف جہت سے دلیل ہیں، یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے کے لئے ایک دن اٹھائے گا کیونکہ جو انسان مخلوق و مصنوع ہے، اور زندگی و معیشت کے تمام گوشوں میں خدا کی بخشی ہوئی توفیق کی رہنمائی رکھتا ہے، عبث نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لئے پرسش اور جزائے اعمال کا بھی ایک دن ظہور میں آئے۔

اب پورے سلسلہ پر غور کرو کہ انسان اپنے آغاز کے روز اول سے لیکر اپنے اٹھائے جانے کے دن تک کس طرح عاجز و درماندہ ہے اور تمام حالات کس طرح اس کی بے بسی پر دلیل ہیں؟ پھر اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے رب سے بے نیاز ہو جائے اور اس نعمت سے منہ پھیرے جو اس زندگی میں اس کیلئے توفیق و رہنمائی کی سب سے بڑی روشنی ہے تو اس کی محرومیوں کا کیا حال ہوگا!

اِن دلائل کے ذکر کے بعد کلام ان دلائل کی طرف متوجہ ہوگیا ہے جو انسان اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے اور جن سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ وہ خدا کا مخلوق بندہ ہے اور اسی کی بخشی ہوئی روزی سے پلتا ہے۔ اور ان کے ذکر کا منشا محض یہ ہے کہ انسان کی نافرمانی اور ناشکر

کی شناعت پوری طرح واضح ہو جائے۔ فرمایا:-

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ (۲۳) فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (۲۴) أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۲۶) فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا (۲۷) وَعِنَبًا وَقَضْبًا (۲۸) وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا (۲۹) وَحَدَائِقَ غُلْبًا (۳۰) وَفَاكِهَةً وَأَبًّا (۳۱) مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (۳۲)

ہرگز اس نے پورا نہ کیا جو اس نے فرمایا (۲۳) انسان اپنی غذا پر نگاہ کرے (۲۴) ہم نے پانی کو گرایا (۲۵) پھر زمین کو پھاڑا (۲۶) پھر اس میں اگائے اناج (۲۷) اور انگور اور ساگ (۲۸) اور زیتون اور کھجور (۲۹) اور گھنے باغ (۳۰) اور میوے اور دوب (۳۱) تمھارے اور تمھارے مویشیوں کے برتنے کے لئے (۳۲)

الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

(از آیت ۲۳ تا ۳۲)

[کلا] انسان کی بے پروائی اور نافرمانی پر زجر و تنبیہ ہے۔ بعد کے الفاظ سے اسکی تشریح ہو جاتی ہے۔

[لما یقض] یعنی اپنی نافرمانی کی حالت پر برابر قائم ہے۔

[ما امر] یہ فطرت کے الہام اور وحی و تنزیل دونوں کو عام ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں شکرگذاری اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ الہام فرمایا ہے اور انبیاء کے واسطہ سے جو اوامر و نواہی بھیجے ہیں سب اس کے تحت میں آجائیں گے۔

[انا] یہ اور اس کے بعد کے جملے طعامہ سے بدل کے محل میں واقع ہیں یعنی انسان ان تمام چیزوں پر نگاہ کرے

حبیب (انا صببنا) بہت زیادہ پانی بہایا۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وانزلنا من المعصرات
... ثجاجا

[ثم شققنا الارض شقا] شق کا لفظ زمین کے لئے مختلف اعتبارات سے استعمال کیا گیا ... بارش ہوتی ہے زمین کے مسامات اس کو پی لینے کے لئے کھل جاتے ہیں (۲) زمین کو پھاڑ کر ... نے اس میں نہریں اور ندیاں جاری کیں۔ چنانچہ عربی میں بحر اور نہر کے الفاظ بھی اسی ... دلالت کرتے ہیں۔ نہرہ کے معنی ہیں شقہ اسی طرح بحرہ کے معنی ہیں شقہ (۳) نباتات زمین کے نیچے سے ابھرتی ہیں اور اوپر سے سطح پھٹ جاتی ہے اور پھر طرح طرح کی سبزیاں اور اناج اگتے ہیں (۴) کسان بونے سے پہلے ہل کے ذریعہ زمین کو پھاڑتا ہے۔

یہاں یہ تمام مفہوم لگتے ہوئے ہیں اس لئے ایک ایسا جامع لفظ استعمال فرمایا جو تمام مفہوموں پر حاوی ہوگیا۔

[قضبا] وہ نبات جو بالکل تر و تازہ حالت میں کھائی جائے۔ قضب کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ یہ مفہوم لفظ قضب کے آہنگ سے کس قدر مناسب ہے۔ مقضب کے اندر بھی یہ مناسبت موجود ہے۔ یہ لفظ نہایت جامع ہے اس میں وہ تمام چیزیں آجائیں گی جو تازہ اور شاداب حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

[حدائق] جمع ہے حدیقہ کی۔ حدیقہ کے معنی ہیں گھرا ہوا باغ۔ اشجار پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔

[غلبا] اغلب کی جمع ہے۔ اغلب موٹی گردن والے کو کہتے ہیں۔ حدائق کے لئے غلب کی صفت دو پہلوؤں سے آسکتی ہے۔ یا تو حدائق کو جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، اشجار کے معنی میں لیا جائے۔ یا یہ جیسا کہ معروف اسلوب ہے، شی کی صفت اس کے متعلق کی صفت سے بیان کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک پہلا زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جسقدر چیزیں بیان ہیں سب نباتات کی قسم کی ہیں۔ ... مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حدایق سے اشجار مراد لئے جائیں۔ پھر فعل بھی انبتنا استعمال ...

جو اشجار کے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

[ابّا] ابّ، تر و تازہ اور شاداب گھاس۔ یہ اب یوب ابا و اباتہ سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور نمودار ہونے کے ہیں۔ یہ قدیم مادہ ہے جس پر بعض لسانی تصرفات ہو جانے کی وجہ سے بعض حالتوں میں اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اور عربی زبان میں یہ تصرفات بہت عام ہیں۔ مثلاً امّ و ہمّ، ہبّ و تاہب، پس اب درحقیقت ہب کی ایک شکل ہے۔ عربی میں اس طرح کے تصرف کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ہزّ و ازّ واراق و ہراق۔ اعشیٰ کا مصرعہ ہے ع اخ قد طوی کشحا و اب لیذہبا
اب یعنی اٹھا اور ارادہ کیا۔ شاداب گھاس کو اب اس لئے کہتے ہیں کہ بارش کے بعد یہ سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اسی سے ابان النبات کا لفظ پیدا ہو گیا۔ پھر کسی قدر توسیع کر کے ابان الشباب بھی بولنے لگے۔ آہستہ آہستہ ہر چیز کے اول وقت کیلئے استعمال ہونے لگا۔

جوہری وغیرہ کا خیال ہے کہ ابان مادہ ابن سے بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابنہ بشئی کے معنی ہیں اس کو کسی بات کی تہمت لگائی۔ یہ ابنۃ سے ہے جو اس گرہ کے لئے بولا جاتا ہے جو لکڑی میں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اب سے فعلان کا صیغہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان نہایت گہری معنوی مناسبت موجود ہے۔ یہ مادہ عبرانی زبان میں بعینہ اسی معنی میں پایا جاتا ہے۔ אבב (اب ب) אב (اِب) ترکاری اور پھل אביב (ابیب) سبزیاں اور یہودیوں کے پہلے مہینہ ربیع کے لئے مستعمل ہے اس لئے کہ وہ نباتات کی روئیدگی اور نمو کا اولین مہینہ ہے۔ اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ یہ مادہ عربی زبان میں مستعمل ہے لیکن اشعار میں اس کا استعمال کم ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت میں اس کے نہایت ہلکے مترادفات موجود تھے۔ لیکن جہاں ایک جامع لفظ کا استعمال ناگزیر اور حسن موقع مقتضی ہوا یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ مختلف وجوہ مقتضی تھے کہ یہی لفظ استعمال کیا جائے۔ اگلی فصل میں اس کی تفصیل آئیگی۔ پس یہ بات

کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس لفظ سے ناواقف تھے۔ اس روایت کا پہلا حصہ منقطع ہے اور دوسرا حصہ مضطرب۔ اور وجوہ ذیل اس بات پر نہایت واضح دلیل ہیں کہ بالکل ضعیف ہے۔

۱۔ یہ سورہ مکی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہؓ کا اصلی مشغلہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا تھا۔ اگر یہ لفظ ان کو معلوم نہ تھا تو اس قدر طویل صحبت کے باوجود انھوں نے اس کو آنحضرت صلعم سے کیوں نہیں دریافت کیا۔ اور آنحضرت صلعم نے ان کو کیوں نہیں بتایا؟ کیا صحابہؓ قرآن مجید سے بالکل غافل تھے کہ جب آنحضرت صلعم کی وفات ہو چکی تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ لفظ بغیر تحقیق کے رہ گیا۔ اور اس وقت ان کو اس کے عدم علم کا اعتراف کرنا پڑا!

۲۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت واضح اور سہل ہے۔ اشعار اور خطبات کی جو عام زبان تھی اسی زبان میں نازل ہوا۔ پھر عکاظ میں شعراء کے جو کلام پیش ہوتے ان کے حسن و قبح کا فیصلہ قریش ہی کرتے۔ حضرت ابو بکرؓ کا شمار عرب کے مشہور سرداروں اور خطیبوں میں تھا اور حضرت عمرؓ تو گویا قریش کی زبان اور ان کے ترجمان تھے۔ کلام پر ان کی تنقیدیں معلوم ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے معاملہ میں ان کا رتبہ کس قدر بلند تھا۔ پھر حیرت ہے کہ یہ ماہرین ادب و لغت قرآن مجید کے ایک لفظ سے بالکل بے خبر رہ گئے۔

۳۔ قرآن مجید عرب کی نہایت معروف اور کھلی ہوئی زبان میں اترا تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ دین کی دعوت دی جائے اور لوگ اس کی تعلیمات کو سمجھیں۔ اس بات کو خود قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:۔ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ۔ ایک دوسری جگہ فرمایا:۔ انا جعلناہ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون۔ ہم نے اس کو بنایا عربی قرآن تاکہ تم اس کو سمجھو۔ پس یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید

ایسے لفظ استعمال کرے جن کے معانی پر بڑے بڑے صحابہ نہ مطلع ہوسکیں؟ یہ بات تو اس کے عربی مبین ہونے کے صریح منافی ہوگی۔

۴۔ جن لوگوں نے یہ روایت گڑھی ہے انھوں نے اس کو اکابر صحابہؓ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ جو لوگ صحابہ پر طعن کے شایق تھے وہ بیشتر بڑے صحابہؓ ہی کو تاکتے تھے۔

[متاعًا] متاع اصل میں مصدر ہے۔ پھر یہ بطور اسم ہر اس چیز پر استعمال ہونے لگا جو برتی جائے۔ یہیں سے ساز و سامان اور سرمایہ کے لئے بولا جانے لگا۔ اس لفظ کے اندر قلت مدت کا مفہوم بھی چھپا ہوا ہے۔ کبھی تو یہ مفہوم تصریح کے ساتھ ظاہر کر دیا جاتا ہے اور کبھی اس میں مقدر ہونے کی وجہ سے نہیں ظاہر کیا جاتا۔ یہ بات قرآن مجید کے استعمالات سے بالکل واضح ہے۔ متاع فی الدنیا ثم الینا مرجعهم یعنی تھوڑے دنوں کے لئے دنیا کی زندگی میں برتنا ہے، پھر ہمارے پاس لوٹائے جائیں گے پس یہاں متاعا لکم میں دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مصدر مانا جائے جیسا کہ یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمی میں ہم پاتے ہیں۔ اس شکل میں تاویل یہ ہوگی کہ یہ چیزیں ہم نے اس لئے پیدا کی ہیں کہ تم کو ان سے بہرہ مند کریں، دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو حال مانا جائے۔ یعنی درانحالیکہ یہ چیزیں تمھارے برتنے کیلئے ہیں۔ لیکن باعتبار نتیجہ دونوں تاویلیں یکساں ہیں ..... البتہ پہلی صورت میں اللہ تعالی کی پروردگاری اور انعام کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا کیونکہ اس میں اللہ تعالی کا یہ ارادہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ انسان کو بہرہ مند کرنے کے لئے بنایا ہے۔

اشیائے مذکورہ میں باہمی ترتیب و مناسبت

(۱۱) اس سورہ سے پہلے کی تین سورتوں میں، اِن آیات کی مثالیں تمھیں مل سکتی ہیں، اُن پر ایک نگاہ ڈال لو۔ یہ چاروں سورتیں اپنے مضامین کے اعتبار سے نہایت ملتی جلتی ہوئی ہیں۔ صرف

اسلوب اور نہج کا فرق ہے۔ موقع کی رعایت سے ایجاز تفصیل اور ترتیب کے ڈھنگ بدل گئے ہیں۔ اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے۔ اس سورہ میں اقتضائے مقام سے جو ترتیب ملحوظ ہے چند لفظوں میں ہم اس کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں جیسا کہ واضح ہوگا الاقدم فالاقدم کا اصول اختیار کیا گیا یعنی ضرورت کے اعتبار سے جو شے جسقدر زیادہ نمایاں اور اہم تھی ترتیب میں اس کو اسی قدر اہم اور نمایاں جگہ ملی اور ایجاز و اختصار کی انتہائی رعایت کے ساتھ تفصیل اور استقصاء کا اسلوب ملحوظ رکھا گیا چنانچہ پہلے ان چیزوں کا ذکر کیا جو سیرابی کی زیادہ محتاج ہیں اور جن سے انسان کو جلد رزق حاصل ہوتا ہے اگر بارش بکثرت نہ ہو تو یہ چیزیں وجود میں نہ آسکیں اور ان سے انسان محروم ہو جائے حالانکہ انسان کی معیشت کا دار مدار زیادہ تر انہی چیزوں پر ہے۔ یہ چیزیں تین قسم کی ہیں۔ غلہ، پھل، سبزیاں اور ترکاریاں۔ پس ان میں سے سب سے پہلے اناج کا ذکر کیا۔ یہ انسان کے سامان معیشت کا سب سے زیادہ جامع عنصر اور ذخیرہ کی چیزوں میں سب سے اہم ہے۔ پھر انگور کا ذکر کیا جو راس الاثمار ہے۔ نیز زبیب کی صورت میں ذخیرہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور نبیذ کی صورت میں ایک صالح اور طیب شراب ہے۔ عرب ان اشیاء کی اس قدرتی ترتیب سے واقف تھے۔ اعشیٰ قیس کا شعر ہے۔

فاروی الزروع واعنابها   علی سعة ماء ها اذ قسم

اس شعر میں اناج کے بعد اس نے انگور کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ معیشت کی ضروری چیزوں میں جو جذبہ اہتمام وہ ان چیزوں کے لئے اپنے اندر رکھتے تھے وہ دوسری چیزوں کے لئے نہیں رکھتے تھے۔

اس کے بعد قضب' کا ذکر کیا۔ یہ ان تمام چیزوں کے لئے ایک جامع اسم ہے جو تر و تازہ اور کچی حالت میں کھائی جائیں۔ قرآن مجید میں قریب قریب یہی ترتیب بعض اور مقامات میں بھی ملحوظ ہے مثلاً فرمایا:۔ لنخرج به حبا ونباتا تاکہ ہم اس کے ذریعہ اگائیں اناج اور نباتات۔ قضب پر ان چیزوں کا

بیان ختم ہو جاتا ہے جو جلد نفع پہنچانیوالی اور زیادہ سیرابی و آبپاشی کی محتاج ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اولاً تو بدیر پھل لاتی ہیں ثانیاً سیرابی و آبپاشی کی کچھ ایسی محتاج نہیں ہوتیں عموماً صرف آسمان کی بارش ان کے لئے کفایت کر جاتی ہے۔ مثلاً عام درخت۔ ان میں زیتون کو سب سے مقدم رکھا۔ اولاً تو اس کے مبارک اور مثمر ہونے کی وجہ سے ثانیاً اسکی بعض دوسری خصوصیات کیوجہ سے جنکا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس کے بعد نخل یعنی کھجور کا ذکر فرمایا۔ یہ اہل عرب کے لئے اپنے اندر غذا اور لذت دونوں کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ یہ ان کے لئے اناج بھی ہے اور انگور بھی۔ پھر اسی سلسلہ میں تمام پھل والے بڑی قسم کے درختوں کا ذکر کرکے اس دوسری نوع کی چیزوں کا بیان ختم کر دیا۔

جس ترتیب کے ساتھ ان چیزوں کا بیان قرآن مجید میں آیا ہے۔ بالکل اسی ترتیب کے ساتھ تورات میں بھی آیا ہے۔ اس میں بھی زمین کی اہم پیداواروں کا جہاں ذکر ہوا ہے۔ اناج، انگور، زیتون کا بیان بترتیب ملتا ہے۔ (دیکھو تثنیہ باب ۲۴: ۱۹-۲۱ و باب ۲۸: ۳۸-۴۰) البتہ کھجور کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ شام کھجور کی پیداوار کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہ عرب کی مخصوص چیز ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ ان کے ملک کی اصلی پیداوار یہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر اناج کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا۔ فی جنت وعیون وزروع ونخل طلعھا ھضیم۔ دوسری جگہ فرمایا۔ ونزلنا من السماء ماء مبرکا فانبتنا به جنت وحب الحصید والنخل باسقت لھا طلع نضید۔ ایک جگہ فرمایا۔ وجنت من اعناب وزرع ونخیل۔

غرض ان دونوں میں وہ تمام چیزیں سمٹ گئی ہیں جنکو انسان بوتا اور لگاتا ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری جامع نوع کا بیان کیا جس کے دو لفظوں میں زمین کی تمام باقی نباتات آگئیں یعنی فاکھہ اور اب۔ ان میں سے ایک انسان کے لئے ہے، دوسری چوپایوں کے لئے۔ چنانچہ اس کی تصریح بھی فرما دی۔ متاعا لکم ولانعامکم تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے برتنے کے لئے۔ یہ ایک مخصوص اسلوب ہے

جو کسی سلسلہ کے بعد بطور استدراک اس لئے نمایاں ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ تمام چیزوں کو سمیٹ کر تکمیل کی مہر لگا دے۔ قرآن مجید میں اس جامع اسلوب کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا بما تبصرون وما لا تبصرون۔ ایک جگہ بہت سے انبیاء کا نام ذکر کرنے کے بعد فرمایا ورسلاً قد قصصناہم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصہم علیک۔ بہت سے انبیاء ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو سنا دیئے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنائے۔ اسی طرح بہت سے بارکش جانوروں مثلاً گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا ویخلق ما لا تعلمون۔ اور بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔

آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے

اس تذکیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اور ہمارے چارپایوں کو جو روزی مل رہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ پس ہمارا تمام تر انحصار اسی کی ذات پر ہے۔ وہی ہے جس نے حیوانات کو ہمارا محکوم اور خدمت گار بنا دیا ہے اور جس طرح ہم خدا کے بخشے ہوئے رزق سے پلتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی خدا کے خزانہ جود سے روزی پاتے ہیں۔ پس یہ کیسی بدبختی ہے اور شقاوت کی بات ہے کہ ان انعامات و افضال کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی کریں۔

اس تعلیم کی نظیر پچھلی سورہ میں گذر چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہم اس کا صرف اتنا حصہ بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے ان آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے واضح ہو جائے۔ تمام تفصیلات کو دوبارہ دھرانا غیر ضروری ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ٹکڑوں میں ایک بات بطور قدر مشترک کے موجود ہے۔ یعنی ان میں انسان کی بے پروائی اور اس کے تمرد پر اس کو سرزنش کی گئی ہے لیکن

دونوں میں سرزنش کے پہلو کسی قدر مختلف ہوگئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں انسان کے کفر و انکار پر سرزنش ہے۔ اور اس دوسرے ٹکڑے میں اسکی نافرمانی اور ناشکری کا پہلو پیش نظر ہے۔ اور ساتھ ہی ان میں اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور قیامت کے دن اٹھائے جانیکی ایسی دلیلیں بھی چھپی ہوئی ہیں جن سے ایمان بالجزاء کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

علاوہ بریں ایک اور بھی پہلو پیش نظر رکھو۔ ان آیات میں آسائش و معیشت کے جن سامانوں اور نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ دنیا و آخرت کی زندگی کی ایک نہایت جامع مثل ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے ذیل کی آیت پر تدبر کرنا چاہئے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ	اے لوگو، تمہاری سرکشی کا وبال تمہاری ہی جانوں پر
الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ	آئیگا۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے اڑا لو، پھر ہماری طرف تمکو لوٹنا
اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	ہے اور ہم تمکو بتا دینگے ان چیزوں کی جو تم کرتے رہے ہو۔ دنیا کی
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ	زندگی کی مثال تو بس ایسی ہے کہ جسطرح پانی کہ جسکو ہم نے برسایا
وَالْاَنْعَامُ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ	آسمان سے پس زمین کی نباتات جنکو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں
زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ	اس میں مل گئیں یہانتک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا اور وہ
قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا	خوشنما ہو گئی اور اسکے مالکوں نے سمجھا کہ وہ اب اس پر قادر ہیں
فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ	آیا ہمارا حکم اس پر رات کے وقت یا دن کے وقت پس ہم نے
كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ	اس طرح اس کا صفایا کر دیا گویا کل وہ کچھ تھی ہی نہیں۔ ایسی
....	ہی ہم اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں سوچنے والوں کے لئے۔

چنانچہ اس مقام کی اسی پوشیدہ حقیقت کے اقتضاء سے اس کے بعد قیامت اور روز جزا کا بیان شروع ہوگیا۔

ان آیات کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں ترغیب و ترہیب کے لئے آتی ہیں ان میں بھی استدلال کا زور پوری طرح موجود ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن کا نہایت عام اسلوب ہے۔

اس کے بعد فرمایا :-

(باقی)

قربانی

امین احسن اصلاحی

اس مہینہ میں قربانی پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کرنا چاہتا تھا لیکن پے بہ پے ایسی الجھنیں پیش آتی گئیں کہ کوئی دو ہفتہ سے ایک دن بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ یہ مختصر تحریر پارسال الجمعیۃ دہلی کے ذبیح نمبر کے لئے لکھی تھی، اس مہینہ میں اسی کو پیش کرتا ہوں۔ انشاءاللہ آئندہ اسی عنوان پر یا کسی دوسرے عنوان سے کوئی مفید سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ (اڈیٹر)

کچھ دنوں سے ایک جماعت میں یہ خیال پھیل رہا ہے کہ قربانی کا موجودہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اسلام نے جس قربانی کا حکم دیا ہے اس کا مقصود محض ایک مقامی ضرورت کو پورا کرنا تھا۔ مکہ ایک بیابان غیر ذی زرع تھا۔ زمانہ حج میں لوگوں کا اژدہام ہوتا تو خوراک کا میسر آنا مشکل ہوتا اس لئے اکثر لوگ خوراک کے لئے جانور اپنے ساتھ لے جاتے اور بوقت ضرورت ان کو ذبح کرکے خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے۔ بس یہی قربانی کی اصل ہے۔ اسلام نے اس بات کا ہرگز حکم نہیں دیا ہے کہ لاکھوں جانور کاٹ کر منیٰ کے کھڈوں میں بھر دیے جائیں اور ہر شہر اور قصبہ کی گلی گلی خون سے رنگین نظر آئے۔

یہ خیال غالباً سرسید احمد خاں مرحوم کی اولیات میں سے ہے۔ اگرچہ مشہور ہے کہ اس آسمان کے نیچے کوئی بات نئی نہیں، لیکن جہاں تک ہماری معلومات ہیں، اپنے اس خیال میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ اگلوں میں سے ایک شخص بھی ان کا ساتھی نہیں ہے۔ اور اس خیال کی لغویت اس قدر واضح تھی کہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ آئندہ یہ مقبولیت حاصل کر سکے گا۔ لیکن بالآخر اس آواز نے بھی اپنے

پیچھے ایک گروہ کھڑا کر ہی لیا۔ اور بدقسمتی سے زمانہ ایسا ہے کہ لوگوں نے کسی بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے بکلم انکار کر دیا ہے۔

سرسید احمد خاں مرحوم کو جو بات کھٹکی، وہ یہ تھی کہ لاکھوں جانوروں کا قتل عام دراں حالیکہ ان سے کسی قسم کا انتفاع ناممکن ہو، ایک فعل عبث ہے۔ اور اس کا انتساب وہ اسلام کی طرف پسند نہیں کرتے تھے ہمارا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اس مذہب کی وکالت کر رہے ہیں ان کو بھی یہی بات کھٹک رہی ہے لیکن وہ اپنا مدعا سرسید مرحوم کی طرح صاف صاف لفظوں میں بیان کرتے ہوئے جھجکتے ہیں اور چاہتے ہیں اس کو اپنے اجتہاد و تحقیق کا ایک نیا کارنامہ قرار دے کر ایک نئے آب و رنگ کے ساتھ پیش کریں۔

قربانی کی حقیقت اگر یہی ہے جو اوپر کی سطروں میں ظاہر کی گئی ہے تو ان لوگوں کا خیال قابل غور ہے جو کہتے ہیں کہ اس کو کسی ایسی دوسری شکل میں بدل دینا چاہئے۔ جو مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہو۔ لیکن قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی حقیقت صرف اس قدر نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ بلاشبہہ یہ بات بھی قربانی کے فوائد و مصالح میں داخل ہے۔ چنانچہ سورۂ حج کی ایک آیت میں اسکی تصریح ہے۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ	اور چند متعین دنوں میں ان چوپایوں پر جو اللہ
عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ	نے ان کو روزی کئے ہیں، اللہ کا نام لیں پس
فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ	اس میں سے کھاؤ اور تنگ حال فقیر کو کھلاؤ

لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قربانی کی حقیقت بس اسی قدر ہے اور یہ مقصد کسی دوسری شکل میں اس سے بہتر طریق پر حاصل کیا جا سکے تو قربانی کو ترک کیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہہ امت کی کثرت، وسائل حمل و نقل کی سہولت اور ذرائع ثروت کی فراوانی نے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں اور اب منیٰ کے میدان میں اتنے جانور ذبح ہونے لگے ہیں جو محتاجوں اور

فقیروں کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مجبوراً زمین میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن حالات کی یہ تبدیلیاں حضرت نبی کریم (صلعم) سے راز نہ تھیں۔ آپ تمام عالم کے لئے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے اور ذریت اسمٰعیل کی کثرت کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا وہ آپ کو معلوم تھا اور اس کے علاوہ آپ کی امت کی کثرت کے جو واضح اور مخفی اشارات و اعلانات قرآن مجید میں فرمائے گئے تھے وہ بھی آپ کے سامنے تھے لیکن اس کے باوجود آپ کے کسی اشارے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ قربانی کی یہ مصلحت کسی عہد میں منقضی ہوسکتی ہے۔ اور اس کو کسی دوسری صورت میں بدلا جا سکتا ہے۔ آنحضور صلعم کے بعد خلفائے راشدین کے عہد میں بھی کوئی اس قسم کا اشارہ نہیں ملتا۔ حالانکہ اس دور میں کثرت امت کے آثار عملاً پوری طرح نمایاں ہوگئے تھے۔ قربانی تو خیر ایک اصولی چیز ہے۔ حج کے بعض ضمنی مراسم جن کے متعلق بظاہر گمان ہوتا ہے کہ ان کے مصالح عہد نبوت کے بعد ختم ہوچکے۔ خلفائے راشدین نے ان میں بھی کسی طرح کی تبدیلی نہ کی۔ ان کو بعینہٖ قائم رکھا کہ دین کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اپنے اندر گوناگوں مصلحتیں رکھتی ہیں۔ پس اس کی ایک مصلحت اگر منقضی ہو جائے تو وہ چیز اعمال دین کی فہرست سے خارج نہیں کر دی جائے گی، قائم رکھی جائے گی کیوں کہ اس کے بہت سے مصالح ابھی قائم ہیں۔ طواف کے مراسم میں رمل و اضطباع اور سعی صفا و مروہ بھی داخل ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان کا مقصود مسلمانوں کی قوت و صولت کا اظہار ہے۔ کفار طعنہ دیتے تھے کہ مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے توڑ دیا۔ اب ان میں دم نہیں رہ گیا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ مسلمان ان طریقوں سے اپنے جوش و نشاط کا اظہار کریں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں چاہا کہ رمل و اضطباع کو ترک کر دیں کہ جب مقصد کے لئے یہ اختیار کئے گئے تھے وہ مصلحت اب باقی نہیں رہی۔ جن مسلمانوں نے حکومت کسریٰ کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی اب وہ اپنی صولت و دبدبہ کے اظہار کے لئے رمل و اضطباع کے محتاج نہیں رہے لیکن غور کے بعد ان کو نظر آیا کہ ان کا ترک صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ انکی صرف ایک مصلحت ابھی منقضی

ہوئی ہے دوسری بہت سی مصلحتیں ابھی باقی ہوں جن کے لیے ان کا قائم رکھنا ضروری ہے۔

غور کیجئے رمل و اضطباع کی حیثیت بالکل ضمنی ہے۔ یہ نہ تو دین کے اصول میں داخل ہیں، نہ حج کے، لیکن حضرت عمرؓ نے ان میں کسی قسم کا تغیر پسند نہ فرمایا۔ پھر اگر ہم قربانی کے متعلق محض اس بنیاد پر کہ ایک ضمنی مصلحت، اور وہ بھی پوری نہیں، صرف ایک حد تک ختم ہو چکی ہے، یہ فتوے دیں کہ اس کو ترک کر دیا جائے یا اس کو کسی دوسری شکل میں تبدیل کر دیا جائے تو کتنی عجیب بات ہوگی۔

قربانی کے متعلق ہر شخص کو یہ بات معلوم ہوگی کہ وہ شعائر اللہ میں داخل ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ	اے ایمان والو اللہ کے شعائر کی بے توقیری
اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ	نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینہ کی نہ قربانی کے
وَلَا الْقَلَائِدَ	جانوروں کی نہ پٹے والے جانوروں کی۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ اس میں اجمال کے بعد تفصیل کا اصول ملحوظ ہے۔ پہلے مجملاً فرمایا، شعائر اللہ کی بے توقیری نہ کرو اس کے بعد شعائر اللہ کے چند اہم اجزا بطور تفصیل بیان فرمائے۔

شعائر اللہ کی حقیقت کیا ہے؟ لغوی تحقیقات میں یہاں پڑنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے اس کی جو حقیقت سمجھی ہے اس کو پیش کرتا ہوں۔ وہ معاملہ کی تہ تک بالکل ٹھیک پہنچ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:- ان الطریقة التی نبہا اللہ تعالیٰ للناس ہی محاکاة ما فی صقع التجرد باشیاء یقرب تناولہا للبہیمیة واعنی بالشعائر اموراً ظاہرة محسوسة جعلت لیعبد اللہ بہا واختصت بہ

یعنی شاہ صاحب کے نزدیک شعیرہ وہ چیز ہے جو کسی مجرد حقیقت کو ہمارے مادی قویٰ کی گرفت میں لانے کے لئے کسی محسوس پیکر میں پیش کرے، پس قربانی ایک ظاہر ہے جس کے اندر ایک اہم حقیقت مخفی ہے اور وہی حقیقت اصلی مقصود ہے اور چونکہ اس حقیقت کی تمثیل کے لئے یہ پیکر خود خدا نے تراشا ہے اس لئے یہی پیکر بہترین (آئیڈیل) پیکر ہے۔ کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس حقیقت کو

تمثیل کرنے کے لئے یہ شکل نہیں فلاں شکل موزوں تھی۔ اسلام دنیا کا آخری مذہب یا خدائی مذہب کی آخری قسط ہے، اس لئے اس مذہب کو اپنے ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے کمال کی آخری حد پر ہونا چاہیئے۔ اگر اس کی کسی چیز میں کسی پہلو سے کوئی نقص رہ گیا تو پھر یہ دنیا کا آخری مذہب نہیں ہوا۔ اگر ہم اس کے کسی شعیرہ کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ اس کو کسی دوسری بہتر صورت میں بدلا جا سکتا ہے تو در پردہ ہم اسلام کے آخری مذہب ہونے کا انکار اور ایک نئے مذہب کی ضرورت کا اقرار کر رہے ہیں۔

یہ ایک ضمنی بات تھی، سلسلہ کلام کی بات یہ ہے کہ قربانی ایک شعیرہ ہے یعنی ایک صورت جو ایک حقیقت کو پیش کرنے کے لئے اسلام نے اختیار کی ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہو گا کہ قربانی کا مقصود محض یہ ہے کہ آدمی اس کا گوشت خود کھائے اور غریبوں اور مسکینوں کو کھلائے اگر قربانی مقصود یہی ہے تو قربانی کا ظاہر بھی یہی ہے۔ پھر اسکو شعائر کی فہرست میں گنانے کی کیا ضرورت تھی یہ تو کسی حقیقت کی تمثیل نہیں تھی؟

اب سوچنا چاہیئے کہ قربانی کس حقیقت کی تمثیل کر رہی ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی حقیقت اسلام کی تصویر ہے۔ اسلام کیا چیز ہے؟ مسلم کی تعریف کیا ہے؟ ان سوالات کے جوابات قربانی کی صورتیں ہماری نگاہوں کے سامنے مشہود کئے گئے ہیں یعنی ہم قربانی کے آئینہ میں ایک مسلم کا اصلی کردار پورا پورا دیکھ سکتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم نے اسلام کے متعلق کچھ نہ جانا ہو۔ صرف قربانی کے جانور کی گردن پر چھری چلائی ہو تو بس یہی ایک بات اسلام کے سمجھ لینے کے لئے کافی ہو گی۔ کتابوں کے ہزاروں صفحات میں اسلام کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ قربانی میں وہی فلسفہ ہماری آنکھوں کو دکھا دیا گیا ہے۔

یہ قطعی ہے کہ ہماری قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے، قرآن مجید میں اس کی نہایت واضح تصریحات ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے امامت و سیادت کا جو منصب عطا فرمایا وہ بلا سبب نہیں عطا فرمایا بلکہ ان کو نہایت سخت امتحان میں جانچا اور جب وہ اس میں پورے

پورے اترے تو مستحق ٹھہرے کہ قوموں کی سرداری کی عزت پائیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں
فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ	میں جانچا اور ابراہیم نے وہ پوری کر دیں تو
اِمَامًا	کہا میں تمکو لوگوں کا امام بنانیوالا ہوں۔

یہ امتحان کس بات کا امتحان تھا ؟ کمال اسلام و اطاعت کا۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِى	اور ہم نے اس کو دنیا میں برگزیدہ ٹھیرایا
الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ - اِذْ قَالَ لَهٗ	اور آخرت میں وہ صالحین کے زمرہ میں ہوگا۔
رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	یہ اس لئے کہ جب اس سے اسکے پروردگار نے کہا کہ
. . . .	اپنے رب کی اطاعت کیلئے سرفگندہ ہو جا تو اس نے
. . . .	کہا کہ میں نے اپنے تئیں سارے جہان کے پروردگار کے حوالہ کیا

اس اسلام و اطاعت اور تسلیم و سرفگندی کو انھوں نے کس طرح مشہود کیا؟ کیا محض زبان سے کہدیا کہ " اسلمت لرب العلمین "؟ اگر محض زبان سے کہدینا تھا تو اس امتحان میں تو کوئی مسلمان بھی پیچھے نہ رہیگا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی؟ اس کے جواب کے لئے فرمایا۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ	پس دونوں جب امر الٰہی کے سامنے جھک گئے
	اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔

یعنی ابراہیم کا اقرار و اعلان زبان سے نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنی اطاعت کاملہ کو عمل میں لاکر دکھا دیا اور وہ اسطرح کہ جو چیز ان کو سب سے زیادہ محبوب تھی یہانتک کہ اپنی جان بھی اتنی عزیز اور محبوب نہ تھی اسکی گردن پر چھری چلانے کے لئے آستینیں چڑھالیں۔ گویا اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے کو کلیۃً مولی کے حوالہ کر دے یہانتک کہ اگر خدا کا حکم ہو تو اپنی عزیز سے عزیز چیز یہ کہتا ہوا اسکی راہ میں قربان کر دے کہ

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

"وانا من المسلمین" کا اقرار اسی حقیقی معنی کے لحاظ سے ہوا۔ اس کے عام معنی میں تو سب شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب حقیقی اسلام ہے جو کامل تسلیم و سرفگندی سے عبارت ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوموں کی امامت اسی امتحان اسلام میں پورے اترنے کے صلہ میں ملی تھی اور انھوں نے اسلام کی جو حقیقت پیش کی تھی وہ یہ تھی کہ ایک اشارۂ غیبی کی تعمیل میں اپنے لخت جگر کی گردن پر چھری چلانے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے کھلے ہوئے امتحان سے تعبیر فرمایا۔ "ان ھذا لھو البلاء المبین"۔ اور ان کو جو کچھ بخشا اسی کے صلہ میں بخشا۔

اب امت مرحومہ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے افضال پر غور کرو۔ ہم کو جو دین بخشا اس کا نام اسلام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے جو لقب دلوایا وہ مسلم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت میں مبعوث فرمایا جو ذبیح اللہ تھے۔ ان تمام خصوصیات نے جمع ہو کر یہ واضح کر دیا کہ وہ حقیقی اسلام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھا اس کے وارث مسلمان ہوئے۔ پس ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی عزیز سے عزیز چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے ہر آن آمادہ رہے۔

انھیں خصوصیات کی بنا پر اسلام میں قربانی ضروری ہوئی تاکہ مسلمان اپنے ملی نصب العین کو ایک عام اجتماع میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کریں اور ان میں یہ بات تازہ رہے کہ ان کی جان ان کی ملکیت نہیں ہے، خدا کی ملکیت ہے۔ جس طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی جان ایک مینڈھے کے عوض چھڑائی گئی تھی اسی طرح انھوں نے بھی اپنی جان ایک چوپایہ کے عوض میں چھڑائی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا نے ان کی جان ان کو سونپ دی ہے۔ نہیں۔ خدا کے دین کو جب ضرورت ہوگی

ان کا فرض ہوگا کہ اپنی گردنیں کٹوا دینے کے لئے وہ بے جھجک آگے بڑھیں گے کیونکہ یہی وہ حقیقی قربانی ہوگی جسکی محض یادمیں انھوں نے جانوروں کی گردنوں پر چھریاں چلائی ہیں۔

یہی اسباب ہے قربانی کیلئے مقام وہی تجویز ہوا جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ پیش آیا تھا، اور چونکہ حقیقی قربانی جانؔ ہی کی قربانی ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی سے واضح ہو اسلئے ضروری ہوا کہ اسکی محاکات جان کی قربانی کی صورت میں ہو، کسی دوسری صورت میں نہ ہو۔ ورنہ اصلی تخیل محفوظ نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ قربانی میں دو باتیں ضروری ہوئیں، ایک یہ کہ عزیز ہو۔ دوسرے یہ کہ جاندار ہو، انسان کی مملوکات میں عزیز چیزیں بہت سی ہوسکتی تھیں لیکن جاندار بجز حیوانات کے کوئی دوسری چیز نہ تھی اس لئے ضروری ہوا کہ حیوانات ہی انسان کے قائم مقام ہو کر خدا کی راہ میں ذبح ہوں اور انسانیت کی ترقی و بہبود کے سب سے بڑے نصب العین کو زندہ رکھیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ قربانی حقیقت اسلام کی تصویر ہے، اور چونکہ حقیقت اسلام کو پیش کرنے کیلئے سب سے زیادہ سچا اور مکمل واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ تھا اس لئے وہی واقعہ قربانی میں بطور مثال کے پیش نظر رکھا گیا۔ ظاہر ہو کہ قربانی کا یہ مقصد اس مقصد سے بالکل مختلف ہے جو قربانی کے مخالفین نے سمجھ رکھا ہے۔ وہ قربانی کے فوائد و مصالح میں سے ایک ضمنی بات کو اسکا اصلی مقصد قرار دیکر حیران ہوتے ہیں کہ لاکھوں جانور منٰی کے میدان میں ذبح کر کے دفن کیوں کر دیئے جاتے ہیں۔

اور ہم نے بااجمال قربانی کے متعلق جو خیال قرآن کی روشنی میں پیش کیا ہو اس کے لحاظ سے قربانی کو اسلام کے تمام خط و خال کا آئینہ ہونا چاہیے، اور ہمارے نزدیک درحقیقت قربانی کی یہی حیثیت ہے لیکن، جن لوگوں کی نگاہیں ان حقائق تک نہیں پہنچ سکتیں وہ سمجھتے ہیں کہ قربانی محض کھانے کھلانے کیلئے ہے حالانکہ قربانی کے متعلق یہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص قرآن مجید کے متعلق یہ کہے کہ اس کا مقصد لوگوں کو وضو کی تعلیم دینا ہے۔ بلاشبہ قرآن مجید وضو کی تعلیم بھی دیتا ہے لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہی قرآن کا مقصود ہے اور چونکہ اب لوگوں کو وضو کا طریقہ معلوم ہو چکا اسلئے قرآن مجید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

مذاکرہ

(۲)

لفظ آلاء کی تحقیق

از جناب مولوی بدرالدین صاحب اصلاحی

آلاء کا لفظ قرآن مجید میں چند مقامات پر آیا ہے۔ ایک تو سورۃ الرحمٰن کی ترجیعات میں۔ فبای آلاء ربکما تکذبان (۵۵: ۱۲) دوسرے سورۃ النجم کے آخر میں فبای آلاء ربک تتمارٰی (۵۳: ۵۵) تیسرے سورۃ الاعراف میں دو جگہ فاذکروا آلاء اللہ (۷: ۶۹ و ۷۴)

عام طور پر قرآن مجید کی ہر تفسیر اور ترجمہ میں اس لفظ کے معنی "نعمتوں" کے قرار دئے گئے ہیں، لیکن حقیقت میں اس لفظ کا یہ ترجمہ اصل مفہوم کے اعتبار سے غیر صحیح ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں کا سیاق و سباق اور شعراء جاہلیت کے مواقع استعمال دونوں اس مفہوم کے صریح خلاف ہیں۔

آلاء کے اصلی معنی "شئون عجیبہ" کے ہیں یعنی وہ کام اور واقعات جو اپنے اندر کوئی نیرنگی عظمت شان اور اہمیت رکھتے ہوں۔ اس لفظ کے وسیع اور جامع مفہوم کو کسی قدر آسانی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے اگر کوئی دوسرا موزوں لفظ ہو سکتا ہے تو وہ فارسی زبان کا لفظ "کرشمہ" ہے جو ہماری بولی میں بھی مستعمل ہے۔

کلام جاہلیت میں اس معنی کی مثالیں بکثرت موجود ہیں، جن کو آگے چلکر ہم پیش کریں گے۔ اس موقع پر سب سے پہلے اُس حقیقت کو کھول دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں نے لفظ

اصلی معنی کی طرف توجہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام زاحوال میں رحمت کا جزو غالب ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں سب کا منی نعمت ہی ہوتی ہے اس لئے بعضوں نے آلاء کی قریب ترین تعبیر کے لئے نعمت کا لفظ اختیار کر لیا۔ اور چونکہ اسی اعتبار سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بھی اس لفظ کی یہی تعبیر منقول ہوئی.... اس لئے اور بھی کسی کو لفظ کے اصلی مفہوم کی تحقیق کے لئے مراجعت لغت و کلام عرب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

قرآن مجید کی جو تاویل صحابہ کرامؓ سے منقول ہے اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ صحت و قطعیت میں اپنی نظیر آپ نہیں ہے؟ صحابہ کرام قرآن کی ایک ایک ادا کے رازدار اور قرآن کے ایک ایک لفظ کے بہترین رمز شناس تھے۔ ان کا مرتبہ "صاحب البیت" کا تھا۔ قرآن کی ہر چیز ان کی اپنی چیز تھی اس لئے اگر کسی آیت یا کسی لفظ کی کوئی تاویل کسی صحابی سے منقول ہو تو وہ تاویل بہرحال بہترین تاویل ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ سلف کی تفسیر و تاویل کا ایک خاص انداز ہوتا تھا۔ اگر آپ نے ان کے اس انداز کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے، تو بہت ممکن ہے کہ بعض باتوں کے سمجھنے میں دھوکا ہو جائے۔ پس سلف کے انداز تفسیر کو نگاہ میں رکھنا ہر طالب قرآن کے لئے بیحد ضروری ہے۔ بے شمار مواقع ہیں جہاں اس راہ کی معمولی لغزش، ناقابل حل مشکلات میں ڈال دیتی ہے۔

سلف کا یہ عام دستور تھا کہ جب ان سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ سائل کے سوال کے مطابق جواب دیدیتے۔ اور عموماً مسئول عنہ کی غیر ضروری تحقیق و تفتیش کے بجائے اس کے کسی متبادر اور عام مفہوم یا مراد کی طرف اشارہ کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایک لفظ کے متعلق کتب تفاسیر میں سلف کے متعدد اقوال ملتے ہیں۔ مثلاً دیکھئے "کوثر" کے متعلق مطولات فن میں صحابہ کرامؓ کتنی روایتیں منقول ہیں۔

کسی نے کہا کوثر جنت میں ایک نہر ہے کسی نے کہا کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ کسی نے کہا کوثر قرآن ہے۔ کسی نے کہا کوثر حکمت اور اسلام ہے۔ کسی نے کہا کوثر سے مراد نبوت ہے۔ اب غور فرمائیے صحابہ کے اس اختلاف تاویل کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کوثر کی صحیح تاویل سے بیخبر تھے اور وہ بھی ترجمان القرآن اور حبر الامۃ جیسے صحابہ۔ اگر وہ بے خبر تھے تو پھر دوسرا کون ہے جو قرآن کے ایک حرف کے متعلق بھی باخبر ہونے کا دعوی کر سکتا ہے؟ یقیناً وہ کوثر کی صحیح تاویل کو جانتے تھے لیکن اس کی تشریح میں ان کے نام سے جو مختلف اقوال ملتے ہیں ان میں سے زیادہ تر اسی اصول کی بنا پر ہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر حضرت ابن عباسؓ کی کسی روایت میں آلاء کو نعمتوں کے معنی میں بیان کیا گیا ہے تو یہ لفظ آلاء کی اصلی تحقیق اور اس کا لغوی مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کے ایک مخصوص مراد کی طرف اشارہ ہے جو سائل کے سوال کے مطابق بیان فرمائی گئی ہے۔ اس لئے زبان کے عام استعمال اور لفظ کے واقعی مفہوم کو نظر انداز کرکے صرف اس روایت کی بنا پر لفظ آلاء کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ اس کے معنی نعمت کے ہیں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ لفظوں کی تحقیق کے باب میں اصلی قابل اعتماد چیز لغت اور کلام عرب ہے عربی لٹریچر کے موجودہ سرمایہ میں جہانتک ہماری نگاہ قاصر پہونچ سکی ہے کسی مستند شاعر کا ایک شعر بھی ایسا نہیں مل سکا ہے جس میں آلاء کو نعمتوں کے معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔ برخلاف اس کے محیر العقول کارناموں کے لئے حیرت انگیز عادات وخصائل کے لئے اور عجیب وغریب کارسازیوں کیلئے یہ لفظ ایک عام اور روزمرہ لفظ کی طرح ہر جگہ ملتا ہے۔ مثلاً طرفہ کہتا ہے:۔

کامل یجمل آلاء الفتے　　نبہ سید سادات خضم

خنسا بنت ضرار اپنے بھائی کے مرثیہ میں کہتی ہے:۔

کریم ثناہ وآلاءہ　　وکافی العشیرۃ ما غالیا

مہلہل عرب کا مشہور شاعر اپنے بھائی کلیب کے مرثیہ میں کہتا ہے:۔

الحزم و العزم کانا من طبائعہ ما کل آلائہ یا قوم احصیہا

بنی غیظ بن سید کا ایک مشہور شاعر ربیعہ بن مقروم کہتا ہے :۔

ولولا فوارسنا ما دعت بذات السلیم تمیم تمیما

وما ان لاو بیتہا ان اعد ماثر قومی ولا ان الوما

ولکن اذکر آلاء نا . . . . . . حسد یث وما کان منا قدیما

اجدع الہمدانی کا شعر ہے ۔ اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے :۔

ورضیت آلاء الکمیت فمن یبع فرسا فلیس جوادنا بمباع

جوہری نے جس مقام پر اس شعر کی تشریح کی ہے ۔ وہاں پوری طمانیت کے ساتھ اس کے قلم نے "آلاء" کا ترجمہ "خصالہ الجمیلۃ" (اس کی بہترین عادات) لکھا ہے ۔ جو اس لفظ کا صحیح ترین مفہوم ہے لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہی جوہری جو اس موقعہ پر لفظ کی اصلی حقیقت کو پا چکا ہے ۔ مادہ آلاء کی بحث میں جب آلاء کے مفہوم کو بیان کرتا ہے تو محض رائے عام کے اتفاق سے مرعوب ہو کر پانی ہوئی حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اور آلاء کے وہی عام معنی "نعمتیں" لکھکر گذر جاتا ہے ۔

فضالۃ ابن زید العدوانی جو معمرین میں سے ہے لکھتا ہے :۔

وفی الفقر ذل للرقاب وقل ما رایت فقیرا غیر نکس مذمم

فقیری میں بہت ہی ذلت ہے ۔ میں نے جتنے فقیر دیکھے سب شکستہ حال اور مذموم دیکھے

یلام وان کان الصواب بکفہ ویحمد آلاء البخیل المدرہم

ان کو ملامت کیجاتی ہے چاہے وہ کتنے ہی اچھا کام کیوں نہ کریں اور دولت مند بخیل کے کارناموں کی تعریف کیجاتی ہے

آخری مصرعہ " ویحمد آلاء البخیل المدرہم " پر اگر ذرا بھی غور کیجئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ آلاء کے متعلق جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہی اس لفظ کی صحیح تحقیق ہے ۔ اس موقعہ پر یہ لفظ اپنے اصلی معنی میں

اتنی خوبی اور صفائی کے ساتھ کھپ گیا ہے کہ باوجود کوشش کے بھی مفسرین کا پیدا کیا ہوا مفہوم کسی طرح چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ابو تمام نے باب المراثی میں بغیر نام کے کسی شاعر کے دو شعر لکھے ہیں۔

اذا ما امرءٌ اثنی بآلاء میت فلا یبعد اللہ الولید بن ادھما

فما کان مفراحاً اذا الخیر مسه ولا کان منانا اذا هو انعما

پہلے شعر میں شاعر نے آلاء میت کا تذکرہ کیا ہے اور پھر دوسرے شعر میں آلاء سے اس کی جو مراد تھی خود بیان کر دی ہے کہ مرثی کو جب خیر و بھلائی پہنچتی تو وہ خوشی سے بے قابو نہ ہوتا اور جب کسی کے ساتھ خود بھلائی کرتا تو کبھی احسان نہ جتاتا۔ غور کیجئے اس تفسیر کے اعتبار سے آلاء کے معنی "نعمت" کے کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں۔

خنساء عرب کی مشہور مرثیہ گو کہتی ہے:-

فبکی اخاك لآلائه اذا المجد ضیعه السائسونا

کلام عرب کی یہ چند مثالیں ہیں، جو آلاء کے صحیح مفہوم پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر کلام جاہلیت کا اور وسیع مطالعہ کیا جائے تو ابھی اور بہت سے اشعار اس خیال کی تائید میں مل سکتے ہیں۔ لیکن غیر ضروری طوالت کے خیال سے مزید تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اب آئیے اشعار کی دنیا سے نکل کر خود قرآن مجید کی آیتوں میں غور کریں کہ جہاں جہاں قرآن نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے وہاں کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور قرآن کا نظم کلام، سیاق عبارت اور حسن بیان کس تاویل کو ترجیح دیتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ (آلاء) سب سے زیادہ سورۃ الرحمٰن کی ترجیعات میں آیا ہے۔ اس سورہ میں ہر چند آیتوں کے بعد فبای آلاء ربکما تکذبان کی بیدار کرنے والی تنبیہ موجود ہے۔ پوری سورہ کو سامنے رکھ کر اگر غور سے پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی

عجیب وغریب قدرتوں کو بیان فرمایا ہے۔ اور ہر چند قدرتوں کے بیان کے بعد غافل اور مدہوش مخلوق کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور عود سورہ (اثبات قیامت) کے ذہن نشین کرنے کے لئے فبای آلاء ربکما تکذبان کی ترجیع فرمائی کہ خدا کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو سورہ کا سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"رحمٰن نے قرآن کو سکھایا انسان کو پیدا کیا پھر اس کو بیان کی تعلیم دی۔ سورج اور چاند کو حساب سے رکھا جھاڑ اور درخت سجدہ میں ہیں اور آسمان کو بلند کیا۔ اور میزان کو قائم کیا کہ ناپ تول میں زیادتی نہ کرو۔ ترازو انصاف کے ساتھ سیدھی تولو۔ اور تول میں گھٹاؤ نہیں اور مخلوق کے لئے زمین بنائی۔ اس میں میوے ہیں، خوشوں والے۔ کھجوریں ہیں۔ بھس والے اناج ہیں اور خوشبو دار پھول ہیں"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے فبای آلاء ربکما تکذبان۔

جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں وہ کیا چیز ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے چند کرشمے ہیں، ان کرشموں کو بیان کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ اے غافل انسانو! اور بے خبر جنو! یہ جو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کے کرشمے تمہاری نظروں کے سامنے ہیں ان میں سے کن کن کرشموں کو تم جھٹلاؤ گے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کرشمہ کی بھی تکذیب نہیں کر سکتے تو یہ کیا اندھیر ہے کہ قیامت کے کرشمہ کو اتنی بے دردی کے ساتھ جھٹلا رہے ہو۔ قیامت کا انکار اسی لئے نہ کر رہے ہو کہ وہ ایک اچنبھے کی بات ہے۔ لیکن اللہ کی قدرتوں کے بے شمار نمونے جو عالم آفاق و انفس میں موجود ہیں۔ کیا کوئی اچنبھا ان سے بھی بڑھکر عجیب وغریب اور عقلوں کو حیران کرنے والا ہو سکتا ہے!

سورہ کے انداز کلام کا یہ ایک مختصر نمونہ ہے، اگر غور سے پوری......سورہ کو پڑھئے تو ہر جگہ یہی

انداز نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں انفس و آفاق اور شہود و غیب کے تمام کارناموں کو بیان فرمایا ہے۔ اور پھر موقعہ موقعہ سے انہی ناقابل انکار کارناموں کی طرف اشارہ کرکے قیامت کے متعلق غافل انسانوں اور مدہوش جنوں کو توجہ دلائی ہے۔

لفظ کے اس معنی سے سورہ کی ترجیعات میں جو زور آجاتا ہو وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ لفظ کے واقعی مفہوم کو چھوڑ کر ایک غیر واقعی مفہوم کو اختیار کیا جائے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ لفظ کی غلط تفسیر کی وجہ سے ہمارے مفسرین کو سورہ رحمٰن کی تفسیر میں طرح طرح کی دقتیں پیش آئی ہیں اس لئے کہ آلاء کے معنی نعمتوں کے ہر جگہ کسی طرح استوار نہیں ہوتے۔ بعض آیات میں ایسی چیزوں کو گنایا ہے جو کسی طرح بھی نعمت کے تحت میں نہیں آسکتی ہیں بلکہ ان کا تعلق صریحاً نقمت اور عذاب ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی فبای آلاء ربکما تکذبان کی ترجیع ہے یہ وقت یقیناً لفظ کی غلط تاویل کی وجہ پیدا ہوئی ہے۔ اسکی صحیح تاویل واضح ہو جانیکے بعد سورہ رحمان کے تمام مواقع سے اسکی مناسبت میں کسیطرح کی کھٹک باقی نہیں رہجاتی۔

سورہ نجم کا موقعہ استعمال بھی اسی خیال کا موید ہے۔ اس سورہ میں لفظ آلاء جس آیت میں آیا ہے اس آیت سے پہلے مسلسل ۱۰ آیتوں میں سرکشان مکہ کو روز جزا کے اثبات میں حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں کی خبریں سنائی گئی ہیں۔

ام لم ینبأ بما فی صحف موسیٰ ۝	کیا اس کو خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے
وابراھیم الذی وفّیٰ ۔ الا تزر وازرۃ	اور ابراہیم کے جنہوں نے پورا کیا کہ کوئی اٹھانے والا
وزر اخریٰ ۝ وان لیس للانسان	کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور آدمی
الا ما سعیٰ ۝ وان سعیہ سوف	کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔ اور اس کی کمائی
یریٰ ۝ ثم یجزٰیہ الجزاء الاوفیٰ	دیکھی جائے گی۔ اور پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا
وان الیٰ ربک المنتھیٰ ۝ وانہ	اور تیرے رب کے پاس ضرور پہنچنا ہے، وہی ہنساتا ہے

اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ — اور وہی رلاتا ہے، وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے۔ اسی نے

یٰی ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ — بنایا جوڑا نر اور مادہ۔ ایک بوند پانی سے جب ڈالی جاتی

نْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ وَاَنَّ — ہے۔ اور وہی دوسری مرتبہ پیدا کرے گا۔

ہ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ — اسی نے دولتمند کیا اور خزانے والا بنایا۔ وہی

نٰى وَاَقْنٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى — پروردگار شعریٰ کا۔

ن دلائل کے بعد انہی صحیفوں سے مختلف اقوام و امم کی تباہی و ہلاکت کے تاریخی

ان لفظوں میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۝ — اور یہ کہ اس نے اگلی قوم عاد کو کھپا دیا۔ اور

ثَمُوْدَ فَمَا اَبْقٰى ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ — ثمود کو پھر باقی نہ چھوڑا اور نوح کی قوم کو اس سے

قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ — بھی پہلے۔ وہ تو اور بھی ظالم و شریر تھے اور الٹی

وَاَطْغٰى ۝ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى — بستی کو دے مارا پھر اس پر چھایا جو چھایا۔

فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۝ — ....

ور پھر ان قوموں کی تباہی و ہلاکت کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى — پس تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى — یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں کا

اس موقع پر ہر شخص نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ سیاق عبارت اور

لام لفظ آلاء کے کس مفہوم کو چاہتے ہیں؟ اور سلسلہ کلام کس معنی کا متقاضی ہے؟

ر کے پھیلے ہوئے عبرت انگیز خداوندی کارناموں کو، جس زور اور قوت کے ساتھ قرآن

آلاء نے بیان فرمایا ہے۔ وہ "نعمتوں" سے سمجھے جا سکتے ہیں یا "کرشموں" سے؟

[redacted]

اسی طرح سورۃ الاعراف میں بھی چند مقامات پر یہ لفظ آیا ہے وہ مقامات بھی کچھ اس طرح کے سیاق وسباق سے گھرے ہوئے ہیں کہ کوشش کے باوجود بھی وہاں نعمتوں کے معنی نہیں بن سکتے۔

اس سورہ میں سب سے پہلے یہ لفظ ہود علیہ السلام کی سرگذشت میں آیا ہے۔ ہود علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دی۔ تو کفار کے سرغنوں نے کہا کہ تم نرے بیوقوف اور بالکل جھوٹے ہو۔ انا لنرٰک فی سفاھۃ وانا لنظنک من الکاذبین۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھئی یہ بات نہیں ہے تم نے غلط سمجھا۔ نہ تو میں بیوقوف ہوں اور نہ جھوٹا بلکہ میں تو خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ اور اس کے پیغام کی تم کو دعوت دے رہا ہوں۔ اور یقین مانو کہ میں تمہارا بہت ہی خیر خواہ ہوں۔ باقی اگر تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں میں سے ایک آدمی کو اپنی پیغام بری کے لئے کیوں منتخب کر لیا ہے؛ تو یہ چنداں بھی تمہارے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ وقت یاد کرو جس وقت اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کے بعد تم کو جانشین بنایا۔ پس جو حال آج میرا تمہارے سامنے ہے کل وہی حال تمہارا اس قوم کے سامنے تھا۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا، اس کو یاد کرو۔ اس میں تمہارے لئے کافی سامان عبرت ہے۔ فاذکروا آلاء اللہ لعلکم تفلحون۔

یہ موقع لفظ کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے بالکل واضح ہے۔ اتنا واضح کہ کسی تشریح کی قطعی ضرورت نہیں۔ یہاں پر "آلاء اللہ" کے معنی "افعال اللہ" کے سوا کچھ اور بن ہی نہیں سکتے ہیں

اس کے بعد، ٹھیک اسی طرح یہ لفظ، صالح علیہ السلام کی سرگذشت میں آیا ہے۔ آپ نے بھی دعوت توحید اور حفاظت ناقہ کے بعد قوم کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ	اور یاد کرو جس وقت تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا
بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ	اور زمین میں تم کو جگہ دی۔ بناتے ہو اس کے نرم حصوں میں
مِنْ سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ	محلیں اور پہاڑوں کو کاٹ کر مکان۔ پس اللہ تعالیٰ

الْجِبَالَ بُيُوتًا فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ — کی کاریگریوں کو بھی یاد رکھو اور زمین میں فساد مچاتے

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ — مت پھرو۔

یعنی قوم عاد کی ہلاکت و بربادی کا حال تو تم کو معلوم ہے کہ ہودؑ اور ان کے ساتھی غریب شکستہ حال تھے ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے عاد کی سرکش قوم کو چشم زدن میں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ فانجیناہ والذین معہ برحمۃ منا وقطعنا دابر الذین کذبوا بآیاتنا وما کانوا مومنین (اعراف) اس لئے چاہئے کہ تم بھی اپنی تمدنی اور عمرانی ترقیوں پر مغرور ہو کر زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔ اللہ کی اعجوبہ کاریوں کو بھی یاد رکھو۔

یہ ہیں قرآن مجید کے وہ مواقع، جن میں آلاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام مقامات پر نظم کلام اور سیاق عبارت کی واضح روشنی میں لفظ کا جو وسیع اور جامع مفہوم سمجھ میں آتا ہے اس کی صحیح تعبیر کے لئے نعمت کا لفظ بالکل ناکافی ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

تفسیر سورہ کوثر

موعظتِ حسنہ

روزہ

از جناب مولوی حافظ عبداللہ صاحب اصلاحی

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان سب میں کسی نہ کسی نوع کی جسمانی عبادت کا حکم موجود ہے۔ اسلام نے بھی اپنے پیرؤں پر جسمانی عبادت فرض کی ہے۔ جس کا نام روزہ ہے۔ عربی میں روزہ کے لئے صوم و صیام کا لفظ مستعمل ہے۔ صوم و صیام کے معنی کھانے، پینے اور بات چیت سے رکے رہنے کے ہیں۔ لغت میں اس گھوڑے کو بھی کہتے ہیں، جسے ایک خاص انداز تربیت پر جنگ کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کی صورت عموماً یہ ہوتی تھی کہ گھوڑے کو خوب کھلا پلا کر تنومند کرتے، جب جسمانی حیثیت سے وہ پوری ترقی کر لیتا، اسے سخت دھوپ میں باندھتے۔ تیز و تند ہوا میں ہوا کے رخ کے خلاف کھڑا کرتے۔ دانے گھاس میں تدریجاً کمی کرتے رہتے۔ اس طرح اسے سردی گرمی بھوک پیاس کی شدائد و تکالیف جھیلنے کا خوگر بناتے کہ لڑائی میں پیش آنے والی سختیوں کا مقابلہ کر سکے۔

مفہوم کے لحاظ سے یہ لفظ کسی ایسے ہی عمل کے لئے بولا جا سکتا ہے جو کسی اہم اور اعلیٰ مقصد کیلئے ہو۔ اور جسمیں انسان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کیساتھ اسکی جسمانی تربیت کا پہلو بھی مدنظر ہو۔

نوعِ انسانی کو روزے کی ضرورت

بنی نوع انسان کی فطرت کچھ اسطرح کی ہے کہ بغیر تعلیم و تربیت اس کی فطری قوتیں نہیں ابھر سکتیں۔ اور چونکہ وہ جسم و روح دونوں سے مرکب ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کی جسمانی اور روحانی تربیت کے لئے کوئی ایسا عمل ہو جسمیں روح و جسم دونوں کی تربیت ملحوظ ہو

اس ضرورت کی تکمیل کے لئے روزہ ایک بہترین عمل (عبادت) ہے تفصیل آگے آئیگی۔

شریعت کی اصطلاح میں روزہ کا مفہوم | شریعت کی اصطلاح میں سحر کے وقت سے غروب آفتاب تک خاص آداب شرائط کے ساتھ کھانے پینے اور جنسی خواہشوں سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے۔ ساتھ ہی روزہ دار کے لئے حکم ہے کہ اپنی زبان، اپنے قلب اور اپنے اعضاء وجوارح کو نارواباتوں سے محفوظ رکھے۔ زبان گالی گلوج کے لئے نہ کھلے دل وساوس سے پاک ہوکر یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ ہاتھ کسی کے خلاف نہ اٹھیں اور قدم کوئی بری راہ نہ چلیں۔ ظاہر ہے کہ جس عمل کے یہ آداب و شرائط ہونگے وہ نہایت عظیم الشان ہوگا۔

اسلامی روزہ دوسرے مذاہب کی جسمانی عبادات کے مقابل میں سہل العمل عبادت ہے | اوپر لکھا جاچکا ہے کہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان سب میں کسی نہ کسی شکل میں جسمانی عبادت کا حکم ہے لیکن اسلام اور ان مذاہب کی عبادتوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ اسلام کی یہ عبادت نہایت سہل العمل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ — خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔ سختی نہیں چاہتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دوسرے مذاہب نے تکلیف و تعذیب جسمانی کو بھی ایک قسم کی عبادت بنایا ہے، اس تخیل کا اثر یہ ہے کہ ہندو جوگیوں نے سخت سے سخت جسمانی ریاضتوں کی بنیاد ڈالی جن میں لمبا لمبا تک کھڑے رہنا، سخت دھوپ میں قیام کرنا، گرمی کے دنوں میں آگ کے شعلوں کے دائروں میں بیٹھنا جاڑوں میں برہنہ تن رہنا، دس دس برس تک ایک ہاتھ کو ہوا میں بلند رکھنا، سالہاسال تک ایک نشست پر قائم رہنا ایک ایک چلہ تک کھانا پینا چھوڑ دینا، تقرب الٰہی کے حقیقی راستے تھے۔

جینی فرقہ ناک، کان، اور منہ کو بند رکھتا ہے کہ کسی کیڑے کو اذیت نہ ہو۔ بدھ فرقہ کے بھکشو جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے۔ گھاس اور پتوں اور بھیک کے ٹکڑوں پر گذر اوقات کرتے تھے۔

ہندو جوگی چلے کھینچتے تھے جن میں کھانا پینا بالکل چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھار ایک دو لقمہ کھا لیتے۔ نصرانی راہبوں نے رہبانیت کی بنیاد ڈالی جس کے رو سے شادی بیاہ حرام کر لیا، ترک آسائش، مرغوب ترین عبادت قرار دی۔ کئی کئی روز کھانا پینا چھوڑ دینا، زہد و تقوی کی انتہا تھی۔ یہودیوں کے ہاں قربانی کے شرائط و ضروریات کا بیان تورات کے چار پانچ صفحوں میں مذکور ہے۔ افطار کے بعد صرف ایک بار کھانا کھا سکتے تھے۔ اس کے بعد دوسرے روز افطار کے وقت تک کچھ نہ کھاتے۔ اگر بغیر کھانا کھائے نیند آگئی تو پھر کھانا مطلق حرام تھا۔ روزے کے ایام میں بیویوں سے نہیں مل سکتے تھے۔

اسلام نے سب سے پہلے روزے کے اوقات کی تحدید کی۔ بعض لوگ زہد و تقوی کی راہ سے عمر بھر روزے رکھتے تھے۔، اسلام نے اس کو بالکل رد کر دیا۔

لا صام من صام الابد — جس نے برابر روزہ رکھا اس نے روزہ نہیں رکھا۔

اسلام کے سوا اور ادیان ملل میں رات و دن کا روزہ ہوتا تھا۔ اسلام نے روزے کی مدت صرف صبح سے شام تک ٹھہرائی ہے۔

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ — روزہ کو رات تک پورا کرو۔

ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ روزے کی پوری مدت میں مقاربت سے محترز رہتے۔ لیکن چونکہ یہ ممانعت خلاف فطرت تھی، اس لئے اکثر لوگ اس میں خیانت کے مرتکب ہوتے۔ اسلام نے اس حکم کو صرف وقت صوم تک کے لئے محدود کر دیا۔ یعنی صبح سے شام تک۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ	تمھارے لئے روزے کی شب میں اپنی بیویوں سے
إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ	مقاربت حلال کی گئی۔ وہ تمھارے لئے لباس ہیں اور
لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ	تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہو گیا کہ
تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا	تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے۔ پس اس نے تم کو معاف

عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا — گیا۔ اب ان سے ملو جلو اور خدا نے جو لکھا ہے
مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ (بقرہ) — اس کو چاہو۔

عمل روزہ کی مصلحت | شریعت کی اصطلاح میں روزہ سے جو طریق عبادت مفہوم ہے۔ وہ بظاہر ایک جسمانی تعذیب ہے لیکن حقیقتاً یہ نہیں ہے۔ یہ طریق عبادت۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص حکمت پر مبنی ہے۔ انسان میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ملکوتی اور بہیمی۔ بہیمی قوتوں کو نشو و نما کے عموماً زیادہ مواقع ملتے ہیں اس لئے یہ قوت غالب رہتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ بہیمی قوتوں کی نشو و نما کا سہارا غذائیں ہیں۔ پس اگر انھیں غذائیں کم پہنچیں گی تو ضرور ہے کہ ان کی شدت اور جوش میں کمی پیدا ہوگی اور جب یہ کمزور ہوئیں تو لازماً ملکوتی قوتوں کو ابھرنے اور بڑھنے کا موقع ملیگا۔ اب سوچئے روزہ سے یہ مقصد آسانی اور خوبی سے حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تجربہ شاہد ہے کہ روزے ہی سے یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

روزہ کا مقصد تقویٰ پیدا کرنا ہے | شریعت کا ہر حکم کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہے۔ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر تقویٰ پیدا ہو

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ — مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے لوگوں (یعنی اہل کتاب)
الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ — پر روزہ رکھنا فرض تھا تم پر بھی فرض کیا گیا ہے تاکہ
مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ — تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

یہ کھلی بات ہے کہ انسان کی قوت ملکوتیہ نشو و نما پائیگی تو رفتہ رفتہ اس میں ایک خاص استعداد اور صلاحیت پیدا ہوگی جس کو قرآن نے تقویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ انسان کو ہر آن اور ہر موقع پر خدا کا تصور ہو۔ اس کی نافرمانی کے خیال سے دل میں کپکپی اور روح میں لرزش پیدا ہو جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ نافرمانی کا دروازہ بند کرنا تقویٰ کا پہلا قدم ہے۔ روزہ دار مباح چیزوں اور جائز خواہشوں کو ترک کر کے نفس امارہ کو سمجھا دیتا ہے کہ اس کے لئے حرام چیزوں اور ناجائز خواہشوں

کی طرف رخ کرنے کی کچھ بھی گنجائش نہیں ہے۔

روزہ میں تشبہ بالملائکہ ہے | مخلوقات الٰہی میں فرشتے سب سے زیادہ مطیع و منقاد مخلوق ہیں۔ وہ مادی آلودگیوں سے بالکل پاک ہیں۔ ان کی غذا خداوند تعالیٰ کی تقدیس و تحمید ہے۔ ان کی فطرت نیکی، اطاعت اور معصومیت ہے۔ وہ مخلوق کی خاطر ہمہ وقت سرگرم استغفار رہتے ہیں، کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے کی ساری احتیاجات سے مستغنی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کی صفت یہ بیان کی ہے کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وَالْمَلٰٓئِکَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ (اور فرشتے ہیں کہ اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ (اس کی) تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں اور جو لوگ زمین میں رہتے ہیں ان کے لئے توبہ استغفار کیا کرتے ہیں)۔

انھیں سامنے رکھکر، ایک روزہ دار کی حالت پر غور کیجئے۔ ایک انسان ہے، مادیات سے رغبت اسکی فطرت ہے۔ کھانا پینا اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ جنسی ترغیبات سے گھرا ہوا ہے۔ اسکو خمیر میں ہے کہ دنیا کی چیزوں سے لطف اندوز ہو لیکن دفعتہً ان تمام مادی مرغوبات سے کنارہ کش، کھانے پینے سے الگ اور شہوانی خواہشات سے نفور ہو جاتا ہے۔ زبان خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہو جاتی ہے اور دل اس کے ذکر و فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ کیا یہ انسان فرشتوں کی راہ نہیں چل کھڑا ہوا ہے۔ کیا اس نے نیکی اور پاکی کی وہ زندگی نہیں اختیار کرلینی چاہی ہے جو خدا کی نظروں میں سب سے زیادہ محبوب ہے؟

روزہ سے ضبط نفس پیدا ہوتا ہے | انسانی طبیعت بہت بےچین، عجلت پسند، اور جلد باز واقع ہوئی ہے۔ جہاں نفس کی طرف سے کوئی طلب ہوئی آدمی اس کے پورا کرنے میں فوراً لگ گیا۔ بھوک پیاس اور اسی طرح کی دوسری ضرورتوں میں ہم نفس انسانی کی کمزوریوں کا تجربہ روز کرتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں ہی آدمی کو بھوک کا احساس ہوا۔ یا پیاس لگی، بےچین ہو کر آب و دانہ کی جستجو میں سرگرم

ہوگیا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنا پیٹ بھرے۔ وہ یہ بہت کم دیکھتا ہے کہ یہ چیز اس کو کہاں سے ملی اور کس طرح ملی۔ لیکن یہی انسانی سیرت ایک روزہ دار کے اندر بالکل مختلف حالت میں نظر آتی ہے۔ اس کو سخت سے سخت بھوک لگی ہے۔ شدت تشنگی سے بیتاب ہے۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہے۔ غذا سامنے موجود ہے۔ صاف شیریں پانی بھی سامنے ہی رکھا ہوا ہے۔ بے تکلف کھا پی سکتا ہے۔ بایں ہمہ وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ اور صبح سے شام تک کے لئے طبیعت کے سارے تقاضوں کو بالکل معطل کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب نفس کو اس طرح اس کے تقاضوں اور خواہشوں کے خلاف عمل کرنے کا خوگر بنایا جائے گا۔ تو انسان میں ہمت و عزیمت کی وہ روح ضرور پیدا ہو جائے گی جس سے اس کے تمام انسانی کمالات کی زندگی ہے۔

روزہ سے عملی مساوات اور ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے

انسان جب تک خود تکلیفوں سے دوچار نہیں ہوتا تکلیف کا احساس نہیں کر سکتا۔ جو لوگ دولتمند ہیں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ دوسروں کی بھوک پیاس کی تکلیف کا صحیح احساس ہرگز نہیں کر سکتے۔ اور وہ آہستہ آہستہ وہ سنگدل ہو کر تمام انسانی صفات و خصوصیات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے اسی روگ سے بچانے کے لئے اپنے پیروؤں پر روزہ فرض کیا کہ دولتمند روزے رکھ کر بھوک پیاس کی تکلیفوں کا عملی تجربہ حاصل کریں۔ تاکہ ان میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا احساس پیدا ہو۔ پس روزہ سے ایک طرف ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف عملی مساوات کی تعلیم ملتی ہے۔ روزہ کے ایام میں شاہ و گدا دونوں گویا ایک ہی تعلیم گاہ میں تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھنے لگتے ہیں۔

روزہ شکر گذاری کی عملی تصویر ہے۔

جس طرح نماز قدرت کی ان نعمتوں پر جو انسان کو ہر وقت ملتی رہتی ہیں۔ شکر گذاری کی عملی تصویر ہے اسی طرح نزول قرآن کی نعمت پر روزہ شکر و ممنونیت کا

ایک عملی تصویر ہے۔ نزول قرآن کا نعمت و رحمت ہونا بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت یہی ہے۔ اسی نے انسانیت کے لئے دائمی زندگی اور نجات کا دروازہ کھولا۔ اور روح کو جسم پر اور ملکیت کو بہیمیت پر فتح دی۔ پس ضروری ہوا کہ اس فتح کی خوشی اور شکرگذاری کے لئے ایک مخصوص مہینہ ہو جس میں انسان پاکی اور طہارت کے تمام لوازم اور تجرد و انقطاع کی ممکن سعی کے ساتھ اللہ کی اس نعمت اور روح کی اس فتح پر خوشی منائے اور شکرگذار رہو۔

ذیل کی آیت میں اسی شکرگذاری کی دعوت ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا	اور تاکہ تم گنتی پوری کرو، اور تاکہ اس ہدایت پر جو تم کو
هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ)	بخشی ہے اللہ کی بڑائی کرو تاکہ تم شکرگذار رہو۔

روزہ سے جہاد کی روح پیدا ہوتی ہے۔ انسان نے جو فطرت پائی ہے، اس کا اقتضاء ہے کہ وہ حق سے محبت کرے اور باطل سے نفرت۔ حق سے محبت کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان عمدہ صفات اور اعلیٰ جذبات کا حامل ہو۔ اور اپنی ان قوتوں پر پوری طرح قابو حاصل کرے جو راستی سے ہٹا کر غلط اور باطل راہ پر لگا دیتی ہیں اور ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے مقدم شرط اپنے نفس سے جہاد ہے۔ پس روزہ رکھکر روزہ دار اپنے نفس سے جہاد شروع کر دیتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ اس کے اندر جہاد کی وہ روح پیدا ہو جاتی ہے جو حق کی حمایت اور باطل کے استیصال کے لئے ہمیشہ سرگرم رہتی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ روزے سے وہ نتائج کیوں نہیں پیدا ہوتے جو پیدا ہونے چاہئیں۔ جواب یہ ہے کہ نتائج عمل کے ظہور کے لئے کچھ اصول و شرائط ہیں۔ جب ان شرائط پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے گا، صحیح نتائج کا ظہور ہوگا اور جب انہیں نظرانداز کر دیا جائے گا، صحیح نتائج نہیں پیدا ہو سکیں گے۔ پس روزے کی تکمیل کے لئے پہلی اور بنیادی شرط خلوص ہے۔ جو روزہ خلوص نیت سے خالی ہے وہ روزہ نہیں ہے فاقہ ہے۔ صرف کام و دہن کو

اکل و شرب سے محترز رکھنا روزہ نہیں ہے بلکہ روزہ یہ ہے کہ تمام ظاہری و باطنی اعضاء و جوارح اور قویٰ و احساسات صائم ہو جائیں۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور دل منکرات سے آلودہ نہ ہوں۔ زبان ہرگوئی اور کذب وافترا سے آشنا نہ ہو۔ اور اگر ان باتوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو یقیناً یہ روزہ مقبول نہ ہوگا۔

انجیل میں ہے۔

"دیکھو تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ جھگڑا رگڑا کرو۔ اور شرارت کے مکے مارو پس اب تم اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمہاری آواز عالم بالا پر سنی جائے۔ کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھکو پسند ہے؟ ایسا دن کہ اس میں آدمی اپنی جان کو دکھ دے، اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے؟ کیا تو اس کو روزہ دار اور ایسا دن کہے گا جو خداوند کا مقبول ہو، کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظلم کی زنجیریں توڑیں اور جوئے کے بندھن کھولیں اور مظلوموں کو آزاد کریں بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالیں کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنائے اور تو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے تب تیری روشنی صبح کے مانند پھوٹ نکلے گی۔ اور تیری صحت کی ترقی جلد ظاہر ہوگی۔ تیری صداقت تیری ہراول ہوگی اور خداوند کا جلال تیرا چنڈا دل ہوگا۔" (یسعیاہ باب ۵۸)

ایک دوسری جگہ ہے:-

"اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ ان کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے۔ تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔" (متی باب ۶)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ روزہ دراصل وہ ہے جس میں خلوص نیت کی کارفرمائی ہے۔

پس جو روزے خلوص نیت کے ساتھ رکھے جائیں گے مطلوبہ نتائج صرف ان ہی سے حاصل ہوں گے۔

خلاصہ پچھلی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان چونکہ جسم و روح دونوں سے مرکب ہے اس لئے دنیا میں جتنے مذاہب ہیں سب میں جسمانی عبادت کا حکم موجود ہے مگر اسلام کے سوا اور مذاہب کی جسمانی عبادتیں انسانی فطرت سے ہم آہنگ نہیں۔ البتہ اسلام کی جسمانی عبادت نہایت سہل العمل اور فطرت کے مطابق ہے۔ چونکہ عبادت کا مقصد طہارت روح ہے اس لئے اسلام نے اسی اصل پر زیادہ زور دیا ہے اور روح میں پاکیزگی پیدا کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس سے مسلمانوں میں تقویٰ کے ساتھ جہاد کا صحیح اور سچا جذبہ پیدا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صبر و عزیمت جو جہاد کے لئے اولین شرط ہے۔ وہ روزہ کی اصلی خصوصیت ہے نیز روزہ رکھ کر آدمی اپنے نفس سے جہاد شروع کر دیتا ہے اور اس طرح جہاد کی پہلی منزل میں قدم رکھ دیتا ہے۔

مقالات

مولانا حمید الدین رحؒ!

ولادت سنہ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۲ء ۔ وفات سنہ ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء

از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ظلہٗ

یہ مضمون معارف نمبر ۱ و ۲ جلد ۲۷ میں شایع ہو چکا ہے۔ (اڈیٹر)

فغاں کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش   دگر چگونہ تسلی کنم من این لب و گوش

اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علمار کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کل (حمید) وہ تھے، جن کی ولادت اور نشو و نما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع، اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیات زمانہ کے علم و فہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا، اس سے پہلے ان تمام علمار نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں، لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ ہے۔

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علمار کی مثالیں ہیں جنھوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی، اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی، ایچ، ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ آج پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں، اس کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڈھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے، مگر وہ تھی، جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں۔

ولادت | اعظم گڈھ سے دو ورا اسٹیشن پہلے پھریہا ایک گاؤں ہے، وہی مولانا کا پدری وطن تھا، اسی پھریہا کو عربی شکل دیکر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین ممیرے پھوپھیرے بھائی تھے، مولانا حمید الدین کے والد مولوی عبد الکریم صاحب مولانا شبلی کے ماموں تھے، دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی، مولانا شبلی ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے، اور مولانا حمید الدین صاحب ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۲ء میں، مولانا حمید الدین کے حقیقی چھوٹے بھائی شیخ حاجی رشید الدین صاحب ہیں، جو علی گڈھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں میں ہیں اور سرسید کے عہد کے طالب العلم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مولانا کا اصلی نام تو حمید الدین تھا، مگر وہ اس نام کو جو درحقیقت عربی قاعدہ سے لقب ہے، اپنی معنوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لئے وہ عربی تصانیف میں اپنا نام عبد الحمید لکھتے تھے اور تمام بڑے بڑے عالمانہ آداب و القاب کو چھوڑ کر صرف معلم کہلانا اپنے کو پسند فرماتے تھے، بنا بریں، وہ اپنا نام المعلم عبد الحمید الفراہی، کتابوں کی لوحوں پر لکھا کرتے تھے۔

تعلیم | مولانا نے پہلے حفظ شروع کیا، اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی ضلع کے ایک دیہات چتارا کے باشندہ مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھیں، اس زمانہ میں شرفا کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جزو تھا، مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ فارسی زبان اور فارسی

ادب کا ذوق بچپن سے ان میں نمایاں تھا، اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلی کتابیں اعظم گڈھ میں مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے پڑھ رہے تھے، مولانا فاروق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے، مولانا حمید الدین صاحب کی آمد و رفت یہاں بھی رہا کرتی تھی، اور یہ عالمانہ صحبتیں ان کو ملا کرتی تھیں۔

ابھی مولانا کی عمر سولہ برس کی تھی، کہ فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا، جس کی ردیف آئینہ اور قافیہ جوہر، کیفر وغیرہ ہے، سلطان عبد الحمید خاں کی مدح میں ہے، مطلع ہے۔

بے جلوہ رخ تو بود مضطر آئینہ | خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

بعد کے شعر ہیں۔

گیسوئے ہمچو شب تو بیار لے دم صبح | فرمائے تو بیاورد از خاور آئینہ

گستاخ دیدہ است بروئے تو لاجرم | چشم سپید یافت بدیں کیفر آئینہ

آئینہ واگذار و بیاور دو دیدہ ام، | چشمم بود ز آئینہ بہتر ہر آئینہ

در بزم انس خویش چرا جائے دادہ | تا می شود برابر تو اکثر آئینہ

کے با ضمیر شاہ شود ہمسر آفتاب

کے روئے ہمچو ماہ ترا ہمسر آئینہ

۲۸ شعروں کا قصیدہ تھا، لوگوں کو پڑھکر بڑی حیرت ہوئی، یہ فارسی، یہ لطف زبان، یہ شیرینی اور یہ شکوہ دیکھکر سب کو تعجب تھا، مولانا شبلی فرماتے تھے، کہ میں نے اس کو لیجا کر مولانا فاروق صاحب کو دکھایا اور پوچھا کہ آپکے نزدیک یہ کس کا کلام ہے، انھوں نے فرمایا یہ تو نہیں بتا سکتا، مگر قدما میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے، مولانا شبلی نے فرمایا یہ حمید کا ہے، حیرت ہوگئی۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت ذہین، نہایت طباع، اور نہایت دقیقہ رس تھے، انکا ذہن نہایت صاف تھا، وہ اول ہی وہلہ میں بے کج و پیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، ان کا تیر نظر مسائل کی تشریح اور مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا، دماغ اتنا سلجھا تھا، کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس کی اصل تہ تک پہنچ جاتے تھے، اور اگر وہ مناظرہ پر اتر آتے تو کیسی ہی غلط بات ہو وہ اسکی ایسی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے تھے کہ حریف ساکت ہو جاتا تھا، اور سمجھ لیتا تھا کہ یہ مولانا کی اصلی رائے ہے، مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکرا کر فرماتے کہ یہ تو غلط تھا، اصلیت یہ ہے۔

فارسی کے بعد مولانا نے عربی کی تعلیم شروع کی اور بھائی (مولانا شبلیؒ) سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ متوسطات تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، مولانا شبلی جب یہاں سے باہر نکلے تو یہ بھی گئے، لکھنؤ جاکر مولانا حمید الدین صاحب نے فرنگی محل میں، مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی سے کچھ پڑھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی (پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ و مصنف قیصر نامہ) لکھنؤ میں فارسی کے نہایت مستند استاد اور شاعر تھے، ان کی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا، اور ان دونوں بھائیوں سے خواجہ صاحب کے اسی فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبت، عزیزانہ حیثیت تک پہنچ گئے تھے، لکھنؤ کے بعد مولانا لاہور جاکر مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں یہاں نیا نیا اورنٹیل کالج کھلا تھا، مولانا فیض الحسن صاحب اپنے عہد کے مشہور ادیب اس میں مدرس تھے، ان کا نام سنکر دور دور سے طلبہ پڑھنے آتے تھے، لیکن مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا فیض الحسن صاحب سے خارج میں پڑھا، اور یہیں انکی ملاقات مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی سے ہوئی، اور وہ دوستی تک پہنچی، جو آخر تک قائم رہی، اور اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد تک پہنچے۔

مولانا بیس برس کی عمر میں ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۴ء میں عربی تعلیم سے فارغ ہو گئے، اور عربی ادب میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ سچ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے استادوں سے بھی گوئے سبقت لے گئے، ان کا عربی دیوان اس

بیان کا شاہد ہے۔

انگریزی تعلیم اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، مگر یہ کفر مولانا نے توڑا، نیچ کے طور پر انگریزی کچھ پڑھ لینے کے بعد کرنل گنج اسکول الہ آباد میں داخل ہوگئے، انٹرنس کا امتحان پرائیوٹ طور پر دے کر ایم، اے، او کالج علی گڈھ میں داخل ہوئے، یہ علی گڈھ کالج کے اوج شباب کا زمانہ تھا، سرسید اسکے ناظم اعلیٰ، مسٹر آرنلڈ اور بک وغیرہ اس کے پرنسپل اور پروفیسر، اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا حالی وہاں کے مقیم ساکن تھے، ہر وقت علمی مسائل و تحقیقات کے چرچے رہتے تھے، اور ان بزرگوں کی صحبتیں حاصل تھیں، جنمیں ہونہار طالب العلم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا، مسٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے، مولانا کو فلسفہ جدیدہ کا ذوق انھیں کی تعلیم سے ہوا۔

اس زمانہ میں کالج کے ہر طالب العلم کو عربی و فارسی بھی لازماً پڑھنی پڑتی تھی، مگر سرسید نے ان کے متعلق مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی و فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپکے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں، اس لئے ان کو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے، چنانچہ وہ مستثنیٰ کئے گئے۔

مولانا حمید الدین صاحب کی تالیف و تصنیف کا عہد طالب العلمی ہی سے شروع ہوگیا تھا اور خود بزرگوں نے فرمائش کرکے شروع کرایا، اسی زمانہ میں علی گڈھ کالج کے دینیات کے لئے سرسید نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرۃ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا، جس کا نام "تاریخ بدء الاسلام" ہے، پھر مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا، استاد و شاگرد کے یہ دونوں عربی و فارسی رسالے اسی وقت چھپ گئے تھے۔

سرسید کو طبقات ابن سعد کا ایک ٹکڑا وفود نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا تھا، اسوقت تک یہ چھپی نہیں تھی، سرسید نے مولانا حمید الدین صاحب سے اسکا فارسی ترجمہ کرا کے چھپوایا، اس کی زبان ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے۔

غالباً ۱۸۹۲ء میں یا اسکے پس و پیش الہ آباد یونیورسٹی سے بی، اے کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم اے کا امتحان دینا چاہا، مگر نہیں دیسکے[1] ۱۸۹۶ء میں مدرسۃ الاسلام کراچی میں مدرسی کی کوشش کی، سر سید نے سرٹفکٹ دیا[2] اسی زمانہ میں مسٹر آرنلڈ انگریزی میں عربی گرامر کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرانا چاہتے تھے، اس کیلئے مولانا ہی کا نام ان کے ذہن میں تھا[3]

ملازمت بہرحال مولانا کا تعلیمی عہد ختم ہوگیا، ۱۸۹۷ء میں وہ مدرسۃ الاسلام کراچی میں پروفیسر مقرر ہوگئے۔ یہ مسلمانوں کا ایک انگریزی کا بہت پرانا اسکول ہے، اس کی عمارت بہت شاندار، اور اسٹاف اعلیٰ ہے، اور سندھ میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے، مولانا اس میں ۱۹۰۶ء تک رہے ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمن خاں والی کابل ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ابن خلدون کا ترجمہ بھی پیش نظر تھا اس کے لئے مولانا شبلی نے ان کا انتخاب کیا، مگر کسی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اور وہ کراچی میں بدستور رہے اور درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ۱۹۰۳ء میں ان کا فارسی دیوان شایع ہوا، اور مولانا شبلی مرحوم کے بار بار کے تقاضے سے جیسا کہ مکاتیب شبلی جلد دوم کے ان کے خطوط سے ظاہر ہے، علمی مباحث پر نقد و نظر کی طرف توجہ فرمائی، اور خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک کے نظم و بلاغت میں انہماک پیدا ہوا، اور جمہرۃ البلاغۃ نام رسالہ لکھا جس کا خلاصہ مولانا شبلی مرحوم نے خود اپنے قلم سے الندوہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں شایع کیا۔

اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۰۴ء میں) جب اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے سواحل عرب اور خلیج فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا، اور سواحل کے عرب شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لئے جمع کیا تھا، تو مولانا ہی کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا، وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ

---

[1] مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمید الدین صاحب خط نمبر ۱، [2] مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمید الدین صاحب، خط نمبر ۲ [3] ایضاً خط نمبر ۳،

اور عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی تھی، وہ انھیں کی لکھی ہوئی تھی، ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ نے علی گڈھ کالج کو ایک معتد بہ عطیہ عربی تعلیم کے لئے دیا تھا جس کے لئے شرط یہ تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یورپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لئے انتخاب ہوا، ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، اور وہ علی گڈھ چلے آئے، علی گڈھ میں بھی وہ زیادہ دن نہیں رہے، بہرحال جتنے دن بھی رہے، اپنے علمی کاروبار میں مصروف رہے، ہارویز صاحب مولانا سے اپنی عربی کی تکمیل کرتے تھے اور مولانا ان سے عبرانی سیکھتے تھے، اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کے اجزا کی تالیف کا کام جاری تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق کے سبب سے، پھر خود مولانا حمید الدین صاحب کے ذاتی فضل و کمال کے باعث علی گڈھ کے علمی حلقہ سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے، خصوصاً نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی رئیس حبیب گنج کی ذوق آشنا اور قدر شناس نگاہوں سے وہ کہاں بچ سکتے تھے، چنانچہ اکثر آمد و رفت رہتی تھی، نواب صاحب ممدوح نے مولانا کی وفات کے بعد جو والا نامہ مجھے لکھا ہے اس میں رقم فرماتے ہیں۔

"مجھکو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ (شبلی) مرحوم تھے، علی گڈھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا، پھر حیدرآباد میں .... علی گڈھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا تصنیف جاری تھا روزانہ سویرے سے صبح کے نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے، ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے، اس زمانہ میں دیگر کتب سماوی کا مطالعہ اور اس کی رو سے مطالب قرآنیہ کی حل خاص کر پیش نظر تھا، اسی حالت میں علی گڈھ چھوڑا۔"

اجزا جو لکھے جاتے تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، اور مولانا اسکے متعلق اپنی رائے خطوط میں اور زبانی ظاہر فرماتے تھے، شروع شروع میں استاد کو اپنے شاگرد کے اس نظریہ سے اختلاف تھا کہ قرآن پاک کے مطالب معانی مرتب و منظم ہیں، اور وہ مولانا حمید الدین صاحب کی اس کوشش کو

رائگاں سمجھتے تھے، لیکن جب انھوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزا دیکھے تو قائل ہوتے چلے گئے، اور آخر داد دینے لگے، اور حوصلہ افزائی کرنے لگے، اور آخر آخر میں تو وہ مولانا حمید الدین کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہو گئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے،[1] ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ کے اجزاء بغور دیکھے، تفسیر پر تمکو مبارکباد دیتا ہوں، تمام مسلمانوں کو تمہارا ممنون ہونا چاہئے، بلاغت کے بعض اجزا معمولی اور سرسری ہیں، ارسطو کا رد البتہ قابل قدر ہے" (۶ جون ۱۹۰۵ء)

علی گڈھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انھوں نے اقسام القرآن لکھی، یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں، اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن القیم نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارہ میں انھوں نے ایسی داد تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے ان کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ الندوہ اپریل ۱۹۰۶ء میں شایع کیا، اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شایع ہوا، اسکے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے مؤید کر کے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڈھ میں چھپوایا،[2] اس وقت سے لیکر آجتک مختلف مدعیان تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا ہے، وہ تمام تر مولانا کے خوان علم کی زلہ ربائی ہے۔

اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورۂ ابی لہب اور سورۂ قیامت کی تفسیریں چھپیں اور اہل علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ سید رشید رضا صاحب المنار مصر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی۔

۱۹۰۴ء کے بعد جب مولانا حمید الدین صاحب کراچی یا علی گڈھ سے وطن آتے جاتے تو لکھنؤ میں بھائی کے

---

[1] یہ تمام مدارج مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں نظر آئیں گے، [2] ابھی حال میں دار المصنفین نے مولانا کے اس رسالہ کو مصر سے خوبصورت ٹائپ میں چھپوایا ہے، ایک مہینہ میں امید ہے کہ ہندوستان پہنچ جائے، شاید ۸ر قیمت ہو۔

پاس کچھ دن ٹھہر کر آتے جاتے، اور ۱۹۰۶ء سے مولانا خاص طور سے تقاضا کر کے بلواتے اور اپنے پاس ٹھہراتے، مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ انھیں کے اصرار سے کئی دفعہ وہ ندوہ میں آ کر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے، میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب العلم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام صاحب مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے، اور الندوہ کے مددگار اڈیٹر تھے، وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے، اور قرآن پاک کے درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے، اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کی مختلف مناظر، سب کی نظروں کے سامنے آئے، اسی زمانہ میں، ندوۃ العلماء نے انکو اپنی مجلس انتظامی کا رکن بنایا، اور آخر زمانہ تک وہ برابر رکن رہے۔

مولانا حمید الدین صاحب علی گڈھ میں دو سال کے قریب رہے، اسکے بعد ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کالج کی درس کے علاوہ بقیہ اوقات وہ تالیف و تصنیف میں صرف کرتے تھے، یہیں سے انھوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر شایع کی، اور خالص فارسی میں یعنی عربی الفاظ کی آمیزش کے بغیر، حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم (مثنوی) میں ترجمہ شروع کیا تھا، مولانا کا الہ آباد ہی میں قیام تھا کہ ان کے اہل برادری میں ایک نئے عربی مدرسہ کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے اس تحریک کی عنان اپنے ہاتھ میں لی اور ۱۹۱۰ء اعظم گڈھ میں مولانا حمید الدین صاحب کے قریہ پھریہا سے ایک اسٹیشن بعد سرائے میر نام مقام میں آبادی سے باہر ایک باغ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا شبلی نے اس کی نظامت کا بار مولانا حمید الدین صاحب کے کندھے پر رکھنا چاہا، ۱۹ اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں۔

"کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو۔"[1]

اس مدرسہ نے رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے زیر ہدایت ترقی شروع کی، اور یہ لوگ کبھی کبھی اس کو دیکھتے رہے۔

مولانا ۱۹۱۳ء تک الٰہ آباد میں رہے۔

حیدرآباد دکن میں دارالعلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا جس نے حیدرآباد کی علمی و تعلیمی ترقی میں کارنمایاں انجام دیا تھا، اسکا الحاق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے تھا، غالباً ۱۹۰۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا، اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ دار افسروں کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات و تغیرات کی فکر لاحق ہوئی، اور اس کے لئے نواب عماد الملک مرحوم سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن، اور مسٹر الماللطیفی آئی، سی، ایس جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے، اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی مجلس بنائی جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا نے اسکے لئے ایک اسکیم مرتب کی، اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی، یہ تجویز اسی وقت الندوہ میں مولانا نے شایع بھی کر دی تھی، مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت کا تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی یہ ایک یونیورسٹی ہوگی جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی، یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی، اس اسکیم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لئے مولانا حمید الدین صاحب کا انتخاب ہوا، اور وہ اسکے صدر (پرنسپل) بنائے گئے، اور ۱۹۱۴ء کے اوائل میں الٰہ آباد سے حیدرآباد چلے گئے۔

حیدرآباد جا کر اس نئی مشرقی یونیورسٹی کے خاکہ بنانے میں مصروف ہوئے، درس و تدریس کے

---

[1] مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۳۳،

علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی ان کو کرنی پڑتی تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ مدرسہ کی ظاہری و باطنی ترقیوں کی کوششیں شروع کیں، مسٹر الماطیفی سے ان کے خیالات کا اتحاد نہ ہوا، بالآخر ایک دو سال کے بعد مسٹر الماطیفی کی جگہ اس مسعود صاحب نے لے لی، اور انھوں نے ان کے ساتھ ملکر کام شروع کیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے نواب عماد الملک مرحوم نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا، وہ نصف کے قریب انجام پا چکا تھا، مگر اس میں جا بجا نقائص تھے، نواب صاحب نے مولانا حمید الدین صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا، اور مدت تک یہ معمول جاری رہا، کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے، اور نواب صاحب باایں ہمہ ضعف و پیری انگریزی ترجمہ پڑھ کر غور کرتے، اور مناسب مشورہ ملنے پر اصلاح و ترمیم کرتے، اس طرح انکے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی، پھر یہ کام رک گیا، لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ اصلاح شدہ اجزا، اس طرح کاغذات میں مل گئے کہ پھر ان کا پتہ نہ چلا، میں نے نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تحریری و زبانی کئی دفعہ انکی تلاش کی طرف توجہ دلائی، مگر انھوں نے ان کے ملنے سے مایوسی ہی ظاہر کی۔

مولانا شبلی مرحوم اس وقت سیرۃ نبویؐ کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی سے مشورے لیتے رہتے تھے، جو مکاتیب (۵۷-۳۰) سے ظاہر ہیں، سیرت جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت اور قربانی کے متعلق جو باب ہے، اس کا مواد مولانا حمید الدین ہی نے بہم پہنچایا تھا، جس کو آئندہ چلکر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے بڑھا کر اور پھر اور زیادہ استقصا کر کے (الرای الصحیح فی من ھو الذبیح) کے نام سے الگ شائع کر دیا۔ (باقی)

ادبیات

کیا ہوں؟

از جناب مرزا محمد احسان صاحب وکیل اعظم گڑھ

اک گدائے بے نوا ہوں اک فقیر رہ نشین
ہے نظر لیکن مری بالائے فردوس بریں

پیکر خاکی میں رقصاں ہے مرے وہ موج نور
جس سے شرمندہ جمال فطرت روح الامیں

اپنے ہی فطرت کے جلوؤں کا تماشائی ہوں میں
آستان غیر کی طالب نہیں میری جبیں

ایک مشت خاک ہوں لیکن وہ مشت تابناک ہوں
جس کا ہر ذرہ ہے جلوہ گاہ صد مہر مبیں

جس کی نور افشانیوں پر برق لاہوتی نثار
ہے مرے جام سفالیں میں وہ موج آتشیں

جسکی تابانی سے روشن ہے فضائے کائنات
وہ شرار معنوی ہے یہ مری جان حزیں

وہ دل بیدار سینے میں ہے میرے گرم رقص
جسپہ ہے قربان خود حسن لطافت آفریں

عاصی و مجرم ہوں لیکن ہوں وہ رند خود شناس
جس کا ذوق تشنگی منت کش ساغر نہیں

میری ان آنکھوں میں وہ نور محبت ہے نہاں
جو مٹا دیتا ہے دل سے امتیاز کفر و دیں

روح میری اس گداز عشق سے ہے مضطرب
جس سے ہے جنبش میں یہ گہوارۂ چرخ و زمیں

اس سر پر شور میں رکھتا ہوں وہ ذوق جنوں
غم نہ جس کو کچھ گریباں کا نہ فکر آستیں

ذرہ ذرہ جس کو آتا ہے نظر یوسف کدہ
مجھکو قدرت نے عطا کی ہے وہ چشم نکتہ بیں

بے نوائی میں وہ شان کج کلاہی ہے مری
جس کے آگے سرنگوں ہے سطوت تاج و نگیں

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن مرا
قلب ہے میرا منور ہے نظر میری حسین

تلخیصات

رحمت یا لعنت!

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی نے آج ہمارے سامنے طرح طرح کے سیاسی اور معاشی مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور اندیشہ ہے کہ انہی سیاسی اور معاشی مسائل کے اندر سے بہت جلد بعض مذہبی مسائل کی شاخیں پھوٹ نکلیں گی جن پر ارباب سیاست اور ارباب مذہب دونوں کو غور کرنا پڑے گا۔ پس بہتر ہے کہ اس وقت اس مسئلہ پر مخالف و موافق جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ پیش نظر رہے۔ اسی مقصد سے ذیل کا مضمون شائع کیا جاتا ہے جو پروفیسر ایس جی واتی کے قلم سے نکلا ہے اور "ہندوستان ٹائمس" میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر موصوف فرماتے ہیں:۔

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی نے بہت سے حلقوں میں ایک سخت اضطراب سا پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ اس کو ایک خطرہ سمجھ کر اس کو روکنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں پیش کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ لوگ سخت وہمی ہیں اور معاملات پر ان کے صحیح پہلو سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں۔

واقعات جو کچھ بھی ہوں، لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی آبادی غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے۔ صرف آبادی کے اضافہ کو دیکھنا اور ہندوستان کی ناپیداکنار وسعت پر غور نہ کرنا سخت غلطی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ دونوں چیزیں پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہونی چاہئیں ہندوستان کے رقبہ کا جائزہ لئے بغیر آبادی کی بڑھوتی کوئی ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔

ولایات متحدہ امریکہ میں باعتبار ہندوستان فی مربع میل تگنے آدمی بستے ہیں۔ انفلوئنزا اور جنگ کے مصائب کے باوجود ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان امریکہ کی آبادی میں تقریباً ۱۴ فیصدی کے حساب سے

اضافہ ہوا ہے۔ درانحالیکہ اس مدت میں ہندوستان کے اندر ۲ فیصدی سے زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔

لیکن ہمارے لئے صحیح مثال کسی مشرقی ملک کی ہوگی۔ اچھا جاپان کو لیجئے۔ جاپان کا معیار زندگی بہت اونچا نہیں ہے۔ بہت آسانی سے اس کا مقابلہ ہندوستان کے معیار زندگی سے کیا جاسکتا ہے۔ تاہم وہاں آبادی کے اضافہ کے لحاظ سے وہ اسقدر آگے ہے کہ ہندوستان اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پس یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آج آبادی کے اضافہ کی وجہ سے سب سے زیادہ پریشانی آخر ہم ہی کو کیوں لاحق ہو۔ اور ہم اسی کو وقت کا سب سے بڑا سیاسی اور معاشی مسئلہ کیوں سمجھنے لگیں۔؟؟

معاملہ کا ایک پہلو نہایت دلچسپ ہے کہ آج جو لوگ آبادی کے اضافہ کو ہندوستان کی سب سے بڑی مصیبت قرار دے رہے ہیں وہ یا تو انگریزی حکومت کے ایجنٹ ہیں یا ضبط تولید (Birth control) کے داعی۔ انگریزی حکومت پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس نے ملک کی تجارتی اور زراعتی ترقی کو نہایت سخت نقصان پہنچایا، لیکن حکومت کی طرف سے کبھی یہ اعتراض صحیح تسلیم نہیں کیا گیا اور جواب میں طرح طرح کے عذرات پیش کئے گئے۔

لیکن آہستہ آہستہ اصل حقیقت اسقدر واضح ہوگئی کہ حکومت کے لئے اس سے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی۔ چنانچہ رائل اگریکلچر کمیشن نے بھی اپنی تحقیقات میں ہندوستانیوں کے اس اعتراض کو بہت حد تک صحیح پایا۔ ان انکشافات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ انگریزی راج کے ہوا خواہ ہیں ان کو فکر ہوئی کہ کسی طرح ہندوستان کی اس مفلسی اور تباہی کے الزام کو حکومت کے سر سے دور کریں اور خود ہندوستان کے سر ڈالیں۔ چنانچہ انھوں نے اس خواہش کے ساتھ طرح طرح کے نظریئے تراشنے شروع کر دیئے۔ از انجملہ ایک نادر نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تباہی اور مفلسی کا اصلی ذمہ دار ہندوستان کا موجودہ معاشرتی نظام ہے۔ مس میو کی مشہور کتاب "Mother India" اسی مقصد کے ماتحت لکھی گئی اور سمجھنا چاہیئے کہ اس سلسلہ کی سب سے پہلی اور سب سے نادر کڑی وہی ہے۔

اگر آبادی کا اضافہ رحمت نہیں بلکہ مصیبت اور لعنت ہے، جیسا کہ ہم میں سے بہتیرے سمجھتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ صرف ہمارے ہی لئے کیوں لعنت ہے۔ اٹلی، جرمنی اور جاپان کیلئے کیوں لعنت نہیں ہے جنکی آبادی بے اندازہ بڑھ رہی ہے۔ اور ان کے سامنے اس کے روکنے کا کوئی سوال نہیں ہے؟ بلکہ ان کو اس بات پر بڑا فخر ہے۔ وہ اس کو اپنی طاقت کا اضافہ اور ملک کی ترقی سمجھتے ہیں۔ اور پوری سرگرمی کے ساتھ اسکی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

انگلینڈ جو اس باب میں نسبتہً قدامت پرست خیال کیا جاتا ہے اگرچہ اضافہ آبادی کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہا ہے تاہم وہاں مدبرین کے سامنے یہ خطرہ ضرور ہے کہ بعض جدید رجحانات کی وجہ سے کہیں اسکی آبادی میں غیر معمولی کمی نہ واقع ہو جائے اور اسکی طاقت گھٹ نہ جائے۔

الغرض جبکہ تمام دنیا اضافۂ آبادی کو ایک رحمت سمجھ رہی ہے۔ یا کم از کم اسکی کمی سے خطرہ محسوس کر رہی ہے، ہندوستان تنہا ایک ایسا ملک ہے جو اپنی آبادی کے اضافہ سے خائف ہے۔ اور کسی طرح اس لعنت سے رہائی پانیکی تدبیریں سوچ رہا ہے۔

ایک دلچسپ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سیاسی حالات اور مذہبی رجحانات اضافہ آبادی کے حق میں ہیں۔ جمہوری نظام حکومت کے انعقاد نے اقلیتوں میں اپنا پوزیشن سنبھالنے کے لئے ایک خاص ہماہمی اور سرگرمی پیدا کر دی ہے کیونکہ انکو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ نئی نظام حکومت کے اندر انکا وزن انکی آبادی کے تناسب سے ہوگا۔ اس خیال نے تمام اقلیتوں میں ایک قسم کی مسابقت کی لہر دوڑا دی ہے۔ اور ہر ایک اس کوشش میں منہمک ہے کہ اپنی آبادی میں اضافہ کرکے نظام حکومت میں اپنی حیثیت زیادہ سے زیادہ مضبوط کرے۔ گول میز کانفرنس کے زمانہ میں آغا خاں نے امریکہ کو جو بیان براڈ کاسٹ کیا تھا اس میں اسی طرح کے ولولہ کا اظہار کیا گیا تھا۔ انھوں نے نہایت پر امید لہجہ میں فرمایا کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابل میں زیادہ سرعت کیساتھ اپنی آبادی بڑھا رہے ہیں اور توقع ہے کہ دس برس ختم ہوتے ہوتے وہ ۱۰۰ ملیون تک پہنچ جائیں گے۔

بعض مہا سبھائی ہندوؤں مثلاً ڈاکٹر منجے وغیرہ نے یہ سنا تو اسکو ایک چیلنج سمجھا اور ان کو اس کے مقابل میں ہندو آبادی کو بڑھانیکی فکر ہوئی۔ انھوں نے اپنا گول بہت آگے بڑھکر قائم کیا۔ ان کے خیال کے لحاظ سے ہندوؤں کی تعداد ... ملین ہونی چاہیے کیونکہ ڈاکٹر منجے کے نزدیک مہابھارت کے وقتوں میں ہندوؤں کی آبادی اسی قدر تھی۔

ان انفرادی رجحانات اور اضطراری حالات کے باوجود عام خیال یہی ہے کہ آبادی غیر معمولی سرعت
اور اس کو کسی نہ کسی طرح رکنا چاہئے؟ روکنے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ ضبط نفس (Self control) یا ضبط
(Birth control)۔ ضبط نفس نہایت عمدہ چیز ہے لیکن ہم کو امید نہیں ہے کہ یہ اسقدر عام
ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ اس سے حل کیا جاسکے۔

اب صرف برتھ کنٹرول کا مصنوعی طریقہ رہ گیا۔ لیکن موجودہ حالات کے اندر اسکے بھی عام ہونیکی
ہندوستان کی عام پبلک جو بالکل بے پڑھی لکھی ہے۔ کتنی ہی وسعت کے ساتھ پروپگنڈا کیا جائے، اسکو نہ
عمل میں لاسکتی۔ جن طبقوں میں اس طرح کے مصنوعی طریقوں کو قبول کرنے اور برتنے کی صلاحیت مو
بھی صحت اور کامیابی کے ساتھ اسکو برتا نہیں جاسکا تو عام پبلک کا جو ان نزاکتوں کے سمجھنے اور عمل
نہیں رکھتی کیا حال ہوگا؟ فرض کرلو کہ یہ طریقہ چل گیا اور عوام و خواص سبنے اس نازک فن کو سیکھ
خطرہ نہیں ہے کہ اس کے معاشرتی نقصانات ایک دن پورے ملک کو تباہ کرکے چھوڑ دیں؟

ان وجوہ سے ہندوستان میں آبادی کے مسئلہ پر جب جب غور کیا گیا میں نے یہی سمجھا
بالکل لاطائل ہے۔ اولا تو یہ کوئی اہم مسئلہ ہی نہیں ہے اور اگر کچھ اہمیت رکھتا ہے تو کم ازکم اتنی بات تو ضرور
غور کرنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہم نے وقت سے بہت پہلے اس پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔

بروقت ہم کو جن مسائل پر غور کرنا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم کو ملک میں
وسائل پیدا کرنے چاہئیں۔ اور نئے پیشے اور نئی صنعتیں ایجاد کرنی چاہئیں۔ زراعت او
راہیں کھولنی چاہئیں۔ غذا کے مسئلہ پر غور کرنا بھی کچھ نہ کچھ مفید ہوگا۔ بشرطیکہ پوری وسعت
جائے۔ ہماری کوششیں ایجابی ہونی چاہئیں۔ سلبی کوششوں کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔

تقریظ و تبصرہ

اسلام اور روح سائنس و تمدن:۔ مصنفہ مولوی عبدالکریم صاحب بی۔ اے، ایم۔ ایل۔ سی۔ مترجمہ جناب شیخ عبدالمجید صاحب بی، اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۳ صفحے۔ کاغذ عمدہ کتابت وطباعت نہایت روشن قیمت ۲/ ملنے کا پتہ مرقوم نہیں۔ غالباً کلکتہ میں مترجم کے پتہ سے مل سکے گی

مذکورہ بالا عنوان پر یہ مقالہ پہلے انگریزی میں چھپا تھا۔ اب اسے اردو میں ترجمہ کرکے چھوٹی سی کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اس خیال کی پرزور تردید کی گئی ہے کہ "اسلام ترقیات اور علوم وفنون کا مانع ہے"۔ قرآنی آیات، احادیث اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام علوم وفنون کی راہ میں روک نہیں، بلکہ جملہ علوم وفنون کا معاون و سرپرست ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے علوم وفنون کی بہت زیادہ خدمت کی اور کتنے مردہ علوم کو دوبارہ زندگی بخشی ہسپانیہ کا عربی تمدن ہی موجودہ مغربی تمدن کا سرچشمہ ہے۔ اور آج یہ جو کچھ نظر آرہا ہے سب اسلام ہی کا رہین احسان ہے مصنف نے مخالفین کے بیانات اور انہی کی تحریری شہادتوں سے یہ واضح کردیا ہے کہ اسلام نے دیگر مذاہب کے مقابلہ میں سائنس کو زیادہ ترقی دی۔ اور جملہ علوم وفنون میں سے بعض کو مسلمانوں نے ایجاد کیا اور بعض کے مٹے ہوئے نشانات کو پھر سے روشن کیا۔ غرض اس عنوان پر اختصار کے باوجود یہ مضمون نہایت اچھا ہے۔

دعوت اڈیٹر مولوی مطلوب الرحمان صاحب ندوی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۴ ضخامت ۱۲ صفحے۔ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت سالانہ تین روپئے۔ ششماہی عہ۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر دعوت، الہ آباد۔ یو۔ پی

یہ پندرہ روزہ تبلیغی اخبار ابھی حال میں جاری ہوا ہے۔ اب تک اس کے صرف دو نمبر نکلے ہیں۔ اٹھان اچھی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے استقلال کا سامان کر دیا تو انشاء اللہ اس سے تبلیغ دین کی مفید خدمتیں انجام پائیں گی۔ اس اخبار کا مقصد یہ ہے کہ اچھوتوں اور ہندوستان کی دوسری پست اقوام کے سامنے اسلامی مساوات، اسلامی معاشرت اور دوسری اسلامی تعلیمات کی خوبیاں نہایت آسان زبان میں پیش کی جائیں تاکہ آج جو جماعتیں پست حال ہیں اور ان کی پست حالی پر مذہب اور روایات کی سند قایم ہو چکی ہے دیکھ سکیں کہ دنیا میں ایک مذہب ایسا بھی موجود ہے جس نے نسل و خون کے تمام امتیازات مٹا کر بلندی و برتری کی بنیاد نیکی اور تقویٰ پر قائم کی ہے۔

مولوی مطلوب الرحمان صاحب نگرامی، جو اس اخبار کے اڈیٹر ہیں۔ تبلیغی کاموں کا ذوق اور تجربہ رکھتے ہیں بلکہ یہ چیز ان کا خاندانی ورثہ ہے اس لئے اگر ہم ان سے توقع کریں تو بیجا نہ ہوگی، کہ وہ اس راہ کی دشواریوں کے برداشت کرنے کے اہل ثابت ہوں گے۔

اخبار میں چند مضامین ہندی بھاشا زبان میں بھی ہوتے ہیں جو ناگری رسم الخط میں چھپتے ہیں۔ یہ چیز ہم کو نہایت پسند ہے۔ انشاء اللہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

جلد ۲ | ماہ رمضان المکرم سنہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۱۲

فہرست مضامین

شذرات

دو ہمدردوں کی موت!

ادھر پے بہ پے دائرہ اور مدرسہ کے دو دیرینہ ہمدردوں کی موت کی خبریں سننے میں آئیں اور دونوں نہایت ہی دردناک! ایک ڈاکٹر نظام الدین صاحب کی، دوسری جناب حافظ محمد اسحاق صاحب کی۔

ڈاکٹر نظام الدین صاحب اعظم گڈھ کے ایک دیہات مہوارہ کے باشندے تھے۔ ملایا میں ان کے والد کا وسیع کاروبار ہے اور اس سلسلہ سے ان کی تقریباً پوری زندگی وہیں گذری، وہیں انھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی، کچھ دنوں تک سرکاری ملازم رہے اور اب وہیں پرائیوٹ طور پر مطب کرتے تھے اور کاروبار کی دیکھ بھال میں اپنے بوڑھے باپ کے دست راست تھے۔ ۳۵ء میں ان سے ملایا میں ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت ہی صالح نوجوان تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے نہایت ہی پرجوش ہمدرد تھے۔ عین جوانی میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ غمزدہ باپ اور دوسرے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

حافظ محمد اسحاق صاحب مرحوم بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ہموطن تھے۔ ایک عرصہ سے بسلسلہ کاروبار رنگون میں مقیم تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے خاص ہمدردوں میں تھے۔ الاصلاح جس پریس پر چھپتا ہے انہی کا عطیہ ہے۔ امسال وہ بعزم سفر حج رنگون سے نکلے، چند دنوں کیلئے عزیزوں سے ملنے کی خاطر وطن آئے۔ یہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی، اس میں مبتلا ہوئے اور انتقال فرمایا۔ ان کی موت قابل رشک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے صالح اور نوجوان فرزند کو ان کی خوبیوں کا وارث بنائے۔

وزیر تعلیم مدرسۃ الاصلاح میں

آنریبل وزیر تعلیم (صوبہ یوپی) ۹ دسمبر کو اعظم گڈھ تشریف لائے تھے۔ اسی سلسلہ میں کچھ دیر کیلئے اپنے مدرسۃ الاصلاح

کو بھی عزت بخشی۔ مدرسہ تعطیل کلاں کے سلسلہ میں بند تھا، اساتذہ اور طلبہ موجود نہ تھے صرف چند اراکین، بعض اساتذہ اور اطراف کی بستیوں کے کچھ ہمدردان مدرسہ آپ کے خیر مقدم میں شریک ہوسکے۔ مدرسہ کی روایات کے مطابق خیر مقدم نہایت سادہ طور پر ہوا، چند لفظوں میں مدرسہ کے اغراض و مقاصد اور اسکے کاموں کا نقشہ پیش کر دیا گیا۔ موصوف نے اسکو نہایت پسند فرمایا۔ ان کی تقریر کا ایک ایک لفظ جوش اور اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند منٹوں میں انھوں نے مدرسہ کے مختلف گوشوں اور شعبوں پر بھی ایک نگاہ ڈالی، طلبہ موصوف کو اپنے دار المطالعہ میں بھی لے گئے اور معائنہ کا رجسٹر دستخط کے لئے پیش کیا، موصوف نے یہ دو شعر لکھے اور فرمایا یہ میرے تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔

جلوۂ یار بے نقاب رہا نگہ شوق کو خبر نہ ہوئی
سر کہ جانے کا غم نہیں آزاد فکر درمان درد سر نہ ہوئی

عام لوگ جو اس سادہ تقریب میں موجود تھے آنریبل وزیر تعلیم کی سادگی اور سادگی پسندی سے نہایت متاثر ہوئے۔ ارباب ذوق نے ان کی فصیح و بلیغ تقریر سے مزے لئے لیکن سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز ان کا وہ تاثر تھا جو ان کے لفظ لفظ سے ٹپکتا تھا اور کون جانتا ہے کہ اس ویرانہ میں کیا جاذبیت ہے جو دلوں کو کھینچتی ہے!

دفتر کی طرف سے بعض ضروری اطلاعات!

یہ الاصلاح کی زندگی کے دوسرے سال کا آخری پرچہ ہے۔ جنوری سے نیا سال شروع ہوگا، دفتر نے خواہش کی ہے کہ اس موقع پر چند امور کی اطلاع الاصلاح کے قارئین اور معاونین کو پہنچا دی جائے۔

الاصلاح کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ دو سال تک اس کو تجربہ کے طور پر چلایا جائے گا۔ اگر اس مدت میں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تو جاری رہیگا ورنہ بند کر دیا جائے گا۔ آج یہ تجربہ کی مدت ختم ہوگئی اور افسوس ہے کہ اس میں الاصلاح کی مالی حالت ایسی نہ ہوسکی کہ وہ اپنی کفالت خود کر سکے۔ گذشتہ سال میں ۷۰۰ روپئے اسکی آمدنی سے زیادہ خرچ ہوئے، کم و بیش یہی صورت حال اس سال بھی ہے، حالانکہ الاصلاح پر بجز کاغذ اور سیاہی

کی قیمت کے اور کوئی بار نہیں ہے۔

اس حالت کے باوجود طے کیا گیا ہے کہ الاصلاح جاری رہے اور کم سے کم ایک سال اور تجربہ کیا جائے۔ الاصلاح کے پڑھنے والوں اور ہمدردوں سے امید ہے کہ وہ تجربہ کے اس نئے سال میں ہم کو تنہا نہ چھوڑیں گے۔

دوسرا قابل ذکر امر یہ ہے کہ ۳۶ء میں جو حضرات عہ عنایت فرما کر دائرہ کے معاونین میں شامل ہوئے تھے، دائرہ کی مطبوعات کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ہم نے انکی مدت اعانت ۳۷ء تک وسیع کر دی تھی اور ان دونوں سالوں میں انکی خدمت میں الاصلاح برابر ہدیۃً حاضر ہوتا رہا ہے اور دائرہ کی دوسری مطبوعات بھی پیش کی گئی ہیں۔ اب ۳۷ء کے اختتام پر انکی مدت اعانت ختم ہو رہی ہے اگر وہ اپنے سلسلۂ اعانت کو جاری رکھنا چاہیں تو جنوری ۳۸ء میں عہ ارسال فرما کر ممنون فرمائیں ورنہ بذریعہ ایک کارڈ مطلع فرمائیں کہ جنوری کا پرچہ ان کی خدمت میں عام خریداروں کی طرح للعہ ہی وی پی کر دیا جائے۔ اگر کسی وجہ سے یہ بھی منظور نہ ہو تو بھی ایک کارڈ لکھ کر اپنے ارادہ سے خبردار کر دیں کہ دفتر کو وی پی کے مصارف نہ برداشت کرنا پڑیں۔

جن معاونین نے ۳۸ء میں رقوم اعانت بھیجی ہیں۔ ان سے کوئی طلب و تقاضا نہیں ہے، الاصلاح اور دوسری مطبوعات ۳۸ء میں بھی انکی خدمت میں ہدیۃً پہنچینگی اور اگر انھوں نے ازراہ فیاضی و علم دوستی اس سال بھی اپنی رقمیں بھیجدیں تو شکریہ کے ساتھ قبول کر لی جائیں گی۔

عام خریداروں میں سے جن حضرات کی مدت خریداری دسمبر میں ختم ہو رہی ہے براہ نوازش وہ جنوری میں نئے سال کا چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں اور کسی وجہ سے خریداری منظور نہ ہو تو دفتر کو مطلع کر دیں کہ وی پی کا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ وی پی جاتے ہیں اور کئی آنے پیسوں کا نقصان کر کے واپس آتے ہیں تو بڑا درد ہوتا ہے اور اردو رسائل و اخبارات کی حالت ابھی ایسی نہیں ہے کہ کوئی خوددارانہ طریق کار اختیار کیا جائے۔

یہ اطلاعات و ہدایات دفتر کی طرف سے ہیں، جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں، چند لفظوں میں اپنا درد دل اور اپنی پشیمانیوں کا حال بھی لکھدیں لیکن معلوم ہے کہ یہ داستان چھڑ گئی تو چند لفظوں میں ختم نہ ہوگی اسلئے بہتر ہے کہ یہ ملتوی ہی رہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے

کہ جو مقاصد پیشِ نظر ہیں جلد سے جلد ان تک پہنچنے کی راہ باز ہو۔

چند قابلِ غور باتیں

جب کسی قوم پر ذہنی انحطاط پوری طرح چھا جاتا ہے تو وہ لفظوں کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہتی ہے کسی بات پر سکون کے ساتھ غور نہیں کرتی بدقسمتی سے آجکل یہی حال ہم مسلمانوں کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہ علامت موت کی ہے یا زندگی کی۔

اسلام خطرہ میں ہے تو مسلمانوں کی تہذیب خطرہ میں ہے، زبان خطرہ میں ہے تو تہذیب خطرہ میں ہے، یہ سب خطرات صحیح اور تمام اندیشے بجا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تمام خطرات صرف کانگریس ہی کی طرف سے ہیں یا اس انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے بھی جو ہمارے دین و دنیا دونوں کی مالک ہو کر ہمارے جسم و روح کو ہلاک کر رہی ہے؟

زبان سے تو لوگ اس کا جواب یہی دیتے ہیں کہ دونوں طرف سے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کانگریس کے خطرات دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ دوسری طرف کے خطرات سے بالکل ذہول ہو رہا ہے حالانکہ ایک کے خطرات عملاً موجود ہیں اور دوسرے کے آئندہ پیش آنے والے ہیں۔

ہم نے "ذہول" کا لفظ محض تبعاً برائے احتیاط استعمال کیا ہے ورنہ ان دوستوں کی منطق کی اگر پوری تحلیل کیجئے تو صاف کھل جائے کہ یہ لوگ انگریزی گورنمنٹ کے زیر سایہ اپنے مذہب اور تمدن کو بالکل محفوظ سمجھتے ہیں چنانچہ ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم کو پہلے مسلمانوں کو منظم و مضبوط کرنا چاہئے اور جب وہ پوری طرح طاقتور اور مضبوط ہو جائیں (معنوی اور مادی دونوں حیثیتوں سے) تب کانگریس کے ساتھ اتحادِ عمل کرنا چاہئے کیونکہ جب تک مسلمان مضبوط نہ ہوں اس وقت تک کانگریس مسلمانوں کے مطالبات کے سامنے سر نہ جھکائے گی۔

بظاہر تو بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن لفظوں کا یہ مقدس لبادہ ذرا ہٹا کر اندرونی اور اصل حقیقت کی تصویر دیکھئے کہ وہ کیا ہے؟ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اگر ہندوؤں کو آزادی نصیب ہو گئی تو وہ مجبور ہو کر ہمارے مطالبات مانیں گے اور ہم کو اپنے ساتھ لیں گے ورنہ ہم اپنی مذہبی و مادی توانائی کے تمام بل بوتے سے انگریزی حکومت کی مدد کریں گے، اس کے زیر سایہ نہ ہمارے مذہب کو کوئی خطرہ ہے۔ نہ تہذیب و تمدن کو!

آزادی کی ضرورت ہندوؤں کو ہے، اگر وہ سچ مچ آزادی کے طالب ہوں گے تو ہمارے ساتھ سودا چکائیں گے، ورنہ ہمارا کیا گیا ہے اور کیا جائے گا کہ ہم خواہ مخواہ یہ درد سر خریدیں!

ممکن ہے ہمارے یہ احباب جلدی میں بول اٹھیں کہ نہیں، ہم اپنے ان دونوں دشمنوں سے لڑینگے، اور دونوں کو شکست دیکر آزادی حاصل کریں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواب محض مضحکہ ہے۔ اس وقت دو ہی صورتیں ہونگی یا تو آپ برٹش حکومت کے ساتھ تعاون کریں اور کچھ مدت تک اسکے آلۂ کار رہکر پھر کس مپرسی کی حالت اختیار کریں یا کانگریس کے ساتھ اتحاد عمل کریں اور ایسی حالت میں کہ آپکے لئے اسکے وسیع نظام میں سانس لینے کی بھی گنجائش نہ رہے۔ یہ اس لئے کہ آج جبکہ کانگریس کے ارادے اور خیالات اور اس کا ظاہری اور باطنی نظام سانچہ میں ڈھل رہا ہے تو آپ اس سے الگ ہیں، اس کے ڈھالنے میں شریک نہیں ہیں اور نہ اسکے اجزائے ترکیبی میں اپنے عزائم و تخیلات کا کوئی عنصر ملا رہے ہیں، حالانکہ آج اس کا موقع ہے، تو کل جب اس کا تمام تخیل ڈھل ڈھلا کر تیار ہوجائے گا تو آپ اس میں شریک ہو کر بجز اسکے کہ آلۂ کار بنیں اور کیا کریں گے، مانا کہ آپ اس وقت بہت مضبوط ہوجائیں گے، لیکن یہ بھی یاد رکھئے کہ کانگریس اس وقت کمزور نہیں ہوجائے گی ؟

ایک چیز اور بھی یاد رکھئے کہ کانگریس جس روش پر جا رہی ہے یقیناً وہی ہے جس کا اعلان کانگریس کے موجودہ صدر بار بار کر رہے ہیں۔ اس وقت ہم اس روش کی اچھائی اور برائی پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کہتے ہیں یہ روش غلط ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بلاشبہ یہ روش غلط ہے، لیکن اس غلطی کا علاج کیسے ممکن ہے۔ اس طرح کہ مسلمان اس سے الگ رہیں یا اس طرح کہ اس میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہو کر ان رایوں کو قوت پہنچائیں جو اس روش کی مخالف ہیں۔ اور الحمدللہ آج بھی کافی طاقتور ہیں ؟ ہمارے نزدیک ممکن شکل صرف دوسری ہے۔ اگر کانگریس کو آپنے چھوڑ دیا تو ایک عظیم الشان اور طاقتور ادارہ، جو بقول آپکے سوشلزم

اور کمیونزم کی تمام روایتوں کا حامل ہوگا۔ آپ کے ہر شہر، ہر قریہ، ہر ٹولہ، ہر محلہ میں آپ کی بیخکنی کے لئے آپکے ساتھ ساتھ ہوگا۔ اور یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ انگریزی راج نے اسکے لئے زمین بالکل ہموار کر دی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ، دیہاتوں کے کسان، ملوں کے مزدور، عام فاقہ کش مسلمان، سب اسکے سیلاب میں بہ جائینگے۔ اور "روٹی" جس کو آپ اس درجہ حقیر چیز خیال کرتے ہیں، اس کا اعجاز آپ دیکھیںگے کہ کس طرح لوں اور دماغوں پر اس کی ہیبت چھا جاتی ہے۔ روٹی بےشبہ حقیر چیز ہو لیکن اس کی حقارت کا وعظ کہنا انہی کو زیب دیتا ہے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ وعظ کہیں۔ اگر ہماری مسلم لیگ کے ارکان یزیدی دسترخوان پر بیٹھ کر یہ بایزیدی وعظ کہیں گے تو یہ فاقہ کش عوام ہنسیں گے اور پھر ان کی ہنسی کا انجام ایسا دردناک ہوگا کہ ایک دن ہم کو، آپ کو، اور ان سب کو رونا پڑے گا۔

روٹی کی بات آگئی ہے تو ایک بات اور سن لیجئے۔ گذشتہ صدی کے آخری اور موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں کو یاد کیجئے۔ تقریباً تمام علمائے ہندوستان نے فتویٰ دیا کہ انگریزی مدارس میں انگریزی علوم وفنون کا پڑھنا ناجائز ہے لیکن اکیلے سرسید نے (خدا ان کو غریق رحمت کرے) روٹی کے نام سے ایسی جادو کی چھڑی گھمائی کہ تمام مسلمان مجبور ہو گئے اور آج "کلرکی کی ریس" میں پڑوسی قوموں کے دوش بدوش ہیں اور ہماری اسلامی تہذیب اور روایات سرگرم ریاں! اور سرسید کا یہ جادو اچھے خاصے کھاتے پیتے مسلمانوں پر چل گیا تو کانگریس کا جادو بیکار نوجوانوں اور غریب مسلمانوں پر کیوں بےاثر رہے گا! غرض ایک طرف انگریزی راج کا تانا ورخت ہے جس کا پتہ پتہ اسلامی تہذیب کے لئے زہرناک اور دوسری طرف کانگریس کا اقتدار جو بقول آپکے اسلام کے خلاف منظم سازش، تو ان دونوں کے بیچ میں آپ کی تہذیب کا "نازک پودا" کیسے پروان چڑھے گا۔ آپ کہتے ہیں "پروان چڑھے گا" آپکے منہ میں گھی شکر! لیکن ہماری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اگر اسکے لئے کسی طرف جگہ نہ پیدا کی گئی تو اندیشہ ہے کہ یہ دوطرفہ مار سے فنا ہو جائے گا اور اگر آپ اسکے ابھرنے کے لئے کوئی جگہ پیدا

کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی شکل ہے۔ کوشش کیجئے کہ ایک طرف انگریزی راج کا تمادر خست منمحل ہو اور دوسری طرف کانگریس کا اقتدار ہمارے لئے زہرناک نہ ہونے پائے۔

ہمارا خیال ہے کہ آج جو لوگ کانگریس کے ساتھ جانا چاہتے ہیں ان کے سامنے مستقبل کے یہی خطرات ہیں۔

بعض غلط خیالات کا جو پرتو آج آپ بعض مسلمان نوجوانوں پر دیکھتے ہیں یہ آپ ہی کی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ وقت کے حالات سے بے خبر ہیں۔ سمندر طغیانی پر ہے تیز و تند ہوائیں چل رہی ہیں اور کاؤان ملاح سو رہے ہیں۔ مجبور ہو کر نوجوانوں نے ڈانڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اب چاہے کشتی غرق ہو یا ساحل پر پہنچے، ان کا اضطراب قابل رحم ہے۔ آپ کو سمت ساحل معلوم ہے اور طوفانی ہواؤں کے مقابلہ کی توانا بازو رکھتے ہیں تو اٹھئے اور بیڑا پار لگائیے۔ ورنہ ان کی غلط روی پر ملامت کا آپ کو کیا حق ہے؟

تفسیر سورۂ فیل

تفسیر سورۂ فیل کا اردو ترجمہ چھپ کر شایع ہو گیا۔ نہایت معرکہ آرا مباحث ہیں، قرآن کی بہت سی مشکلات اس سے حل ہو جائیں گی۔ قیمت ۸ ر ہے عنقریب معاونین کی خدمت میں ارسال ہو گی۔ جلد بندھنے کی دیر ہے۔ سورہ کافرون اور والعصر بھی بہت جلد شایع ہو جائیں گی۔ ان شاء اللہ دو ہفتہ کے اندر اندر۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ عبس

(۴)

تالیف استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ امین احسن اصلاحی

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ (۳۳) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ (۳۴) وَأُمِّهِ وَ
أَبِيهِ (۳۵) وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ (۳۶) لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ
يُغْنِيهِ (۳۷) وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُسْفِرَةٌ (۳۸) ضَاحِكَةٌ مُسْتَبْشِرَةٌ (۳۹) وَ
وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (۴۰) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۴۱) أُولَئِكَ هُمُ
الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۴۲)

پھر جب وہ سخت آواز آئے گی (۳۳) جس دن کہ آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا (۳۴) اور اپنے ماں اور باپ سے (۳۵) اور اپنی بیوی اور بیٹے سے (۳۶) اس روز ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی (۳۷) بہت سے چہرے، اس روز روشن ہونگے (۳۸) ہنستے اور خوش ہوتے (۳۹) اور بہت سے چہروں پر اس روز خاک اڑتی ہوگی (۴۰) (۴۱) یہی ہونگے کافر اور بدکار لوگ (۴۲)

(۱۳) الفاظ اور جملوں کی تاویل

از

(آیت ۳۳ تا ۴۲)

[الصّاخۃ] عربی میں "صخ سمعہ" کے معنی ہوں گے "اصمہ" یعنی اس کے [illegible] بہرے [illegible]
پس قیامت کے لئے صاخۃ (بہری کردینے والی آواز) کا لفظ اس کی دو مخصوص [illegible] اشارہ [illegible]
ایک تو اس کی اس اولین سخت و شدید کڑک کی طرف جو کانوں کو بہرا کردینے والی ہوگی ... [illegible]
کی طرف جو ہر شخص کو اس کے نفس کے سوا ہر چیز سے غافل کردیگی۔ قیامت کی اس حالت کی [illegible] بعض آیات میں [illegible] گئی
ہے۔ یوم ترونہا تذہل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملہا وتری [illegible]
عربی زبان میں جب کسی بڑی مصیبت کی شدت بیان کرنا چاہیں گے تو کہیں گے کہ "لاتنیا [illegible] ولید ها [illegible]
مائیں اپنے بچوں کو بھول گئیں پس صاخۃ کے لفظ میں قیامت کی یہ دونوں حالتیں بیان ہوئی ہیں۔ [illegible] لفظ پہلے
مفہوم میں بالکل واضح تھا اس لئے قرآن نے اس کی کوئی تفصیل نہیں کی لیکن دوسرے مفہوم کی طرف [illegible] اشارہ
کے بے تکلف ذہن نہیں منتقل ہوسکتا تھا۔ اس لئے قرآن نے یوم یفر المرء الآیۃ سے لیکر لکل [illegible]
یغنیہ تک اس کی تشریح کی۔

[یفر] یہ قیامت کی ہولناکی کے لئے ایک پر کنایہ طریق تعبیر ہے۔ یہ دن ایسا ہوگا [illegible]
ہوگی۔ دوسروں کی حالت کی طرف توجہ کرنے کے لئے اس کو فرصت نہ ملے گی۔ اس کے بعد جملہ [illegible] کی [illegible]
ہوگئی ہے۔

[مسفرۃ] یہ "اسفر الصبح" سے لیا گیا ہے یعنی روشن، تابناک۔ مسرت کی [illegible]
چہروں پر نمایاں ہوگی۔ یہ لفظ اس کو ظاہر کررہا ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہوگئی ہے۔

[ضاحکۃ] یہ مسرت سے کنایہ ہے۔ چنانچہ بعد کے لفظ نے اس کو کھول دیا۔ اہل ایمان کو امن و [illegible]

اور قرب و وصال کی دولت پاکر جو بشاشت ہوگی اس کو ضاحکۃ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

[مستبشرۃ] اس لفظ نے معاملہ کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو اہل جنت کیلئے تیار ہونگی

ان کو دیکھ کر جو بشاشت یقیناً ان کے چہروں پر نمایاں ہوگی، یہ لفظ اس کو ظاہر کر رہا ہے۔

[علیہا غبرۃ] یہ مسفرۃ کا مقابل اور ذلت و غم سے کنایہ ہے۔ یہ کنایہ قرآن مجید میں دوسرے

مقام پر موجود ہے۔ ولا یرھق وجوھھم قتر ولا ذلۃ۔ امراء القیس نے بھی اس کنایہ کو استعمال کیا ہے

علیہ القتام سئی الظن والبال

[ترھقہا قترۃ] ان پر سیاہی چھا رہی ہوگی۔۔۔ یہ لفظ غبرۃ سے زیادہ سخت ہے یعنی پہلے ان پر

خاک اڑ رہی ہوگی۔ پھر سیاہی چھا جائے گی۔ علیہا غبرۃ ترھقہا قترۃ ٹھیک ٹھیک مسفرۃ ضاحکۃ

مستبشرۃ کا مقابل ہے۔ اس تقابل کی مثال دوسری جگہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ یوم تبیض وجوہ

وتسود وجوہ۔

[الکفرۃ الفجرۃ] اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے منکر، اس کی نعمتوں کے ناشکرگذار، اس کے حکموں سے

سرتابی کرنے والے۔۔۔ اس سے اوپر انسان کے کفر و ناسپاسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، ان دو

لفظوں کے اندر اسی تفصیل کو سمیٹ دیا ہے۔

(۱۴) ایک لطیف نکتہ

قرآن مجید جن چیزوں کو بیان کرتا ہے ان کی باہمی ترتیب میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے ہم یہاں

اس طرح کے ایک حکیمانہ نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس سورہ میں غور کرو گے تو یہ بات نظر آئے گی کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی صفات خیر و شر کو مقابلہ

میں پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صفات خیر میں تزکی، تذکر اور خشیت کو بیان فرمایا ہے۔

اور صفات شر میں ت استغنا، کفر، اور فجور کو۔ پہلے تزکی، تذکر، خشیت، کی تینوں حالتوں پر غور کرو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اوپر سے نیچے اترنے والی ترتیب ملحوظ ہے۔ تزکی، خشیۃ کی آخری منزل ہے، اسکو پہلے بیان فرمایا ہے اور خشیت کو جو اس راہ کا نقطۂ آغاز ہے سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان وتقوی کا سفر ایک متعین منزل مقصود کی طرف ہوتا ہے اس لئے سفر کے آغاز ہی میں منزل مقصود ان کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ لنگر اٹھانے سے پہلے ساحل کی سمت ٹھہرا لیتے ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ قرآن مجید بیان میں ایسی ترتیب اختیار فرمائے جو اہل ایمان وتقوی کی اس ذہنی حالت کو بے نقاب کردے۔

برعکس اس کے صفات شر کے بیان میں ترتیب بالکل دوسری ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر چڑھنے والی ترتیب ہے۔ یعنی استغناء شقاوت کا پہلا زینہ ہے۔ اس کو پہلے بیان کیا اور فجور بالکل آخری حالت ہے اس کو سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کفر وفسق اپنی آخری منزل سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نفس کے اشارہ سے قدم اٹھا دیتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ بالآخر آہستہ آہستہ اس قعر ہلاکت تک پہنچ جاتے ہیں جو ایسے لوگوں کے لئے مقدر ہے۔

یہ نکتہ تھا جس کی وجہ سے دونوں ترتیبوں میں اختلاف ہوا۔ اب دونوں ترتیبوں کے تدریجی لزوم پر غور کرو پہلے خشیت ہے اس لئے کہ یہ تمام فوز وفلاح کی اصل ہے۔ یہ آدمی کو تذکر پر ابھارتی ہے اور تذکر تزکیہ کی طرف رہبری کرتا ہے جو اصل مقصود ہے۔ دوسری میں استغنا سب سے مقدم ہے کیونکہ یہ تمام فساد کی جڑ ہے۔ یہ انکار حق پر آمادہ کرتا ہے اور انکار حق فجور کا دروازہ ہے۔

ہم نے جو ترتیب بیان کی ہے، اگر ہم چاہیں تو اس پر قرآن مجید سے بہت سی مثالیں پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن ہماری اس کتاب میں اس کے شواہد ایک سے زیادہ مقامات میں گذر چکے ہیں۔ اہل نظر خود بخود اس پر پوری طرح مطمئن ہوجائیں گے۔

۱۵- پوری سورہ کے نظم پر ایک اجمالی نظر

پچھلے مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس سورہ کے ابتدائی حصہ میں کافروں اور فاسقوں پر بطریق تعریض تشنیع کی گئی ہے تاکہ اُن کی غفلت کی نیند ٹوٹے اور وہ آنکھیں کھولیں۔ یہ مضمون ابتدائی دس آیتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی عظمت و منزلت کا بیان شروع ہوتا ہے کہ وہ پاک اور بلند ہے۔ عزت والے فرشتوں کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں پر فضل و احسان فرمانے کے لئے اس کو اتارا ہے پس وہی لوگ اس کے مستحق ہو سکتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانیں۔ ان ناقدروں اور منکروں کے لئے یہ نعمت گرانمایہ نہیں ہے۔ یہ مضمون سولہویں آیت تک آتا ہے۔ اس کے بعد دو فقرے[۱] ہیں۔ ان میں اپنی نعمتوں اور قدرت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جس سے انسان کا ضعف و فقر واضح ہو تاکہ اُس کے کفر و نافرمانی کی شناعت پوری طرح بے نقاب ہو جائے۔ پہلے فقرے میں ان نعمتوں کو بیان فرمایا ہے جو انسان اپنے نفس کے اندر پاتا ہے۔ یہ فقرہ بائیسویں آیت پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے فقرے میں وہ نعمتیں بیان ہوئی ہیں جو اس دنیا میں انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جن پر اس کی زندگی اور بقا کا دار مدار ہے۔ یہ فقرہ بتیسویں آیت تک آتا ہے۔

پہلے فقرے کو قتل الانسان ما اکفرہ سے شروع کیا اور دوسرے کو کلا لما یقض ما امرہ سے۔ ان دونوں کو ترتیب پیش نظر رکھو تو خلاصہ مطلب یہ نکلے گا کہ اس انسان کے کفر کا معاملہ کتنا عجیب ہے جس کا وجود خود، اس کی بندگی، اس کے ضعف و عجز، اس کے فقر و احتیاج اور پھر بعث و قیامت اور حساب و جزاء پر سب سے بڑی حجت ہے اور اس کی ناسپاسی اور بدعملی کسقدر قابل ملامت ہے جس کے وجود اور زندگی کا ایک ایک ریشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نوازشوں سے پل رہا ہے اور وہ ان تمام باتوں کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے پس کفر اور جحود یعنی ناسپاسی اور انکار دونوں کا ذکر یہاں ایک ساتھ بالکل اس اصول کے مطابق ہوا ہے جس

---

[۱] یہ لفظ پیراگراف کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ مصنفؒ نے اسکے لئے جملہ کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی چند آیتوں کا مجموعہ۔ (مترجم)

اصول کے مطابق ایمان اور عمل صالح کا ذکر ایک ساتھ ہوتا ہے۔ یہ بالکل عقلی ترتیب ہے، کیونکہ اعمال سرتا سر عقائد اور اخلاق کے تابع ہیں۔ قرآن مجید نے اس اصول کی طرف جابجا اشارات کئے ہیں۔

اَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ، فَذٰلِكَ　　　　بھلا دیکھو تو اس کو جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے

الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ　　　　جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

یعنی یتیم کو دھکے دینے کی شقاوت اس میں اس لئے پیدا ہوگئی ہے کہ وہ جزاء کے دن کا منکر ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یتیم کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا۔ قرآن مجید میں مختلف پیرایوں سے یہ اصول بار بار بیان ہوا ہے۔

اب ان دونوں فقروں کے خلاصہ مفہوم کو پھر ایک مرتبہ سمجھ لو، فرمایا کہ انسان کا معاملہ عجیب ہے، وہ اپنے ظاہر و باطن کو خدا کی بے شمار نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ پھر بھی نہایت بے پروائی کے ساتھ، اس بات کا منکر ہے کہ وہ ایک دن اپنے کاموں کی جواب دہی کیلئے اٹھایا جائے گا! یہ کفرِ ناسپاسی کی ایک بالکل ہی انوکھی اور حیرت میں ڈال دینے والی حالت ہے! آخر وہ کس چیز کا منکر ہے؟ کیا اس کی ان بے شمار نعمتوں کا جس کی شہادت اس کے رگ و پے کے ریشہ ریشہ کے اندر سے بول رہی ہے؟ کیا اس کی اس اچنبھے میں ڈال دینے والی قدرت کا جس کے عجائب سے اس کائنات کا کوئی گوشہ خالی نہیں؟ پھر جب یہ دونوں باتیں موجود ہیں، اور ان میں کسی ایک سے بھی اس کو انکار نہیں تو پھر اس کو بدلہ اور مکافات کے ایک ناگزیر دن سے کیوں انکار ہو! وہ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی نعمتوں اور قدرتوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھائے لیکن ذمہ داری اور مسئولیت کا کوئی بار نہ اٹھائے! اس کی بخششوں کے خوان کرم پر عیش کرے اور پھر اس کے حکموں کو پوری بیدردی کے ساتھ ٹھکرا دے! یہ کفر و جحود کی کیسی عجیب شقاوت ہے جو بدبخت انسان نے اختیار کر لی ہے!!

انسان کی شقاوت کے یہ دونوں گوشے جواب تک تعبیر بیان میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، سورہ کے آخر میں آکر بالکل ایک نقطہ پر سمٹ گئے ہیں۔ فرمایا اولٰئک ھم الکفرۃ الفجرۃ۔

انسان کے موجودہ فقر و احتیاج، اور اس کے اوپر اپنے افضال و عنایات اور اپنی قدرت کو بیان کرنے کے بعد اس کے اس فقر و احتیاج کو بیان فرمایا جس سے وہ اس زندگی کے بعد دوچار ہوگا جبکہ موجودہ سر و سامان معیشت کی تمام خوش عیشیں، جو آج غفلت و مدہوشی کا باعث ہیں، ختم ہو چکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ مضمون شروع ہوا اور یہ آیت ۱۳ تک آیا۔ اور جس طرح پہلے فقرہ میں بعث کے ذکر کے ساتھ ایسی چیزیں بیان ہوئیں جو بعث پر دلیل تھیں اسی طرح قیامت کے ذکر کے ساتھ ایسے امور کا بیان ہوا جو قیامت پر دلیل ہیں۔ چنانچہ انسان کی خلقت کے ذکر کے بعد جس طرح فرمایا فاذا شاء انشرہ اسی طرح اس کے رزق کے بیان کے بعد فرمایا فاذا جاءت الصاخۃ کیونکہ انسان جب اپنی خلقت کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ جو خدا اس کو پیدا کر سکتا ہے وہ اس کو دوبارہ اٹھا بھی سکتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے رب کے انعامات کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس میں اس امر کا یقین تازہ ہوگا کہ اس کے سامنے مسئولیت اور بازپرس کا بھی ایک دن آئے گا اور اسے اپنے مولیٰ اور پروردگار کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ سورہ مرسلات میں اس اسلوب کی نہایت عمدہ مثال موجود ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ فَجَعَلْنٰهُ	کیا ہم نے تم کو ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا؟
فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ، فَقَدَرْنَا	اور پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا ایک مقررہ
فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ، وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ	زمانہ تک۔ ہم نے مقرر کیا، کیا خوب ہم مقرر کرتے
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ، اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا	ہیں۔ آج منکروں کی خرابی ہے (یعنی بعث کے منکروں کی)
اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ	کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا زندوں اور مردوں کو
شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا	اور اس میں گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے اور
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ	تمہیں خوشگوار پانی پلایا آج منکروں کی خرابی ہے۔
....	(یعنی روز جزا کے منکروں کی)

دوسرے مقامات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔

انسان کے فقر و احتیاج اور اس کے کفر و فجر اور استغنا کی شناعت بیان کرنے کے بعد دونوں فریق یعنی ارباب خشیت و تقویٰ اور اہل کفر و فجر کے مآل اور انجام کے بیان پر سورہ کو ختم کیا اور انہی کے بیان سے سورہ شروع ہوئی تھی۔ یہ مضمون آیت ۲۴ پر ختم ہوتا ہے جو سورہ کی آخری آیت ہے۔

اب پوری سورہ پر غور کر کے دیکھو کہ چند آیتوں کے اندر انسان کی بے پروائی اور کفر و انکار کی حالت اور اس کے ضعف و احتیاج کی بے بسی اور اللہ تعالیٰ کے افضال و عنایات کی داستان کس خوبی و بلاغت اور اعجاز کے ساتھ بیان ہو گئی ہے۔ اور کس طرح یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ اور اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے خود بخود یہ مترشح ہو رہا ہے کہ اس میں آنحضرت صلعم کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ آپ ان بے پروا اشقیا کو چھوڑ کر صرف ان لوگوں کو اپنی تمام توجہ اور شفقت کا مرکز بنائیں جو اس نعمت عظمیٰ کے مستحق ہیں۔

ھذا آخر ما تیسر لنا ذکرہ فی ھذا المقام والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

تفسیر سورۃ الفیل (اردو)

مذاکرہ

(۳)

وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ

از مولوی بدر الدین صاحب اصلاحی

قرآن مجید نے جس آیت پاک میں یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ ذیل ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (۳ : ۷)	وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی، اس کتاب میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے، اور وہی تمام کتاب کی اصل ہے (اسکے مقابل میں) دوسری قسم متشابہات کی ہے، جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ (محکم آیتوں کو چھوڑکر) کتاب کی متشابہ آیتوں ہی کے پیچھے پڑتے ہیں اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں، اور انکی حقیقت کو معلوم کریں، حالانکہ ان کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا، جو لوگ علم میں پکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ تمام آیتیں ہمارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ہیں، اور نصیحت تو بس عقلمند ہی حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں:۔

(۱) قرآن مجید میں دو قسم کی آیتیں ہیں، محکمات اور متشابہات۔ جو آیتیں محکمات ہیں وہ ام الکتاب ہیں،

اور جو آیتیں متشابہات ہیں وہ کج دلوں کے لئے مظنۂ فتنہ ہیں۔

(۲) ان آیتوں کو ماننے والے بھی دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو راسخین ہیں اور دوسرے زائغین۔ جو راسخین ہیں وہ محکمات اور متشابہات سب پر ایمان رکھتے ہیں اور جو زائغین ہیں وہ صرف متشابہات ہی کے پیچھے پڑتے ہیں۔

(۳) متشابہات کی تاویل خدا کے سوا کسی اور کو نہیں معلوم۔

ان تمام باتوں کو سمجھنے کیلئے، چند باتوں کو پہلے جان لینا ضروری ہے۔

(۱) محکم، متشابہ اور تاویل سے کیا مراد ہے؟

محکمات سے مراد وہ آیتیں ہیں، جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں، اور جن کی ہمیشہ سے تمام آسمانی صحیفے تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔ ان میں کسی پہلو سے ابہام کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ دوپہر کے آفتاب کے مانند روشن اور ریاضی کے اصولوں کی طرح بالکل قطعی ہوتی ہیں۔

یہ آیتیں چونکہ انسانی دلوں میں، اس طرح پر راسخ ہوتی ہیں کہ شبہات کی طوفانی آندھیاں ان کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی ہیں اس لئے ان کو "محکم" کہا گیا۔ اور اسی وجہ سے ان آیتوں کو ام الکتاب بھی قرار دیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کتاب کا مرجع اور مآل یہی آیتیں ہیں۔

متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں، جن کا بقدر ضرورت مفہوم تو واضح ہو، لیکن ان کی اصلی حقیقت کا احاطہ انسانی عقلوں کی گرفت سے باہر ہو۔ چونکہ یہ آیتیں بہت ہی عسیر الفہم اور نہایت ہی بلند پایہ حقائق کی حامل ہوتی ہیں، جن کو اس دنیا میں ہم کسی طرح نہیں سمجھ سکتے اس لئے ان آیتوں کو "متشابہ" کہا گیا۔ اسی وجہ سے وہ ارباب زیغ کے لئے مظنۂ فتنہ بھی ہو سکتی ہے۔

تاویل سے مراد، آیات متشابہات کی وہ اصلی صورتیں ہیں، جو عالم حقیقت میں مشاہدہ کی آنکھوں سے نظر آ سکتی ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح یوسف علیہ السلام نے خواب میں سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کے

ده کو عالم بیداری میں باپ، ماں اور گیارہ بھائیوں کے سجدہ کی حقیقی صورت میں دیکھا، اور فرمایا:-

يَاأَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ — والد بزرگوار! جو خواب میں نے پہلے دیکھا تھا یہ میرے

قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا (۱۲ .) — اسی خواب کی تاویل ہے جسکو میرے رب نے سچ کر دکھایا۔

قرآن مجید نے محکم اور متشابہ کو ایک اور معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ محکم سے مراد وہ چیز بھی ہے جو بہت ہی

مع اور نہایت ہی مختصر ہو۔ اس کے مقابل مفہوم کو قرآن مجید نے "مفصل" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ مثلاً

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ — یہ ایک کتاب ہے جسکی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر حکیم و

مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ( ) — خبیر خدا کی طرف سے انکی تفصیل کی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے شروع میں بہت ہی جامع اور نہایت ہی مختصر کلیات نازل فرمائیں اور پھر انہی مختصر او

جامع کلیات کو پھیلا کر بیان فرمایا۔ قرآن مجید کی مکی اور مدنی سورتوں میں اس انحصار و تفصیل اور محکم اور مفصل

کی حقیقت موجود ہے۔

اور متشابہ ان چیزوں کو بھی کہتے ہیں جو باہم ہم رنگ ہوں۔ اور ان میں پوری یکجہتی اور توافق ہو۔

اس اعتبار سے پورا قرآن مجید متشابہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کی صفت میں بیان فرمایا ہے۔

اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ — اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام کو ایک ایسی کتاب میں

كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (۳۹.۲۳) — اتارا جو متشابہ و مثانی ہے۔

اس تشابہ کے متعلق چونکہ محترم مستفسر کا ایک مستقل سوال ہے اس لئے یہ بحث خدا نے چاہا تو تفصیل کے

ساتھ اگلے نمبر میں آئے گی۔

۲- یہ جو کہا گیا ہے کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیتیں ہیں، اس کا کیا منشاء ہے؟ اس کا یہ منشاء

نہیں ہے کہ پورے قرآن میں بس یہی دو قسم کی — محکم اور متشابہ — آیتیں ہیں ان کے سوا کوئی اور تیسری قسم

نہیں ہے۔ بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ کچھ آیتیں محکمات ہیں اور انہی کے مقابل میں کچھ آیتیں متشابہات ہیں۔ کیونکہ

قرآن مجید نے اس موقعہ پر جو اسلوب بیان اختیار فرمایا ہے وہ حصر کا اسلوب نہیں ہے۔ بلکہ دو متقابل چیزوں کے بیان کا اسلوب ہے۔ جیسا کہ سورہ فاطر میں آیا ہے۔ ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود (.)

غور کیجئے اس موقعہ پر حصر کا کوئی قرینہ ہے؟

پھر قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ایسی بھی ہیں جو نہ تو ام الکتاب کے زمرہ میں آسکتی ہیں نہ متشابہات کے جیسے قصص وامثال اور اشارات و تلمیحات وغیرہ — پھر ان کو کس زمرہ میں شامل کیا جائے گا۔؟

۳۔ جو آیتیں محکم اور متشابہ ہیں وہ کس اعتبار سے ہیں؟ زبان کے اعتبار سے یا معانی کے اعتبار سے؟ قرآن کی کوئی آیت، زبان کے اعتبار سے تو محکم اور متشابہ ہو نہیں سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بار بار فرمایا ہے کہ قرآن زبان کے اعتبار سے عربی مبین ہے، پس جن آیتوں کو محکم اور متشابہ کہا گیا ہے وہ صرف معانی کے اعتبار سے نہ کہ زبان کے اعتبار سے! باقی تفسیر کی کتابوں میں الفاظ قرآن کی تحقیق و تاویل میں جو شدید اختلافات موجود ہیں، ان کی چند وجوہ ہیں :-

(۱) یا تو لوگوں نے وقت نظر سے کام نہیں لیا۔

(۲) یا کسی غیر صحیح عقیدہ کی عصبیت نے ان کو خواہ مخواہ کیلئے اصل تاویل کو بدلنے پر مجبور کر دیا۔

(۳) یا جس زبان میں قرآن اترا ہے۔ اس زبان کو جیسا جاننا چاہئے جانا نہیں،

یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر قرآن کے بعض الفاظ معمّا و پہیلیاں بن گئے، ورنہ حقیقت میں قرآن کے الفاظ زبان کے اعتبار سے بالکل عربی مبین ہیں۔ اس بارہ میں جب کسی موقعہ پر اشتباہ پیدا ہو تو ہمیشہ ہو ذا زبان کے اصولوں کے مطابق جم کر لفظوں پر غور کرنا چاہئے اور تاویل کے صحیح قاعدے پر ان کی تاویل کرنی چاہئے زبان اور تاویل کا اصول تو کوئی آیت متشابہ نہیں ہے جس میں تعمق ناجائز ہو۔

اس راہ کے تمام رہبر ناقابل اعتماد ہیں۔ اگر کوئی قابل اعتماد اور لائق وثوق رہنما ہے تو صرف اللہ کی

ں میں کسی طرح کا پیچ ہے نہ خم، ہر لفظ بالکل صاف اور واضح ہے، اس میں جتنا ہی تدبر
کی توفیق بخشیوں سے اتنا ہی غوامض حکمت کے رازہائے سربستہ کھلتے ہیں، غلط ہے جن لوگوں
قرآن مجید کی محکم اور متشابہ آیتیں غیر متعین ہیں، اور الفاظ قرآن کی دلالت ناقابل اعتماد ہے!
کتاب کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت، نور، حجت، رحمت اور قانون و شریعت بنا کر اتارا ہو وہ کتاب
اس قدر ساقط الاعتبار کیونکر ہوسکتی ہے کہ اس کے لفظوں کی دلالت بھی قابل اعتماد نہ ہو؟ اور
یہ بھی نہ بتا سکیں کہ کونسی آیت محکم ہے اور کونسی آیت متشابہ!

ہر قسم کے بیرونی افکار اور آراء سے خالی الذہن ہو کر امعان نظر کے ساتھ قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے
م ہوتا ہے کہ یہ آیتیں محکم ہیں اور یہ آیتیں متشابہ ہیں، جو آیتیں متشابہ ہیں وہ امور غیب کی حکایت کیلئے
، اور جو آیتیں محکم ہیں وہ دار العمل کے احکام و فرامین سے تعلق رکھتی ہیں پہلی، ایمانیات سے متعلق
ری عملیات سے؛ اور یہ دونوں باتیں، قرآن کو ذرا غور سے پڑھنے والوں کے نزدیک، بالکل واضح ہیں
تشابہات کے متعلق صاحب لسان العرب لکھتے ہیں۔

تشابہات وہ آیتیں ہیں جو قیامت اور بعث کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں۔"

رآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ	کفار کہتے ہیں، ہم تمہیں ایک ایسے شخص کا پتہ بتائیں جو
عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ	کہتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو پھر نئی خلقت
مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ	میں اٹھائے جاؤ گے۔ اس نے اللہ پر بہتان باندھا ہے یا
أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ	اس کو جنون ہو گیا ہے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَقَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا	اور کہتے ہیں، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈی کا

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَ اٰبَاؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ	رہ جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا
(:)	ہمارے اگلے آباؤ اجداد بھی!

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت وغیرہ ہی کے معاملات تھے جو کافروں اور مشرکوں پر متشابہ ہوگئے تھے

(۴) زیغ اور رسوخ کے کیا معنی ہیں؟

زیغ کہتے ہیں جھکاؤ کو، اس لفظ میں کجی اور سقوط دونوں کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ کوئی قائم چیز جب جھکتی ہے تو ٹیڑھی تو ہو ہی جاتی ہے مگر سقوط سے بھی قریب ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ لفظ، رسوخ کا ضد ہے۔

زیغ درحقیقت اہل کتاب کی مخصوص صفت ہے، یہود کے متعلق خود ان کے صحیفوں اور تاریخوں میں بہت ہی کثرت کے ساتھ ان کی اس صفت کا بیان آیا ہے۔ وہ تو روز اول ہی سے حق سے منحرف تھے۔ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم کے لوگو!
تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ	مجھے کیوں ستاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس
اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ	اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔ پس جب وہ کج ہو گئے، اللہ
قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ	نے ان کے دلوں کو کج کر دیا۔ اور اللہ نافرمانوں کو
الْفٰسِقِيْنَ	ہدایت نہیں دیتا۔

اور نصاریٰ بھی حضرت مسیح کے چلے جانے کے بعد بت پرستوں کے اتباع میں انجیل کی آیات متشابہات کی غلط سلط تاویل کر کے علانیہ حق سے منحرف ہو گئے۔ چنانچہ ان کے اس زیغ نے ان کو کفر کی سرحد میں داخل کر دیا۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ	بے شک وہ لوگ کفر میں پڑے جنھوں نے کہا کہ اللہ
هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ	وہی مسیح بن مریم ہے

ایک دوسری جگہ پر ہے

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ — اور انھوں نے کہا، خدائے رحمٰن بیٹا رکھتا ہے۔ یہ تو تم نے

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝ تَكَادُ — بڑی سخت بات کہی جس سے عجب نہیں آسمان پھٹ پڑے

السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ — اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں

الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ — کہ لوگوں نے خدائے رحمٰن کے لئے بیٹا قرار دیا ہے۔

أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ . . . .

چونکہ یہود کا زیغ علمی تھا۔ اور نصاریٰ کا عملی، اس لئے قرآن مجید کی آیات محکمات کے ترک اور آیات متشابہات کے اتباع میں دونوں گروہوں کے طریقے بھی مختلف تھے۔ یہود نے قرآن کو حق سمجھنے کے باوجود متشابہات قرآن میں شبہے پیدا کرکے فتنہ برپا کرنا چاہا۔ اور نصاریٰ جس طرح متشابہات انجیل وتوراۃ کی حقیقت کے سراغ میں کھوئے گئے۔ اسی طرح متشابہات قرآن کی تاویل کے پھیر میں پڑکر محکمات کو چھوڑ بیٹھے۔ غرض یہ کہ اتباع متشابہات کی زائغانہ حالت دونوں گروہوں میں مشترک تھی۔ اغراض البتہ جداگانہ تھے۔ یہود کے پیش نظر فتنہ تھا اور نصاریٰ کے پیش نظر تاویل وحقیقت کا جاننا۔ لیکن چونکہ یہ احوال ہر امت کے زائغین میں پائے جاتے ہیں اس لئے آیت میں بات عام طور پر کہی گئی۔

اور رسوخ کہتے ہیں استحکام وثبات کو! علم کا رسوخ یہ ہے کہ اوہام وشکوک کے تیز وتند جھونکے بھی اس کو ڈگمگا نہ سکیں۔ جو لوگ علم میں راسخ ہوتے ہیں وہ وہم وعلم اور ظن ویقین میں پوری تمیز رکھتے ہیں، ان کی فطرتیں صحیح ہوتی ہیں۔ ان کے معاملات معتدل ہوتے ہیں، اور ان کے دل اطمینان وسکون کے آخری درجہ پر فائز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ ان کے سامنے جب قرآن کی آیتیں آتی ہیں تو وہ ان میں سے جو باتیں، اس دنیا میں عمل کرنے کے متعلق ہوتی ہیں، ان کو تو عمل کے لئے فوراً اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جو باتیں دوسرے عالم کے علم وعقیدہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان کو اجمالی طور پر حسب تعلیمات کتاب مانتے ہیں اور ان کی تمام تفصیلات کے چکر میں نہیں پڑتے وہ جانتے ہیں کہ دنیا کی زندگی صرف ایک آزمائش گاہ ہے حقیقی زندگی اس کے بعد آنے والی ہے۔ اور اس حقیقی

زندگی کے احوال و واقعات کا پورا پورا علم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قیامت کا صور نہ پھونکا جائے اور ہم اس عالم میں پہنچ جائیں جب تک یہ یوم موعود نہیں آتا، اسوقت تک اس عالم کے امور کی صحیح حقیقتوں کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ ناممکن ہے۔ پس وہ ہر وہم ظنون و اوہام کی لغزشوں سے ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کیا کرتے ہیں کہ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا — مولا! ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد زیغ سے بچا، اور

وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً — ہم پر خصوصی اپنے نزد از فضل سے رحمت نازل فرما۔

۵۔ اس آیت کی قرأت میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور اہلسنت اور بعض معتزلہ مثلاً علی بن الجبائی وغیرہ "لا یعلم تاویلہ الا اللہ" پر وقف کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور "والراسخون فی العلم" کو الگ ... متعلق مانتے ہیں بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کا بھی یہی خیال تھا۔ نیز امام حسن، مالک بن انس، کسائی اور فرا بھی اسی قرأت کے قائل تھے لیکن بعض متکلمین اور علمائے شیعہ وصل کے قائل ہیں اور آیت کو یوں پڑھتے ہیں لا یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم، متشابہات کی تاویل کو اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے اور راسخون فی العلم بھی!

علمائے شیعہ زیادہ تر اس قرأت کے اس لئے قائل ہیں کہ اس کے خلاف میں ان کے ائمہ معصومین کی ہمہ دانی مجروح ہوتی ہے۔ شیعہ غالباً سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں مگر یہ کسی طرح نہیں گوارا کر سکتے کہ اپنے اماموں کو کسی بات میں ادھورا اور ناقص سمجھیں۔ پس جب تک وہ اپنے اماموں کو ہر بات کا بے خطا عالم سمجھتے ہیں اس وقت تک تو اس قرأت کو نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ اسی آیت کو وہ اپنے اس غلط عقیدہ کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ پس ان لوگوں کے متعلق کچھ کہنا محض فضول ہے۔ باقی رہی بعض متکلمین کی یہ موشگافی کہ اگر متشابہات کے معنی "راسخون فی العلم" بھی نہیں جان سکتے ہیں تو پھر ان آیتوں کی تنزیل سے کیا فائدہ۔ تو یہ بات کسی قدر قابل غور ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جس بات کے معنی نہ معلوم ہو سکیں، وہ بات بالکل بے فائدہ ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بہت سی باتیں اتنی اونچی اور بلند ہوتی ہیں کہ ہمارے الفاظ اور جملوں کے اندر نہیں سما سکتیں۔ ان لفظوں کے معانی سب جانتے ہیں، اور یہ معانی ادائے مطالب کیلئے کافی بھی ہوتے ہیں۔ مگر با ایں ہمہ وہ اصل حقیقت نہیں ہوتے ہیں نیز کسی حکایت کے لفظوں کے معانی اور محکی عنہ کی اصل حقیقت میں ایک نازک فرق بھی ہوتا ہے۔ یہی وہ نازک فرق ہے، جس کی طرف لفظاً تاویل کی تشریح میں اشارہ کیا گیا ہے۔ قادر الکلام حکما، اور بلغا، کے کلام میں جو تشبیہیں ملتی ہیں، وہ کیا چیز ہیں؟ بلند تر حقائق کی تصویر، الفاظ کے قالب میں! پس غور کرو! امثال کے لفظوں کے معانی تو سب جانتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنی اپنی فہم کے مطابق ان کے مفہوم کو سمجھتے ہیں لیکن کیا ان معانی کی اصل حقیقت، جو مشاہدہ میں نظر آ سکتی ہے وہ بھی بعینہ وہی چیز ہوتی ہے جو لفظوں سے سمجھ میں آتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور اس کے باوجود امثال کا شمار حکیمانہ کلام میں کیا جاتا ہے، تو پھر ایسا کیوں ہو کہ اگر آیات متشابہات کے لفظوں سے اصل حقیقت کی نگاہ نہ پا سکو تو اسے بے کار اور بے فائدہ ٹھہرا دو؟

قرآن میں ایک موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے منکرین معاد کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے:-

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ	دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہم کو
الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ	تھوڑا سا پانی یا اللہ تعالیٰ نے تم کو جو روزی دیا ہے
أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ ۚ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ	اس میں سے کچھ دیدو۔ جنت والے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے
حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ الَّذِينَ	ان دونوں چیزوں کو کافروں کے لئے روک دیا ہے جنہوں نے
اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا وَغَرَّتْهُمُ	دین کو کھیل و تماشا بنا لیا تھا، اور جنکو دنیا کی زندگی نے
الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ	دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ سو آج ہم بھی ان کو اسی طرح
كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا	بھلا دیں گے جس طرح ان لوگوں نے قیامت کے دن
وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ	کو بھلا رکھا تھا اور جسطرح ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى	اور بے شک ہم لائے ہیں ان لوگوں کے پاس ایک کتاب
عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ	جس کی ہم نے پورے علم کے ساتھ تفصیل کی ہے جو مومنوں
هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ	کے لئے سرتاپا ہدایت و رحمت ہے۔ مگر وہ تو اس کی حقیقت
يَاْتِىْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ	ہی کے منتظر ہیں۔ جس دن اس کی حقیقت ظاہر ہوگی اس
مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ	دن منکرین جو معاد کو پہلے سے بھولے ہوئے ہیں کہنے لگیں گے
فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ	کہ بیشک ہمارے رب کے رسول سچی بات لیکر آئے تھے، اگر کوئی
اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِىْ كُنَّا نَعْمَلُ	ہمارا سفارشی ہو تو سفارش کرے یا ہم پھر دنیا میں لوٹا دیئے
قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ	جائیں۔ تو جو کرتے تھے اس کے خلاف کریں۔ انھوں نے اپنے کو
مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۷: ۵۱)	تباہ کر ڈالا اور انکی تمام افترا پردازیاں گم ہوگئیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین معاد، دنیا میں معاد کے احوال و واقعات کا انکار صرف اس لئے کر رہے تھے کہ وہ معاد کی تمام جزئیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے ھل ینظرون الا تاویلہ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان تمام حقائق کی تفصیل کے بجائے، ان منکرین کی مذمت بیان فرمائی اور صاف طور سے کہدیا کہ جو قیامت کے منکر ہیں اور اس لئے قیامت کو نہیں مانتے ہیں کہ اس کی تمام حقیقت کو نہیں جانتے ہیں وہ اتھاہ غلطی میں ہیں۔ کیونکہ جتنا عقل انسانی سمجھ سکتی تھی وہ واضح ہوچکا ہے۔ اس سے زیادہ کے لئے کریدنی بے محل ہرزہ سرائی ہے

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر مکذبین قرآن کے متعلق آیا ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ	کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو گڑھ لیا ہے، کہدو، تم لاؤ کوئی سورۃ
مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	اس جیسی اور بلاؤ جنکو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔
دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ بَلْ	بلکہ انھوں نے جھٹلایا اس چیز کو جس کے علم کا احاطہ نہ کرسکے
كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ	اور جس کی اصل حقیقت اب تک ان کے پاس نہیں آئی ہے۔

تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ — ایسے ہی جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے پس دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ مکذبین قرآن نے قرآن کی باتوں کی تکذیب، اس وجہ سے کی کہ اس کی اصل حقیقت کا وہ پورا احاطہ نہ کر سکے بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه ولما یاتهم تاویله۔ لیکن باوجود اس کے ان کو بھی ظالم قرار دیا گیا۔ اگر ان چیزوں کی حقیقت پر پورا قابو نہ پانے کے باوجود ان پر ایمان لانا ضروری اور نافع نہ ہوتا تو پھر اس تکذیب و انکار پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کیوں بیان فرمائی؟ اور ان کو ظالم اور جہنمی کیوں کہا؟ اس صورت میں تو منکرین اور مکذبین اللہ تعالیٰ کی جناب میں یہ معذرت پیش کر سکتے تھے کہ مولا! ہم نے جو معاد کا انکار اور قرآن کی تکذیب کی تو محض اس لئے کہ ان کی حقیقت پوری طرح نہ پا سکے لیکن دیکھئے وہ یہ عذرت نہیں پیش کریں گے بلکہ اپنے جرم کا علانیہ اقرار کرتے ہیں یقول الذین نسوه من قبل قد جاءت رسل ربنا بالحق جس سے واضح ہے کہ باوجودیکہ وہ معاملہ کی پوری حقیقت پانے سے قاصر تھے تاہم اس کی نوعیت ایسی تھی کہ اس پر ایمان لانا ان کے لئے ضروری تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

اس لئے یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ جن آیتوں کی تاویل ہم کو نہیں معلوم ہے ان کی تنزیل سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایک شے کی پوری حقیقت اور اس کی تمام تفصیلات کے سمجھنے سے قاصر رہنے کے باوجود بھی ہم اجمالاً اس کو بالکل حق اور صحیح تسلیم کر سکتے ہیں اور یہ اجمالی ایمان ہمارے لئے کافی ہو سکتا ہے قیامت کے واقعات کی اصل حقیقت کو کوئی نہیں جان سکتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے پہلوؤں سے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بات اچھی طرح سمجھا دی ہے کہ معاد حق ہے، اس کا ہونا ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل و حکیم ہے وہ اپنے بندوں کے اعمال کو ضرور دیکھے گا۔ اور اچھے کاموں کا اچھا اور برے کاموں کا برا بدلہ ضرور دے گا۔ تمام باتیں معاد کی صحت و قطعیت پر محکم دلیلیں ہیں۔ یہ اصولی حقیقت ہماری عقل میں آتی ہے بلکہ اس کو

تسلیم کیے بغیر کسی طرح ہمارے دل کو چین نہیں ملتا۔ اب رہیں اس کی تمام مابعد جزئیات و تفصیلات تو ان کا ٹھیک ٹھیک ہماری عقل میں نہ سمانا اس مسئلہ کی اصولی حقیقت پر کچھ مؤثر نہیں اور یقیناً ہم ان کو نہ تو پوری طرح سمجھ سکتے نہ ان کا پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔ ان پر اجمالی ایمان کافی ہے۔ اور اس باب میں قرآن کا مطالبہ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی کھول کر بتا دی ہے کہ دار آخرت کے معاملات، بالکل دوسرے قسم کے ہیں، ان کے خاص حالات و صفات ہیں، جو اسی عالم میں پائے جا سکتے ہیں، ان کی کوئی نظیر اس دنیا میں ڈھونڈھنی بالکل عبث ہے وہاں آگ کے اندر درخت اگتے ہیں انها شجرة تخرج فی اصل الجحیم (۳۷: ۶۴) اور آگ بڑے بڑے محلوں کے مانند شعلے پھینکتی ہے انها ترمی بشرر کالقصر (۷۷: ۳۲) اور اسی آتشکدہ میں زندہ آدمی بھی رہتے ہیں جو نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں یصلی النار الکبری ثم لا یموت فیها ولا یحیی (۸۷: ۱۲-۱۳) اور باوجود اس کے دوزخ والے جنت والوں سے بات چیت بھی کرتے ہیں ونادی اصحب النار اصحب الجنة ان افیضوا علینا من الماء او مما رزقکم اللہ (۷: ۵۰) غرض یہ کہ بے شمار مقامات پر اس قسم کی باتوں کو بیان کر کے یہ حقیقت سمجھا دی ہے کہ عالم آخرت کی تمام باتیں دنیا کی باتوں سے بالکل الگ ہیں۔ پس اس عالم کی باتوں کو اس دنیا کی باتوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس عالم کے مخصوص صفات ہیں، جن کی حقیقتوں پر اس عالم میں قابو پانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم ان حقیقتوں کو نہیں جان سکتے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حقائق بھی سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کے بعض پہلو آپ کو معلوم ہوں اور بعض پہلو نہ معلوم ہوں۔ اس میں کوئی تناقض نہیں ہے لیکن ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے بعض پہلو نہ معلوم ہوں۔ وہ چیز ہی سرے سے موجود نہ ہو۔

غرض یہ کہ آیات متشابہات جنکی تاویل و حقیقت کو خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا، ان کو اس لئے بے کار کہنا کہ ان کی تاویل کو دنیا میں کوئی نہیں جان سکتا ہے، کھلی ہوئی حماقت ہے۔ ان آیتوں کی تنزیل کا

مقصود عالم آخرت کی اعلیٰ ترین حقائق کی طرف ایک اشارہ کر دینا ہے۔ اور اس مقصود کے لئے یہ آیتیں بالکل کافی ہیں۔ اصلی معاملہ یوں سمجھ کر ہماری عقل انہی باتوں کو معلوم کر سکتی ہے جو ہمارے حواس کی گرفت میں آ سکتی ہوں جو چیزیں ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہوں گی ان کو ہم کسی طرح بھی پورے طور پر اپنے قابو میں نہیں لا سکتے چونکہ آیات متشابہات میں تمامتر، عالم آخرت کی باتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ جو یکسر ہمارے حواس کے دائرہ سے باہر ہیں اس لئے ان آیتوں کی تاویل و حقیقت کو ہم اس دنیا میں قطعیت کے ساتھ کسی طرح متعین نہیں کر سکتے۔ غیر محسوس حقائق کے متعلق زیادہ سے زیادہ ہم ایک کلی اور اجمالی خاکہ اپنے ذہن میں قائم کر سکتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اس مجمل خاکہ کو اپنے تخیل کے زور پر مشخص کرنا چاہے تو اس کا تخیل، تصویر کے اصلی قدوقامت اور حقیقی خدوخال کو جو بالکل ایک دوسرے عالم کی چیز ہیں کہاں پائے گا؟ اور کس طرح سمجھے گا؟ ان چیزوں سے تو وہ اسی قدر دور ہے جس قدر وہ چیزیں اس سے دور ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آئنی ناقابل فہم حقائق کو ہمارے لفظوں میں نہایت ہی دلنشین پیرایہ میں سمجھایا ہے۔ اتنے دل نشین پیرایہ میں کہ اگر کوئی منکر نہ ہو تو نہایت ہی آسانی کے ساتھ ان آیتوں کا بقدر ضرورت مفہوم سمجھکر اپنے دل کو بالکل مطمئن بنا سکتا ہے۔ مثلاً مر کر جینا جسے معاد کہتے ہیں مشرکوں کے نزدیک بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ اور واقعی ہے بھی اس کی اصل حقیقت کا جاننا بہت ہی کٹھن۔ لیکن قرآن نے اسی حقیقت کو ان سادہ اور دلنشین لفظوں میں یوں سمجھایا ہے:۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن	کیا نہیں دیکھا آدمی نے ہم نے پیدا کیا اسکو نطفہ سے پس
نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ	وہ ہو گیا کھلا ہوا جھگڑا کرنے والا۔ اور ہمارے لئے بیان
وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ	کر دی اس نے ایک مثل اور بھول گیا اپنی پیدائش کو
قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ	اس نے کہا کہ کون ہے جو ہڈیوں کو سڑ گل جانیکے بعد زندہ
قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ	کرے گا۔ کہدو کہ وہی زندہ کرے گا جس نے اس کو پہلی

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ الَّذِي	مرتبہ پیدا کیا تھا وہ ہر مخلوق کو جاننے والا ہے وہی تو
جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا	ہے جس نے تمھارے واسطے ہرے درختوں سے آگ پیدا کی
فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ أَوَلَيْسَ	جس سے تم چیزوں کو روشن کرتے اور جلاتے ہو کیا جس نے
الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ	آسمان اور زمین کو پیدا کیا وہ پھر ان کے مثل پیدا کرنے پر
بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم	قادر نہیں ہے ہاں بلا شبہہ وہی پیدا کرنے والا ہے اور وہی
بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ (۳۶ :)	سب کچھ جاننے والا ہے ۔

یعنی جب تم پہلی مرتبہ انسان کے پیدا کرنے کو مانتے ہو تو پھر دوسری مرتبہ سڑگل جانے کے بعد زندہ کرنے کو کیوں ناممکن سمجھتے ہو؟ کیا جس نے پہلی مرتبہ پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا، وہی دوسری مرتبہ سڑی گلی مٹی سے زندہ نہیں کرسکتا؟ اگر پہلی مرتبہ کا پیدا کرنا باعث تعجب نہیں ہے تو دوسری مرتبہ میں کوئی اچنبھے کی بات کیوں ہے۔ اس تقریر نے دوبارہ زندہ ہونے کی حقیقت کو جس حسن و خوبی کے ساتھ سمجھایا ہے۔ اس کے بعد ایسا ہی کوئی معاند ہوگا جو اس کا انکار کرنے کی جرأت کرسکے۔

مختصر یہ کہ آیات متشابہات کی پوری حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی ہے. کیونکہ وہ آیتیں عالم آخرت کے امور سے متعلق ہیں۔ اور عالم آخرت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اگر ہم گھر کے اندر کی چیزوں کو نہیں جان سکتے ہیں تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت کی تمام باتوں کو سمجھ جائیں۔ اس لیے متشابہات کے متعلق ہم کو صرف اجمالی ایمان رکھنا چاہئے۔ اور اس کی جزئی تفصیلات اور حقیقت کے کھوج میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہئے کیونکہ اس چیز کا جاننا ہمارے بس سے باہر ہے. پس آیات متشابہات کے لفظوں کی عمومیت کو باقی رکھتے ہوئے، عربی زبان کے عام اسلوب کے مطابق ان کا جو مفہوم سمجھ میں آتا ہو، وہی مفہوم سمجھنا چاہئے مثلاً قرآن مجید میں نار کا لفظ بہت سے مقامات پر آیا ہے سیدخلون فی نار جہنم وہ لوگ جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔ اس آگ کے کیا معنی ہیں؟ وہ آگ کیسی ہے؟ ایسی ہی جیسی ہمارے چولھوں میں روزانہ جلتی ہے؟

سکتے؟ کیوں نہیں جان سکتے؟ اس لئے کہ یہ آگ عالم آخرت کی آگ ہے اور ہم نے آخرت کی
ا اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہ آگ کیسی ہے؟ اس کی اصل حقیقت کو اس کا پیدا کرنے والا جانے
ت کو جاننے سے عاجز ہیں پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کی واقعی حقیقت کو تو ہم اپنے تصور علم
ں بتا سکتے۔ لیکن جب یہ کہا گیا ہے کہ وہ جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے تو کلی طور پر اتنی حقیقت
ں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ ہم اس پر اپنی عقل کے پورے اطمینان کے ساتھ ایمان لا سکتے ہیں
ا حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کر دینا چاہیئے، باقی اجمالی طور پر لفظوں کی رہنمائی سے جو بات سمجھ
ہمارے ایمان کے لئے بالکل کافی ہے اسی طرح وہ تمام الفاظ و آیات ہیں جن میں عالم غیب
ت بیان فرمائی گئی ہے۔ اگر آپ ان کی حقیقت کا کھوج لگانا چاہیں تو کسی طرف بھی آپ کو
ی نظر نہیں آ سکتی ہے۔ کیونکہ جس طرح وہ عالم غیب میں ہے اسی طرح اس کی ہر چیز بھی غیب
سورہ لہب میں ابولہب کی بیوی کے متعلق آیا ہے کہ قیامت کے دن اس کی گردن میں بٹی ہوئی
بید ھا حبل من مسد۔ لیکن اس رسی کی کیا حقیقت ہے؟ کیا وہاں بھی ایسی ہی بٹی
ہوئی جیسی عرب کی لکڑی ڈھونے والیاں اپنے گردنوں میں ڈال کر جنگلوں میں گھوما کرتی تھیں
ہ میں کہا گیا ہے کہ: جہنم کی آگ کو انسانی دلوں پر باندھ دیا جائے گا۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔
وصدۃ فی عمد ممددۃ۔ لیکن یہ ستون کیسے ہوں گے؟ ایسے ہی جیسے ہمارے مکانوں
ہیں؟ ان میں سے ہم کو ایک بات بھی نہیں معلوم، پھر ان سے کیا سمجھا جائے؟ ان کی مراد
ہی طریقہ ہے کہ ان کی اصل حقیقت کو تو خدا کے حوالہ کر دو۔ اور لفظوں کے ظاہری مدلول سے
ا ہے اسے اختیار کر لو، دل کی طمانیت کیلئے کافی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں اور بھی بہت سے
ی اصل حقیقت تو نہیں معلوم، مگر ان کے سمجھنے کی یہی راہ ہے جو ابھی ہم نے عرض کی ہے۔ مثلاً فرمایا
سونڈوں پر داغ دیں گے سنسمہ علی الخرطوم (۶۸ : ۱۶) غور کرو انسانوں کی سونڈ کہاں ہیں؟

اور سونڈوں پر داغ دینے کے کیا معنی؟ اب اگر اس کی حقیقت کو تلاش کرو تو اس کو اس دنیا میں کہاں پاؤ گے؟ لیکن اس کے اجمالی اور سادہ مفہوم کے سمجھنے میں یہاں کیا دقت ہے؟ اسی طرح سورہ کہف میں آیا ہے کہ ہم نے گنہگاروں کے واسطے آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں گنہگاروں کو گھیر رہی ہیں اور اگر وہ لوگ فریاد کریں گے تو ان کو پیپ ایسا پانی دیا جائے گا جو چہروں کو بھون ڈالے گا۔ انا اعتدنا للظلمین نارا احاط بھم سرادقھا وان یستغیثوا یغاثوا بماء کالمھل یشوی الوجوہ (۱۸: ۲۸) غور کرو! ان تمام امور کی تمام جزئیات و تفصیلات کو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں لیکن ان پر اجمالی ایمان میں ہم کو کیا زحمت پیش آسکتی ہے؟ سورہ عبس میں فرمایا گیا ہے: کتنے گرد آلود منہ ہوں گے اس دن جن پر چڑھی آتی ہوگی سیاہی! ووجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا قترۃ (۸۰: ۴۰-۴۱)

اگر یہ تمام باتیں ہماری نظر سے کہیں نہیں گزری ہیں اور ہم ان کی اصل حقیقتوں کا تصور نہیں کر سکتے تو پھر اولی یہی ہے کہ ان کی زیادہ کرید میں نہ پڑیں۔ ان کی تمام تفصیلات کو صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، لفظوں کے ظاہری مدلول سے محاورہ زبان کے مطابق جو بات سمجھ میں آتی ہے ہمارے لئے اتنا بس ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ سونڈوں پر داغا جائے گا، چہروں کو بھون ڈالنے والے پانی ہوں گے۔ مونہوں پر سیاہی بھی چڑھی آتی ہوگی یہ سب کچھ ہوگا اور بلا شبہ ہوگا لیکن یہ سب کچھ کس طرح ہوگا؟ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ ان کو صرف خدا جانتا ہے۔ ہم ان پر اجمالاً ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے وقوع کو ہماری عقل تسلیم کرتی ہے۔

ہمارے نزدیک آیات متشابہات کے سمجھنے کا صحیح اور تسلی بخش طریقہ یہی ہے اور سلف ان کو اسی اصول پر سمجھتے تھے لیکن بعد میں جب تعمق اور جدل کے دروازے کھل گئے تو لوگوں نے اس صحیح راستہ کو جو قرآن کا بتلایا ہوا تھا چھوڑ دیا۔ اور کوشش کی کہ کوئی پتھر بے الٹے ہوئے نہ چھوڑیں۔ یہ ٹھوس چٹانیں تو خیر کیا ٹوٹتیں البتہ اس سعی لاحاصل کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ اس سے خود ان کے اور دوسروں کے ایمان کے لئے ہزاروں فتنے ضرور پیدا ہو گئے۔ اور یہ اس کا ایک لازمی نتیجہ تھا جس کی طرف قرآن حکیم نے پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا۔

ان تمام تفصیلات کے بعد آیت پاک کا مطلب یہ ہوا کہ:۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کچھ آیتیں ایسی نازل فرمائی ہیں جو انسانی فطرت کی آواز اور بالکل اس کی عقل کے مطابق ہیں جس شخص کی فطرت اور عقل میں فساد نہ ہوگا وہ ان کو ضرور قبول کرے گا۔ یہی آیتیں کتاب کی تمام تعلیمات کی اصل ہیں۔ اور ان کے مقابل میں کچھ آیتیں ایسی نازل فرمائی ہیں، جن کی مراد حقیقت کو قطعیت کے ساتھ جاننا ناممکن ہے۔ بڑی سے بڑی عقل بھی ان آیتوں کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ بس اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے بقدر ضرورت اس دریا سے پانی لے لو۔ اور پورے سمندر کو اپنے عقل کے مختصر پیمانے سے ناپنے کی ہوس نہ کرو۔ ان آیتوں کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا ہے لایعلم تاویلہ الا اللہ ۔ جو لوگ خواہ مخواہ کو ان آیتوں کی حقیقت کو معلوم کرنے کے درپے ہوتے ہیں وہ یقیناً وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے اس لئے کہ کوئی سیدھے دل کا آدمی اس طرح کی ناممکن باتوں کے پیچھے نہیں پڑا کرتا ہے بلکہ وہ تو اس طرح کے ناقابل فہم امور میں سکوت و اجمال کو بہتر جانتا ہے اور خواہ مخواہ کو اس قسم کے مسائل میں پھنسکر اپنا وقت نہیں ضائع کیا کرتا یقولون امنا بہ کل من عند ربنا

جس طرح شروع سورہ میں اللہ تعالےٰ نے اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم کے بعد نزل علیک الکتاب بالحق فرمایا تھا۔ ٹھیک اسیطرح اس موقع پر بھی لا الہ الا ھو العزیز الحکیم کے بعد ھو الذی انزل علیک الکتٰب فرمایا ہے۔ دونوں موقعوں پر کلام کا ایک ہی اسلوب ا۔ ایک ہی انداز ہے۔ جسمیں کوئی نہ کوئی بھاری نکتہ ضرور پنہاں ہوگا۔ اس لئے طالب قرآن کو اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

شروع سورہ میں یہ فرمایا گیا کہ وہی خدا معبود ہے جو حی و قیوم ہے، اور اس نے تم پر کتاب اتاری ہے۔ یعنی یہ کتاب اس کی صفات حیات و قیومیت کا مقتضی ہے کہ وہ چونکہ خود حی و قیوم تھا اس لئے اس نے بندوں کی زندگی و ہدایت، قیام اور بقا کیلئے ایک کتاب اتاری۔ تاکہ اس کتاب کے ذریعہ سے وہ سعادت کے بلند سے بلند مرتبے حاصل کر سکیں۔ اور دوسرے موقعہ پر یہ فرمایا گیا کہ وہ خدا معبود ہے جو عزیز و حکیم ہے۔ اور اسی نے تم پر کتاب اتاری ہے جس میں دو طرح کی آیتیں ہیں الخ۔ یعنی اس موقعہ پر بتایا گیا ہے کہ جس طرح خدا کی

صفات حیات و قومیت کا یہ تقاضا تھا کہ اس نے ایک کتاب اتاری، اسیطرح خدا کی صفات عزت و حکمت بھی اسکی متقاضی ہوئیں کہ جو کتاب بندوں کو دیجائے وہ کمال حکمت اور انتہائی عزت کی حامل ہو، بالخصوص وہ کتاب جو تمام سابقہ کتابوں کو پورا کرنیوالی اور تمام اختلافات شدید کے موقعوں پر فرقان عظیم کا کام دینے والی ہے کیونکہ اس کو عزیز و حکیم خدا نے اتارا ہے۔ اور ان صفات کی اس میں کافی جلوہ گری ہے .... جس کے یہ معنی ہیں کہ قرآن، رفعت و حکمت اور بلندی عزت کے انتہائی حد پر ہے۔ اس اشارہ سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب قرآن کی حکمت اور عزت کا پایہ اتنا بلند ہے تو بہرحال ہم کو قرآن کے سامنے عقیدت و نیازمندی ہی کے ساتھ جھکنا چاہیئے۔ کیونکہ اس بارگاہ بلند تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ یہ سمندر اتھاہ ہے اس کی تھاہ لگانا ناممکن ہے پس اس کی کنہ و حقیقت کے احاطہ کرنے کی ہوس کو دل سے نکال ڈالنا چاہیئے۔ ہماری عقلوں کی درماندگی کا تو یہ حال ہے کہ ہم مخلوقات الٰہی کی کنہ و حقیقت کا بھی اب تک سراغ نہ لگا سکے پھر کلمات الٰہی کی حقیقت کو تو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا درجہ تو ان سے بہت اونچا ہے اس لئے نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ اس راہ پر قدم رکھنا چاہیئے۔

بہرحال واخر متشابہات کے متعلق یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو آج کی صحبت میں عرض کیگئی ہیں۔ فان اصبت فمن اللہ وان اخطأت فمن نفسی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تفسیر سورہ کوثر (اردو)

مقالات

مولانا حمید الدین

(۲)

ولادت ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء - وفات ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء

از حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ

فغاں کہ گشت نیوشندہ سخن خاموش
دگر چگونہ تسلی کنم من ایں لب و گوش

پچھلے نمبر میں مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کے قیام حیدرآباد کے عہد تک کے واقعات گذر چکے ہیں،[1] اب اس کے بعد کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت تنہائی پسند، گوشہ نشین، اور بڑے لوگوں سے ملنے جلنے سے وہ عمداً بہت بچتے تھے، اس لئے حیدرآباد دکن جا کر بھی جو ایک عالم کا مرکز، اور خوش قسمتوں کا عجائب خانہ ہے، ان کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، سوا اپنے حلقہ کے خاص لوگوں کے جن سے ان کو اتحاد ذوق تھا، اور کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔

اب وہ زمانہ ہے، جب مولانا شبلی مرحوم، اور ندوۃ العلماء کے دوسرے ارکان کے درمیان کشیدگی پید

[1] معارف کے پچھلے نمبر (جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۷) میں لکھا گیا تھا کہ دار العلوم حیدرآباد کا تعلق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے تھا، مگر حیدرآباد کے ایک دوست مطلع کرتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے الحاق تھا، انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کے بعد یہ الحاق ٹوٹ گیا۔

ہوگئی تھی، جس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ کینسر وٹیو اور لبرل کی پرانی جنگ تھی۔

اواخر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے استعفا دیا، تو اپنی پرانی تجویز یعنی ایک دارالمصنفین اور دارالتکمیل کی بنا ڈالنے کا خیال آیا، مگر یہ خیال ہنوز دل ہی میں تھا یا کاغذ کے صفحہ پر تھا، اس کیلئے کبھی لکھنؤ، کبھی کسی اور مقام کی فکر تھی، اسی اثنا میں اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے عزیز بھتیجا مولوی محمد اسحق صاحب وکیل ہائیکورٹ الہ آباد کے انتقال نے ان کو بالکل سرد کر دیا اور لوٹ کر اعظم گڈھ کو اپنا ٹھکانا بنایا، اور اسکے لئے زمین و بنگلہ وقف کیا، اور چاہا کہ مدرسہ سرائے میر اور اپنے نیشنل ہائی اسکول (جس کو ۱۸۸۳ء میں یہیں قائم کیا تھا) اور دارالمصنفین کو ملا کر ایک علمی و تعلیمی دائرہ بنالیں، اس عزم و یاس کے عالم کشمکش میں مولانا حمید الدین صاحب کو لکھا:۔

"بھائی اچھا ہونا کیا و لن یصلح العطار ما افسد الدھر دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں، لیکن بات چیت کرتا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہو چکا، ابھی ابھی سردی لگی حالانکہ دوپہر کا وقت ہے۔

افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرسکے۔۔

...... اور اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا"

یہ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا خط ہے، ۲۸ اکتوبر کو لکھا:۔

"برادرم! وقت تو یہ تھا کہ ہم چند لوگ یکجا ہوتے اور کچھ کام کرتے لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے، کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں، لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق ہوتی ہے، سید سلیمان[1] بھی تعلق موجودہ پر راضی نہیں، ذرا اشارہ ہو تو میرے پاس آجائیں، میں خود روک رہا ہوں"

مرا اگر تو بگذاری اے نفس طامع
بسے بادشاہی کنم در گدائی

[1] دکن کالج پونا کی اسسٹنٹ پروفیسری،

اس کے تین ہی ہفتہ کے بعد مولانا شبلی نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا، مولانا حمید الدین صاحب وفات کے ایک دن اور میں دو دن پہلے پہنچا تھا، مجھے حکم دیا کہ سب "چھوڑ کر سیرت" مولانا حمید الدین صاحب جب پہنچے تو مصنف سیرت کی مقدس زبان خاموش ہو چکی تھی، آنکھیں کھول کر بھائی کی طرف دیکھا اور چپ ہو گئے اس خاموش نگاہ حسرت میں وصیتوں اور فرمائشوں کے ہزاروں معنی پوشیدہ تھے جن کو اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں،

اس موقع پر ہم جاں نثاروں میں صاحب ہوش وہی تھے، ماتم کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے تیسرے دن اس وقت مولانا شبلی مرحوم کے جو چند تلامذہ جمع ہو گئے تھے، ان کی ایک مختصر سی جماعت نعمانیہ بنائی، جس نے اپنا یہ مقصد قرار دیا کہ وہ مولانا شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرے گی، مدرسہ سرائے میر کی صدارت مدرسین مولانا شبلی صاحب متکلم ندوی کے سپرد ہوئی، اس کی نظامت مولانا مسعود علی ندوی نے اپنے سر لی، دار المصنفین کی تشکیل اور تاسیس کے لئے اسی جماعت کے ارکان نے ماہوار چندے لکھوائے اور اس کا اہتمام بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، اور سب سے زیادہ یہ کہ شبلی منزل میں ان کاموں کی انجام دہی کی خاطر تنہا قیام گوارا کیا،

اس کے بعد میں اور وہ دونوں مل کر سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ والیہ عالیہ بھوپال کی طلبی پر بھوپال گئے، سرکار عالیہ نے تسلی دی اور سیرت کی تصنیف کی رقم کو بدستور ہم دونوں کے نام جاری فرما دیا، اور یہی دار المصنفین کے وجود و نشو و نما کے لئے ابر کرم کی پہلی بارش تھی۔

حیدرآباد جا کر مولانا نے کوشش فرمائی، اور نواب عماد الملک کی تائید سے وہ کوشش کامیاب ہوئی، اور مولانا کا تین سو ماہوار کا وظیفہ دار المصنفین کے نام منتقل ہوا، یہ دار المصنفین کی بقا کی بہترین ضمانت بنی، اس کے بعد گو باقاعدہ مجلس انتخاب نہیں ہوا تھا، تاہم ان کی حیثیت صدر مجلس کی اور میری ناظم کی تھی، بعد کو باقاعدہ تاسیس اور وضع دستور العمل کے بعد یہی قانونی شکل بن گئی

اور وہ آخر تک دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر نشین رہے۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے دو مذکورہ بالا آخری خطوط میں جو کچھ لکھا تھا وہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی آئندہ زندگی کا نصب العین بن گیا، گو دارالعلوم حیدرآباد کے تغیر اور جامعہ عثمانیہ کے مفید و مبارک تخیل کی سودمندی کی خاطر انہوں نے چندے حیدرآباد کا قیام گوارا کیا، مگر ان کا دل اور کاموں میں لگا تھا۔

مولانا حمید الدین صاحب کے تصور نے مجوزہ دارالعلوم کی شکل ہی بدل دی، مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے وجود نے یونیورسٹی کے "کنسر وئیو آئیڈیا" میں بھی انقلاب پیدا کر دیا، مولانا حمید الدین صاحب ہی تھے، جنہوں نے عصری علوم و فنون کی اردو زبان میں تعلیم کی تجویز پیش کی، اور اس کا خاکہ تیار کیا، ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو، اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھایا جائے، لیکن راس مسعود صاحب اور نواب سر حیدر نواز جنگ حیدری صاحب نے ان کے اس تخیل کو کہ علوم کی تعلیم کی زبان اردو ہو، قبول کیا، مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو در اصل دینیات کی عربی تعلیم دی جائے قبول نہیں کیا، اور یہی درحقیقت حیدرآباد سے ان کی دل برداشتگی کا سبب ہوا، ۱۹۱۶ء سے جامعہ عثمانیہ کی تیاری کتابوں کے ترجمہ کا اور اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام شروع ہوا، وہ اس مجلس کے رکن تھے اور وضع اصطلاحات میں مفید مشورے دیتے تھے، اور جامعہ کے نقش تخیل کی رنگ آمیزی میں مصروف تھے، تا آنکہ اگست ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ اسکے افتتاح کی نوبت آئی۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جو اس زمانہ میں صدر الصدور ہو کر حیدرآباد پہنچ چکے تھے، اور وہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے، وہ اپنے والا نامہ مذکور میں فرماتے ہیں۔

"جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے"

مگر بعض وجوہ کے باعث یہ ہاتھ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گیا، گو ظاہری سبب یہ بھی تھا کہ حیدرآباد کی آب وہوا مرحوم کو راس نہیں آئی، ان کے درد سر کی عارضی بیماری نے دائمی صورت اختیار کرلی، اس درد کے دورہ سے وہ بے چین ہو جاتے تھے، اور پھر کسی کام کے قابل نہیں رہتے تھے، بایں ہمہ یہاں کے قیام کے دوران میں خرد نامہ یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی، اور چھوائی پھر اسباق النحو کے نام سے عربی صرف و نحو کے آسان صورت میں نئے اصول پر ار۔ومیں دو رسالے مرتب کئے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے وہ چھپے، اپنے استاد ادب مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کا عربی دیوان تصحیح کرکے چھپوایا، الرای الصحیح تصنیف کی، اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے، اسی کے ساتھ درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، مغرب کے بعد یہ مجلس جمع ہوتی تھی، مولانا تقریر فرماتے تھے، لوگ شکوک پیش کرتے تھے، وہ جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم ہو جاتی تھی، ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں، وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے، ایک دو دفعہ مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا، کبھی کبھی مولوی وحیدالدین صاحب سلیم مرحوم بھی اس میں بیٹھتے تھے۔

مولانا حیدرآباد میں ۱۹۱۹ء تک رہے، اور عین اس وقت جب جامعہ عثمانیہ کا ہیولیٰ صورت قبول کر رہا تھا، انھوں نے استعفا دیدیا، ذمہ دار ارکان حکومت چاہتے تھے کہ مولانا قیام کریں، مگر وہ اپنی طبعی نیازی اور استغنا کو راہ دیکر متوکلاً علی اللہ ایک ہزار ماہوار کی جگہ چھوڑ کر وطن چلے آئے، حیدرآباد میں جبتک وہ رہے، بے ہمہ اور باہمہ رہے، علم کی قدر ومنزلت اور بے نیازی کو انھوں نے پوری طرح نباہا، اور جو لوگ ان سے ذاتی طور سے واقف تھے، اور انکا حلقہ بہت محدود تھا، ان پر مولانا کی جدائی بڑی شاق گذری، بایں ہمہ وہ انکے رنگ طبع کو دیکھ کر ان کو مجبور کر سکے، مولانا کو حیدرآباد سے نہ کوئی پنشن مل سکی، اور نہ کوئی وظیفہ ہوا، نہ کسی اور قسم کی مالی امداد کے پانے کی انھوں نے کوشش کی، چونکہ وہ الہ آباد یونیورسٹی سے حیدرآباد بھیجے گئے تھے اس لئے الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے

کل تیس تینتیس روپے کی (ان) کو پنشن ملی۔

اعظم گڈھ واپس آکر مولانا نے اپنے وطن پھریا میں قیام فرمایا، خاندانی موروثی زمینداری کا کام کبھی دیکھ لیتے تھے، ایک دو لڑکوں کو کچھ پڑھا دیتے تھے، ورنہ زیادہ تر وقت یادِ الٰہی، نماز، تلاوت اور کلام پاک کے غور و فکر میں بسر ہوتا تھا، اب وقت آیا کہ مولانا مدرستہ الاصلاح سرائے میر کی طرف توجہ فرمائیں۔

مدرستہ الاصلاح سرائمیر | دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا لوگ اس کو حقیقت اور نہیں کرتے، تھوڑے کو بہت کرکے دکھانا اس عالم فریب کا خاصہ ہے، مگر مولانا کی طبیعت کا رنگ الگ تھا، وہ اعلان وتعلی سے بہت دور بھاگتے تھے، اور بہت کو تھوڑا کہکر بھی وہ دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ مدرستہ الاصلاح سرائمیر کی بنیاد میں گو بہتوں کا ہاتھ شریک ہو، لیکن اس کے تخیل کی تعیین، اور اس تخیل کے مطابق مدرسہ کو چلانا، اس کا نصاب درس بنانا، مدرسوں کو اپنے انوکھے خیال سے متفق کرنا، خاص طلبہ کو اپنے مذاق کی تعلیم دینا اور پورے مدرسہ کو اپنے نہج کے مطابق لے چلنا، خاص انھیں کا کام تھا۔

مدرستہ الاصلاح کیا ہے؟ آج جب کہ ہر بڑے شہر کی گلی گلی میں، بلکہ قصبوں اور دیہات تک میں عربی کے مدرسے قائم ہیں، اور ہر سال ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے، مولانا کا ایک مدرسہ کے قیام پر اپنی زندگی وقف کر دینا، اور اپنی عمر کے آخری پورے بارہ برس اس پر صرف کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ ہم خود کچھ کہیں مدرسہ کی مطبوعہ روداد کا ایک اقتباس نقل کر دیتے ہیں، اور یہ وہ تحریر ہے، جو خود مولانا نے لکھی تھی، یا ان کی فرمائش سے لکھی گئی اور ان کی نظر سے گذر کر اصلاح پا چکی تھی۔

مسلمانوں کی موجودہ پستی جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہے زیادہ تر نتیجہ ہے اس خرابی کا جو ان کی مذہبی تعلیم میں صدیوں سے پیدا ہو گئی ہے، جب تک مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اپنے صحیح نہج پر قائم رہی، وہ برابر دین و دنیا کے تمام شعبوں میں ترقی کرتے رہے، لیکن جب سے یہ شاہراہ

کچھ ہوئی، دینی مدارس اور مذہبی پیشواؤں کی کثرت کے باوجود مسلمانوں کا زوال شروع ہوا اور برابر بڑھتا گیا۔ . . . .

ان حالات میں خدا نے ایک جماعت کو اپنی توفیق بخشی سے سرفراز کیا، اور اس نے غور کیا کہ اس وقت پر علوم دینیہ کی تعلیم ہو رہی ہے وہ قطعی ناقص اور غیر منتج ہے، جب اسلام ہماری دینی و دنیاوی فلاح کا جامع ہے تو اسلامی تعلیم کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ نہ صرف ہمارے عبادات کا دستور العمل ہو، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہو، اب ہمارے درد کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ محض رسمی تعلیم اور نصاب مروج کو ختم کرنا نہیں بلکہ مذہبی تعلیم کو اس کے صحیح معنوں میں جاری کرنا ہے یعنی وہ وسعت و جامعیت جو اسلام کا مفہوم ہے اور "تفقہ فی الدین" سے عبارت ہے، اس جماعت نے اس بلند معیار تعلیم کو پیش نظر رکھ کر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جس کا نام مدرسۃ الاصلاح ہے

مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پالیا ہے، اسی نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے . . . . . . وہ مقصد اساسی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس پر آنحضرت صلعم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا، اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی، کہ میں تمہارے لئے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں، جب تک اسے مضبوط پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے، مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و تنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ ترک کرتے گئے، اور وہ علوم جو قرآن فہمی کے لئے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے انکی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس و تدریس کیلئے انھوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی، اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت و حفظ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا، اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے

مدرستہ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت و ترقی تسلیم کرکے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی، وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، تفسیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں، اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے"

اس تشریح کے بعد آپنے سمجھا ہوگا کہ مدرستہ الاصلاح کیا ہے؟ اور مولانا نے اس مدرسہ کو ترقی دیکر ملت کی کیا اصلاح کی؟ اور انھوں نے گراں بہا معاوضہ، علمی اعزاز، دنیاوی منصب اور شہروں کی لذت بخش زندگی کو چھوڑ کر، سادگی، قناعت اور گمنامی کے ساتھ اپنی عمر کا ایک حصہ کیوں ایک دیہات میں بیٹھکر عربی کے ایک مدرسہ کی خدمت گذاری میں بسر کر دیا۔

یہ مدرسہ مولانا کے گھر سے ایک اسٹیشن کے فاصلہ پر ہے، مولانا ہر ہفتہ میں تین دن شب و روز یہیں بسر فرماتے تھے، اور سنکر تعجب ہوگا کہ اس اہتمام کے ساتھ آتے تھے کہ اپنے قیام تک کے لئے کھانا پکوا کر ساتھ لاتے تھے، یا بعد کو پک کر آجاتا تھا، اسی مدرسہ میں مولانا کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، جس میں وہ قیام فرماتے تھے۔

اس مدرسہ کی بنیاد محض توکل پر ہے، اور مولانا کو اپنے خدا پر یہ اعتماد تھا کہ کبھی مدرسہ کے متعلق ایک دفعہ بھی یہ تصور اپنے دل میں نہیں لائے کہ کل کیا ہوگا، وہ کہتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ "خدا دے گا"، اور یہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ ان کا خدا ان کو دیتا تھا، انھوں نے کبھی اپنے مدرسہ کے لئے کسی سے چندہ نہیں مانگا، اور کبھی علم اور قوم کے لئے بھی غیر کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا، ایک دفعہ بمبئی کی خاطر کلکتہ کی راہ سے رنگون گئے، اور مقصد مدرسہ کا سرمایہ ہی تھا، مگر اپنی زبان سے کسی تاجر و سوداگر سے مدرسہ کے لئے تحریک نہیں کی، مگر بہر حال کامیاب آئے۔

انھوں نے سب سے پہلے اپنے مدرسہ کے لئے ایک اچھی خاصی وسیع مسجد بنوائی، اس کے بعد درسگاہ

زا سا بنگلہ بنایا، پھر ایک دار الاقامہ بنوایا، جس کی تین کوٹھیں بن چکی ہیں، ایک باقی ہے، کتبخانہ کے لئے
، بنوایا، مسجد کے علاوہ تمام عمارتوں کی چھتیں کچی ہیں، یعنی کھپروں کی ہیں، کتبخانہ میں کچھ
روں کی دی ہوئی ہیں، مگر زیادہ خود اپنا ذاتی کتبخانہ مدرسہ کو عنایت فرمادیا تھا، اور جو انکی
، بعد مدرسہ کے اندر آبھی گیا ہے۔

مدرسہ کا ماہانہ خرچ تعمیرات کے علاوہ پانچ چھ سو ہے، بعض مخلصین نے کچھ جائدادیں، اعظم گڈھ،
کلکتہ میں مدرسہ کے نام وقف کی ہیں، کچھ مدرسہ نے رنگون میں خود خریدا ہے، مگر ہنوز آمد و خرچ برا
، کے مسلمان سالانہ عشر اور قربانی کی کھالوں اور نقد چندوں سے امداد بھی فرماتے ہیں، تاہم
یہ مدرسہ کی روزافزوں ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔

یہ مدرسہ اسٹیشن سرائمیر کے پاس ایک میدان میں واقع ہے، ادھر، ادھر دور تک آبادی سے خالی ہے،
بت دور ہٹ کر مسلمانوں کے دیہات ہیں، یہیں کے باشندے، اسکے ممبر، خادم اور کارکن ہیں،
ح ہو کر کام کو انجام دیتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، انتہائی سادگی اور صفائی اس مدرسہ کا جزو اعظم
بعض پرانے مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہیں، چند دار العلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں، اور بعض خود
ہوئے ہیں، مدرسہ کے سب سے پرانے خادم ایک سادہ وضع بزرگ مولانا محمد شفیع صاحب ہیں، جو ابتدا
ساتھ شروع سے آجتک مدرسہ کی نگرانی، اور مالی انتظام کر رہے ہیں۔

رسہ کے یہ مدرسین جس سادگی، اخلاص اور ایثار کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی مثال ہم کو
رگاہ میں نہیں معلوم، سب سے بڑی تنخواہ اعلیٰ مدرس مولانا شبلی صاحب ندوی کی ہے، پینتیس ۳۵ روپے، درانحالیکہ
ئے شاگرد اور ان کے ساتھی اس سے دوگنی، چوگنی زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں۔

لانا علماء کی گداگرانہ خصلت سے سخت نفرت رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مولویوں کے مدرسہ سے بھی
ت دور ہو جائے، چنانچہ مدرسہ کیلئے بھی انھوں نے جائداد خریدی جس کا سال بسال منافع

آتا ہے، اور صرف اپنی کوشش سے تمام عربی مدارس کے برخلاف اس مدرسہ میں تجارتی وصنعتی آمدنیوں کے ذرائع پیدا کئے، خود اپنی طرف اور مدرسہ کے بعض مخلص ہمدردوں کی طرف سے کچھ سرمایہ لگا کر مدرسہ میں آٹا پیسنے کا مشین مع انجن کے لگایا، اور اس سے مدرسہ کو روزانہ کی آمدنی ہوجاتی ہے، مدرسہ کے اندر جوتا بنانے کا ایک شعبہ قائم کیا، جہاں اچھے جوتے پمپ اور شو وغیرہ بنتے ہیں۔

مدرسہ کی تعلیمی کیفیت یہ ہے کہ تمام مدرسین مولانا کے زہد وتقویٰ اور فضل وکمال سے ان کے گرویدہ تھے، سب سے پہلے مدرسین کو اپنا ہم خیال بنایا، اُن سے قرآن مجید کے مباحث اور علوم عالیہ کے مسائل میں اپنی تحقیقات بیان فرماتے رہتے تھے، ان کو اپنا طریقہ تعلیم سمجھاتے اور بتاتے تھے، عربی میں صرف ونحو کی تعلیم میں سب سے زیادہ وقت برباد ہوتا تھا، خود مولانا نے صرف ونحو کے دو رسالے لکھے جن کا مدار تمامتر مشق پر ہے، وہ دونوں رسالے وہاں پڑھائے جاتے ہیں، اور وہ کافی ہوتے ہیں، نصاب تعلیم سے تمام غیر ضروری علوم نکال دیے ہیں، قدیم منطق وفلسفہ کی ایک ایک دو دو کتابیں رہنے دی ہیں، ادب عربی پر خاص زور دیا، فقہ کی تعلیم فقہ اسلامی کی حیثیت سے دیجاتی ہے، احادیث کی عربیت کے نقطہ نظر سے پڑھائی جاتی ہے، اور تعلیم کا اصلی مرکز ومحور قرآن مجید کو رکھا گیا ہے۔

مولانا جب تک زندہ رہے خود مدرسین اور اعلیٰ طلبہ کا ایک حلقہ بنا کر اس کو پورے قرآن مجید کا درس کئی دفعہ مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیا، ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کی بعض شاخیں بھی ان طلبہ کو خود پڑھائیں، چنانچہ بعض مستعد طلبہ نے مولانا کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا، جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں، ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔

مولانا اخیر عمر میں تصنیف وتالیف کے بجائے اپنا تمامتر وقت انھیں طلبہ کے غور وپرداخت اور تعلیم وتربیت پر صرف فرماتے تھے، اور انھیں کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔

حکمت غرب

مارکس آریلیس کے خیالات

ترجمہ از مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی، ایم۔ اے۔

مارکس آریلیس (Marcus Aurelius) رومۃ فلسفی شہنشاہ ۱۲۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۱ء سے ۱۸۰ء تک حکمراں رہا۔ اس نے حکومت کے نظم و نسق کو درست کیا، غلاموں کی حالت بہتر بنائی ملکی قوانین میں اصلاح کی، اور وحشی حملہ آوروں کو سلطنت میں داخل ہونے سے باز رکھا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تصنیف ہے جو اس کے "خیالات" کے نام سے شائع ہوئی اور جو آج بھی سیدھے سادے الفاظ میں اخلاقی مواعظ اور فلسفیانہ حقائق کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ ناظرین الاصلاح کے لئے ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

ہر صبح اس بات کو یاد کر لیا کیجئے، "آج میری ملاقات ایسے شخص سے ہوگی جو دوسروں کے معاملات میں مخل ہوتا ہے۔ ایسے شخص سے بھی ہوگی جو احساس تشکر سے بیگانہ و محروم ہے اور ایسے شخص سے بھی مفر نہیں جو سینہ زوری اور خود غرضی کا مجسمہ ہے۔ مجھے دغا بازی، رشک و حسد اور خود غرضی سے بھی دوچار ہوتا ہے۔" یہ بدیاں ان لوگوں کے لئے مقسوم ہو چکی ہیں کیونکہ وہ نیکی و بدی میں امتیاز ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن میں نے اچھے لوگوں کی فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور یہ بات مجھ پر واضح ہوئی کہ ان کی فطرت حسن و لطافت کی حامل ہے۔ اسی طرح بدوں کی فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کی فطرت کراہت و کثافت کی حامل ہے۔ گنہگار کی فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس کی فطرت بالکل میری اپنی فطرت کی مانند ہے۔ یہ رشتۂ تعلق اس وجہ سے

نہیں ہے کہ وہ بھی اسی گوشت پوست و خون کا حامل ہے جو میرے حصہ میں آیا ہے اور نہ یہ رشتہ اس بنا پر ہے کہ ہم دونوں کا باوا آدم ایک ہی ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ (گنہگار) بھی اسی عقل و شرارۂ لوہیت کا حامل ہے جو مجھ میں ہے۔ پس سوال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی میرے لئے کیونکر ضرر رساں ہو سکتا ہے؟ کوئی ضرر رساں نہیں ہو سکتا! وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے شرمناک اطوار میں مبتلا نہیں کر سکتا ہاں میں خود ہی اپنے کو مبتلا کر سکتا ہوں۔ یا یہ بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ہی اعزا سے برہم ہو جاؤں یا ان سے نفرت کرنے لگوں!

ہاتھ، پاؤں، پلکیں، یا بالائی اور زیرین دانتوں کی قطاریں ہم سب کی طرح ایک ہی جسم کے مختلف حصے ہیں کیونکہ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کام کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اس وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف کام کرنا خلاف فطرت ہے لیکن غصہ و نفرت کی یہی خالص بنیاد ہے۔

یہ چیز جس کو میں "میں" کہتا ہوں وہ مجموعہ ہے گوشت، سانس، اور عقل کا تو اس وقت بھی سکرات کی حالت میں ہے۔ اس لئے گوشت (جسم) سے نفرت کر جسم میں تھوڑا سا خون، چند ہڈیاں اعصاب کا بنا ہوا۔ ایک معمولی جال اور رگیں ہیں۔ اس کے بعد نفس کیطرف متوجہ ہو۔ یہ کیسی بے حقیقت چیز ہے! ایک ذرا سی ہوا اور وہ بھی ہر آن تبدیل ہونے والی! ہر گھنٹہ کے ہر منٹ میں ہم سانس باہر اور پھر اندر لیتے ہیں۔ صرف عقل ہمارے پاس رہ جاتی ہے۔ بس اب یوں غور کرو۔

تیری عمر جو بہت طویل ہو چکی ہے اس کو زر خرید غلام کے مانند نہ رکھ اور نہ تو اس کو ایک کٹھ پتلی بن جانے دے۔ جس کو ایسے جذبات متحرک رکھتے ہیں جو انسانی حس و ہمدردی سے بے نیاز ہیں۔ اپنی اپنر رسانی کو نہ آج کی تقدیر کا گلہ کرنے دے اور نہ اس کو فردا سے مشتبہ ہونے دے۔

امور الٰہی پر مصلحت ہوتے ہیں۔ تقدیر فطرت سے آزاد و بے نیاز نہیں ہے بلکہ تقدیر ان امور سے باہم وابستہ و منسلک ہے جن پر مصلحت الٰہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہی منبع ہے اور یہیں سے تمام چیزوں کی

ابتدا ہوتی ہے۔ عناصر باہمی بھی ضرورت اور عافیت عامہ پر مشتمل ہیں تو (انسان) ان کا صرف ایک جزو ہے۔ پس جو کچھ بھی کل کی فطرت سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور کل کے لئے عافیت بخش ہوتا ہے وہ اس کل کے ہر جزو کیلئے بھی مفید ہوتا ہے۔ لیکن عافیت عامہ کا دارومدار تبدیلی پر ہے لیکن یہ تبدیلی صرف جزو پر نہیں بلکہ کل مجموعہ کے اوپر بھی طاری ہوتی ہے۔ تو اپنے لئے ان اصولوں کو کافی سمجھ۔ اگر تجھکو ان کی واقعی ضرورت ہے، کتابوں کی تلاش و تشنگی کو ملتوی کر، فکر اس بات کی کر کہ تو مسرت کی موت مرے۔ آہ و زاری سے تیرے لب ملوث نہ ہوں بلکہ صداقت و صمیم قلب سے حمد الٰہی کرتا ہوا تو موت کا خیر مقدم کرے۔

غور اس بات پر کر کہ ان امور کی انجام دہی میں تو نے کتنا توقف کیا ہے۔ اللہ نے اپنے فضل و رحمت کا کتنا زمانہ تجھکو بخشا اور تو غافل رہا۔ اب بالآخر وقت آگیا ہے کہ تو واقف ہوجائے کہ اس عالم کون و مکان کی، جس کا تو صرف ایک جزو ہے، کیا ماہیت ہے؟ وہ کیسی اور کون سی قوت ہے جس کی کارفرمائی سارے عالم پر جاری ہے اور جس کا تو ایک مظہر ہے۔ اس بات کو نہ بھول کہ وقت مقرر و محدود ہے اور اگر تو اس کو تزکیۂ روح کی خاطر استعمال نہ کرے گا تو یہ وقت فوراً گذر جائے گا اور اسی کے ساتھ تو بھی کبھی واپس نہ آئے گا۔

ہر ساعت اس بات کا خیال رکھ کہ ہر کام جس کو تو شروع کرتا ہے اس کو ایسے عزم و قوت کیساتھ کر جو ایک مرد اور ایک رومن کے شایان شان ہے، اس کام کو توجہ، غیر مصنوعی بلندی، انسانیت آزادی اور انصاف کے ساتھ انجام دے۔ اپنے تئیں دوسرے خیالات کی گمراہیوں سے آزاد کر، بلاشبہ تو اپنے کو آزاد کرے گا اگر تو ہر کام کو اس طور سے انجام دیتا ہے کہ گویا یہ کام تیری زندگی کا آخری کام ہے، جس میں بغیر ان خواہشات نفسانی کی گمراہ کن قوت، جو تجھکو عقل کی کارفرمائی کی وجہ سے راہ مستقیم سے نہ ہٹا سکی، مکر و تصنع خود پسندی اور گلہ تقدیر کو کوئی دخل نہیں ہے۔ تجھکو معلوم ہے کہ مسرور اور یزدانی زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کے لئے شاید چند ہی چیزیں درکار ہیں۔ اگر انسان ان چیزوں پر کاربند ہے تو پھر خدا کی طرف سے اور کوئی مطالبہ نہیں ہوگا۔

اے میری روح! تو اپنے کو حقیر بنا دے!! تو خاکسار ہو جا!!! اوج وعروج کا زمانہ گذر گیا۔ انسان صرف ایک ہی زندگی کا حامل ہے تو نے اس کو تقریباً بالکل ختم کر دیا ہے۔ تو نے خود اپنا احترام کیا، ہمیشہ یہی خواب دیکھا کر تیری مسرت دوسروں کی روحوں میں بستی ہے۔

بیگانہ چیزوں کے معرض وجود میں آنے سے تو کیوں پریشان ہوتا ہے؛ نیکی کے کچھ نئے پہلوؤں سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے اپنے لئے فرصت کے اوقات نکال اور پھر اس حلقہ دہ چکر، لامتناہی کو روک دے اور یہاں تجھے خبردار رہنا چاہئے کہ کہیں یہ حلقہ اٹھانہ گھوم جائے کیونکہ دراصل احمق وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی کام کرتے کرتے ختم کر دی لیکن کبھی بھی کوئی مقصد پیش نظر نہ رکھا جو ان کے تمام جذبات بلکہ تمام خیالات کا مرکز و مرجع ہوتا۔

جیسے چاہے تو تلاش کرے، لیکن تجھے بمشکل کوئی ایسا انسان ملے گا جو صرف اس وجہ سے محزون و محروم مسرت ہے کہ وہ دوسرے کا سربستہ راز نہ معلوم کر سکا لیکن وہ شخص لازمی طور سے بدحال ہے جو خود اپنی روح کی جنبش اور راز کو سمجھنے سے عاری ہے۔

تجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ دنیائے عالم کی اور میری فطرت کیا ہے۔ اور کس طرح مؤخر الذکر کا اول الذکر سے تعلق و واسطہ ہے اور کس کل کا یہ کون جزہے۔ اس بات کو نہ بھول کہ تجھکو کوئی بھی کبھی اس کل سے جسکا تو جزہے قولاً و عملاً ہم آہنگ ہونے سے نہیں روک سکتا۔

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب مرزا احسان احمد صاحب وکیل اعظم گڑھ

یہ میکدۂ عشق ہے، غمخانہ نہیں ہے / یاں کام نہیں اسکا جو دیوانہ نہیں ہے
کیفیت دردِ دلِ بے تاب کہوں کیا / اک رازِ حکیمانہ ہے افسانہ نہیں ہے
بیکار ہے اس عرصہ گہہِ عشق میں چلنا / ہر گام پہ جب لغزشِ مستانہ نہیں ہے
مانا کہ ہر اک ذرے میں ہے اس کی تجلی / یوں عام مگر جلوۂ جانانہ نہیں ہے
اس درد سے جو روح کو کر دیتا ہے تازہ / واقف ابھی تیرا دلِ دیوانہ نہیں ہے
بے سود ہے چہرے پہ فروغِ مئے گلفام / گر دل میں تری جرأتِ رندانہ نہیں ہے
وہ اس کو سنیں گے کبھی جب چاہیں سنیں وہ / یہ روح کی فریاد ہے افسانہ نہیں ہے
دکھلاتے ہیں وہ تابشِ شمشیر و سناں کیا / معلوم انھیں ہمتِ دیوانہ نہیں ہے
محفوظ ہے ہر چند قفس برق سے لیکن / ہم سوختہ جانوں کا وہ کاشانہ نہیں ہے
ذروں میں ہے اس کے بھی وہی نور کا عالم / کم شمع سے خاکسترِ پروانہ نہیں ہے
ساقی! نگہِ مست کا بس ایک اشارہ / رندوں کو ترے حاجتِ پیمانہ نہیں ہے
قوت پہ کلیسا کو یہ کیوں ناز ہے اتنا / بیدار حرم کا ابھی دیوانہ نہیں ہے
جھک جائیں مہ و مہر بھی آگے ترے لیکن / لب پر وہ ابھی نعرۂ مستانہ نہیں ہے

ہر چند نظر سے مری جلووں میں ترے گم — جلووں سے مگر اپنے بھی بیگانہ نہیں ہوں

یہ دیر نشیں اہل حرم سے نہیں بڑھ کر — افسوس مگر ہمت مردانہ نہیں ہے

ہم خاک نشینوں کا ہے وہ ذوق تماشا — جو شیفتہ کعبہ و بت خانہ نہیں ہے

اک بار ہے، اک ننگ ہے، مٹنے کے ہی قابل — وہ دل جو تری راہ میں دیوانہ نہیں ہے

لذت کے لیے ذوق تصور ہے یہ کیا کم — گو پیش نظر صورت جانانہ نہیں ہے

رگ رگ میں لیے برق سر طور رہوں بیٹھا — افسوس وہ اب شورش مستانہ نہیں ہے

اک خاک نشیں بندۂ ناچیز ہوں لیکن
ہے کون ادا مجھ میں جو شاہانہ نہیں ہے

کلام بیخود

(از حضرت بیخود دہلوی)

حسرتیں پھر کیوں نگاہوں سے نمایاں ہو گئیں — جب یہ چھریاں دل میں اتریں اور پنہاں ہو گئیں

شوخ نظریں زندگی کا میری ساماں ہو گئیں — بجلیاں امید بنکر دل میں مہماں ہو گئیں

عشق کی نیرنگیاں آخر نمایاں ہو گئیں — آپ کی زلفیں مرا حال پریشاں ہو گئیں

بیادائیں بھی مری وحشت کا ساماں ہو گئیں — نیچی نظریں آپ کی تار گریباں ہو گئیں

شوخیاں جب انکی پردے سے نمایاں ہو گئیں — بجلیاں بنکر یہ چمکیں اور پنہاں ہو گئیں

مسجدوں میں اہل دل ہم کو نظر آتے نہیں — کیا یہ محرابیں بھی یارب طاق نسیاں ہو گئیں

کھولکر زلفیں مری تربت پہ بیٹھا کس نے سر — عالم بالا کی سب روحیں پریشاں ہو گئیں

یہ عروج حسن تھا، یا انقلاب آسماں — مصر کی گلیاں تجلی گاہ کنعاں ہو گئیں

اے فلک وہ نامرادِ آرزو میں ہی تو ہوں
جس کی امیدوں کی صبحیں شامِ ہجراں ہو گئیں

عشق کی تکمیل بھی اک معجزہ ہے عشق کا
ہجر کی بےچینیاں سب راحتِ جاں ہو گئیں

خندہ ہے تمہیدِ گریہ، عیش ہے غم کی دلیل
باغ میں کلیاں کھلیں، کھل کر پریشاں ہو گئیں

تیر ہو کر کیوں نہ ہوتیں سینۂ گردوں کے پار
ضعف سے آہیں ہماری تیری مژگاں ہو گئیں

دونوں عالم میں نہ تھا عشق و محبت سا ادیب
خلد کی حوریں مری صحبت میں انساں ہو گئیں

فصلِ گل نے جوشِ وحشت کو ابھارا اس قدر
کھل کے کلیاں باغ میں سر بگریباں ہو گئیں

حضرت غالب کا مصرعہ ورد اب بیخود کے ہے
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

چاہا انھیں بے دیکھے، شامت ہی کچھ آئی تھی
الفت تو نہ تھی مشکل، دشوار رسائی تھی

اک صبحِ مسرت تھی، جو شامِ جدائی تھی
یہ اس کے تصور کی، اعجاز نمائی تھی

کل اپنے فدائی کی، تربت جو مٹائی تھی
گردن تو اٹھا ظالم، کچھ شرم بھی آئی تھی

دل اس سے سوا ضدی، ہم مفت برے بنتے
دم بھر میں صفائی تھی، دم بھر میں لڑائی تھی

وہ جس سے ملے جا کر، جو ان سے ملا آ کر
میری ہی شکایت تھی، میری ہی برائی تھی

تربت میں بھی کہتا تھا، جنت میں بھی کہتا ہوں
اللہ نے اس بت کی، کیا شکل بنائی تھی

لڑنا تھا اگر مجھ سے، خلوت میں لڑے ہوتے
محفل میں جو تم بگڑے، دشمن کی بن آئی تھی

پامال مجھے کر کے، کیا فخر جتاتے ہو
تم یاد کرو دل میں، ٹھوکر بھی تو کھائی تھی

اس سے تمہیں کیا مطلب ہم تم کو دکھائیں کیوں
تصویر کسی کی ہے، کل راہ سے پائی تھی

تحریکِ ستم ہوتی، تقصیرِ تبسم ہوتی
اک بار بگڑ بیٹھے کیا جی میں سمائی تھی

بیخود ہی رہا بیخود جب تک نہ جیا بیخود
ساقی سے کوئی پوچھے، کیا چیز پلائی تھی

تلخیص و ترجمہ

قوتِ ارادی کی تربیت

مشہور مفکر اور ادیب و شاعر جارج پولٹے (Georges Poltier) نے مندرجہ صدر عنوان پر ایک نہایت اہم تصنیف لکھی ہے، جس کو اس کی تمام زندگی کی تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ سمجھنا چاہئے۔ ہم ذیل میں کتاب کے بعض بنیادی مباحث کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔ اور امیدوار ہیں کہ قارئین الاصلاح ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

انسانی تمدن کی بنیاد درحقیقت اس کشمکش کے نتائج پر قائم ہے جو انسان کی عقل اور اس کی خواہشوں اور جذبات کے درمیان جاری ہے۔ اگر ایک انسان نے اپنی خواہشوں کو دبا لیا، اپنے جذبات و شہوات کو مغلوب کر لیا اور اس مادی دنیا کی مادی تمناؤں سے اپنے آپ کو الگ کر کے عالم فکر و روح کی بلندیوں پر پہنچا دیا تو بس اس کی انسانیت ترقی کر گئی، اس کے تمام احساسات سنور گئے، اور وہ اندھی اور بہری حیوانیت کی تنگنائے سے نکل کر حقیقت و معنی کی کھوئی فضا کی ناپیدا کنار وسعتوں میں پہنچ گیا۔

لیکن یہ رتبہ انسان کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اپنی قوت ارادی کے ذریعہ سے۔ قوت ارادی اپنے نہایت وسیع مفہوم میں۔

ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں اس کی ہر چیز ہم کو لذت، تعیش اور بے فکری اور بے پروائی کی دعوت دے رہی ہے لیکن اگر ہم ان رغبتوں کے فریب میں پھنس کر اپنے نفس کو اس کی خواہشوں اور جذبات کے بہاؤ پر چھوڑ دیں اور طبیعت کا زور جس سمت کو لیجا رہا ہے ادھر بہتے چلے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ ہم میں عزت نفس کا احساس کمزور پڑ جائے گا، ہماری معنوی طاقتیں مضمحل ہو جائیں گی، اور ہم ان فرائض کے ادا کرنے سے کیقلم قاصر

ہو جائیں گے جو سوسائٹی کی طرف سے ہم پر عائد ہوتے ہیں اور جو تغیر اور تمدن کی فطرت ہم پر واجب کرتی ہے۔

ان حالات کے اندر ایک شخص کے لئے صرف دو ہی راہیں ہیں۔

یا تو اپنے عادات و اخلاق، اپنی زندگی کے معیار اور اپنے فکر و نظر کی باگ بالکل اپنی طبیعت کے حوالہ کر دے اور متمدن دنیا اور تغیر پذیر سوسائٹی سے اپنے رشتے کاٹ کر اس سرگرم کار اور مشغول جد و جہد عالم انسانی سے بالکل علحدہ زندگی بسر کرے یا پھر یہ کرے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی طبیعت کے میلانات و رجحانات کو مغلوب کر کے ان طاقتوں کے ساتھ شرکتِ عمل کرے جو بھلائی کی راہوں میں سرگرم ہیں اور اپنی زندگی ان پائدار کاموں میں صرف کرے جن سے فرد و سماج دونوں کو یکساں طور پر نفع پہنچے۔

اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ انسان جو جد و جہد اپنی انسانیت کی ترقی اور عناصر ضعف و انحطاط کی مقاومت کے لئے کرتا ہے اس میں اصلی عامل اس کا ارادہ ہوتا ہے۔ آجتک انسان نے جتنی کوششیں ایسی کی ہیں جن سے تہذیب و تمدن کو فروغ ہوا ہے، علوم و فنون نے ترقی کی ہے یا جن کی مدد سے انسان غاروں کی تاریک اور وحشیانہ زندگی سے نکل کر علم و معرفت کی شہری فضا میں آیا ہے، اگر غور کیجئے تو ان تمام کوششوں کا سرچشمہ صرف انسان کا ارادہ رہا ہے یعنی انسان کی وہ مخفی لیکن جبروتی طاقت جو ضعف و اضمحلال کی تمام نجاستوں کو اس کے جسم سے دھو دیتی ہے اور بالآخر عقل اور شہوات کے ہولناک معرکہ میں اس کو فتحمند بناتی ہے۔

پس عقل ہی وہ چیز ہے جو انسان کے سامنے اس کی بھلائی اور ترقی کی راہیں کھولتی ہے لیکن عقل کی سیادت تمام تر انسان کی قوت ارادی پر منحصر ہے اور قوت ارادی کو پوری طرح وجود میں لانے کے لئے ایک خاص انداز کی تربیت و ممارست ناگزیر ہے۔ یہ راہ نہایت کٹھن ہے۔ اس کو طے کرنے کے لئے صرف زبان سے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ میں اپنی عقل کو غالب اور اپنی شہوات کو

مغلوب کرنا چاہتا ہوں، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ایک عملی نقشہ مرتب کرکے اس کے مطابق اپنی زندگی کی تعلیم و تربیت کرے تاکہ اس کا مقصد حاصل ہو سکے۔

انسانی زندگی کی تمام کامیابیوں کی کلید صرف قوت ارادی کی صحیح تربیت ہے۔ اہل مغرب نے بہت سی باتوں میں مشرقیوں کے مقابل میں ترجیح حاصل کرلی اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کا طریقۂ زندگی مشرقیوں کے طریق زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی زندگی غفلت اور ترک اور تیاگ کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ ان کی روزمرہ زندگی کا ایک مخصوص ضابطہ ہے جس سے ان کی قوت ارادی برابر بڑھتی رہتی ہے اور جذبات و شہوات پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔

قوتِ ارادی کی تربیت کے بعض قواعد

مصنف کتاب کا خیال ہے کہ قوت ارادی کی تربیت کے ایسے ضوابط و قواعد بنائے جاسکتے ہیں جو ہر انسان کے لئے یکساں مفید ہوں اور جنکی پیروی کرکے ہر آدمی اپنی انسانیت کو ترقی دے سکتا ہے اور ان تمام فرائض کو حسن و خوبی انجام دینے کی صلاحیت پیدا کرسکتا ہے جو اس پر بحیثیت ایک مہذب شہری کے عائد ہوتے ہیں۔ ہم ذیل میں ان قواعد کو بالاختصار بیان کرتے ہیں۔

(۱) وقت کی صحیح قدر و قیمت پہچانی چاہئے۔ اس طرح کہ اس کی اہمیت ہمارے نفس اور احساس پر پوری طرح چھا جائے۔ ایک سکنڈ بھی ہم ضایع نہ کریں اور نہ اپنی عمر عزیز کا ایک لمحہ کسی لا حاصل کام میں برباد کریں۔

(۲) نہایت واضح اور غیر مشتبہ طور پر اپنی زندگی کا مقصد متعین کرلینا چاہئے۔ اور یہ بھی سوچ لینا چاہئے کہ یہ مقصد ہماری طبعی استعداد اور ہمارے حالات سے موافق ہے یا نہیں؟ اس کو ٹھیک ٹھیک متعین کرنے کے لئے ہمارا فرض ہے کہ اس چیز پر ہم بار بار خود بھی غور کرتے رہیں اور اپنے بارہ میں دوسروں کی

رہیں بھی معلوم کرتے رہیں تاکہ ہمارے سامنے اپنی شخصیت کے متعلق ایک صحیح تصور بے نقاب ہو جائے اور وہ گول بالکل نمایاں ہو جائے جہاں تک ہم کو پہنچنا ہے۔

(۳) اپنی شخصیت کے صحیح ادراک اور ایک مخصوص مقصد کی تعین کے بعد چاہئے کہ اس کو عمل میں لانے کیلئے ہم ایک صحیح نقشۂ عمل مرتب کرلیں۔

(۴) اس نقشۂ عمل کے چند اہم عناصر یہ ہوں گے، تقسیم عمل، تقسیم اوقات، اوقات ورزش۔ اوقات تفریح۔

(۵) ضروری ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اس نقشۂ عمل سے روگردانی پر مجبور نہ کرسکے۔ کام کے وقت صرف کام اور تفریح و ورزش کے وقت صرف تفریح و ورزش۔

(۶) نقشۂ عمل کے ساتھ انسان کو بالکل بندھ جانا چاہئے۔ اس کی تعمیل میں صرف اسی وقت کوتاہی ہو جب کوئی شدید بیماری آدمی کو عاجز کردے۔

(۷) ورزش جسمانی سے کبھی غفلت نہیں کرنی چاہئے، یہ چیز قوتِ ارادی کی تربیت کرتی ہے، قویٰ میں حرکت پیدا کرتی ہے، جسم کو نشاط بخشتی ہے، روح پر صحت، اور مسرت کی کیفیات طاری کرتی ہے جس سے کام کی تکان نہیں محسوس ہوتی۔

(۸) تفریح بالکل معدوم ہونی چاہئے۔ ناجائز تفریح، وقت کو برباد کرتی ہے، جسم کو ضعیف کرتی ہے، عقل کو کمزور کرتی ہے، اور ہمارے تمام کاموں پر ایک ضرر رساں اثر ڈالتی ہے۔

(۹) ہم کو اس بات پر یقین رکھنا چاہئے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مدد سے سب کچھ کرسکتا ہے۔ مشکلیں کتنی کٹھن ہوں لیکن انسان صبر و استقلال اور شجاعت و قربانی کے ذریعہ ان پر فتح پا سکتا ہے۔

(۱۰) شہوات و لذات کو ہمیشہ حقیر سمجھنا چاہئے اور اس امر پر یقین رکھنا چاہئے کہ کام کی لذت اصلی لذت ہے اور جہاد کا مزہ سب سے زیادہ شیریں ہے۔ اور واقعہ ہے کہ جب تم بھی کسی مخصوص نظامِ عمل کی پابندی کے خوگر ہو جاؤ گے تو تمہیں آپ سے آپ یہ محسوس ہونے لگے گا کہ درحقیقت عمل کی لذت سے بڑھکر کوئی لذت نہیں ہے۔

(۱۱) اگر تم اس راہ پر چل پڑے تو پھر تمہیں اس بات سے مایوس نہ ہونا چاہئے کہ جس کام کا تم نے بیڑا اٹھایا ابھی تمہاری خواہش کے مطابق حاصل نہیں ہوا۔ کسی چیز کو خواہش اور معیار کے مطابق حاصل کرنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور مسلسل جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ علامہ بوفون نے لکھا ہے کہ "عبقریت ایک صبر طویل کا نام ہے۔"

(۱۲) ہم کو اس بات کا راسخ یقین رکھنا چاہئے کہ ہم میں سے ہر فرد کے اندر ایک عظیم الشان شخصیت پنہاں ہے اور یہ شخصیت نہایت آسانی سے نمایاں ہو جا سکتی ہیں بشرطیکہ مذکورہ بالا شرائط اس کے اندر مجتمع ہو جائیں اور اپنی قوت ارادی کی تربیت پر وہ قادر ہو سکے۔

قوتِ ارادی کی چند قابل تقلید مثالیں

یہ چند اصول ہیں جن کی مؤلف کتاب نے نصیحت کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید اور ممکن العمل ہیں۔ مولف نے اپنے دعویٰ کو مضبوط کرنے کے لئے قوتِ ارادی کی بعض قابل تقلید مثالیں بھی ذکر کی ہیں جن میں سے بعض ہم بیان کرتے ہیں۔

مشہور ایطالوی شاعر ڈانونسر یو نے اپنے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھنے کے لئے جو وقت متعین کر لیا تھا اس کی ہمیشہ پابندی کی، زندگی بھر میں صرف چار مرتبہ اس کی خلاف ورزی ہوئی۔ بلزاک نے جب اپنا ایک مشہور قصہ لکھنا چاہا تو کامل تین مہینوں تک اپنے کتبخانہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ وولیٹر دن میں دس گھنٹے برابر کام کرتا تھا اور اس نے کبھی اس اصول کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ مشہور انگریزی ناول نگار ٹوماس ہارڈی نے اپنے لکھنے مطالعہ کرنے، پولو کھیلنے، تھیٹر دیکھنے کے لئے روزانہ جو اوقات متعین کر لئے تھے ان کی زندگی بھر پابندی کی۔ تقسیم اوقات اور وقت کی قدر شناسی کے باب میں نپولین کی عبقریت ضرب المثل ہے۔ باسٹور سخت سے سخت محنت شاقہ کو لذیذ سے لذیذ مشغلہ سمجھتا اور کام جتنا بڑھتا اتنا ہی وہ اس سے محظوظ ہوتا۔ امیل زولا کا یہ حال تھا کہ کیسی ہی تقریب ہو، کیسی ہی شاندار دعوت ہو کیسا ہی اہم اور عظیم الشان جلسہ ہو اس میں کبھی شرکت

نہ کرتا۔ اس نے ۸ بجے صبح سے ۸ بجے شام تک کیلئے اپنا نقشہ عمل مرتب کر لیا تھا اور اس کی خلاف ورزی پر قادر نہیں تھا۔ اگر اس کی زندگی کے ان مقدس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ بھی کبھی ضایع ہو جاتا تو وہ اس پر غم مناتا اور بسا اوقات روتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ بڑوں کی قوت ارادی میں کسی قدر اسراف کی نمود ہوتی ہے اور یہ بات ان کی بڑائی کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ ہم چاہیں تو ان کی اس چیز سے بچکر ان کی زندگی سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی دکھائی ہوئی روشنی میں کمال و ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں لیکن ایک دن آئے گا جب اسراف کی یہی حالت ہم پر بھی طاری ہوجائیگی، کیونکہ جب ہم حقیقۃً بڑائی کا درجہ حاصل کر لیں گے تو قدرتی طور پر ہماری یہ خواہش ہوگی کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ پیش نظر مقصد کی خدمت ہی میں صرف ہو۔ بہرحال ان بڑوں کی زندگی ہمارے لئے ایک بہترین مثال ہے۔ ہم ان سے سیکھ سکتے ہیں کہ انسان کو کس طرح بلند ہمت اور ثابت قدم رہنا چاہیئے، کس طرح ارادہ کرنا چاہیئے اور کس طرح اپنے اس ارادہ کو پورا کرنا چاہیئے۔ کس طرح اپنے نفس پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور کس باریک بینی کے ساتھ اپنے اوقات کی تنظیم کرنی چاہیئے۔

اور اس امر سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان کے یہی وہ صفات ہیں جن پر اس کے عروج و ترقی کے تمام کمالات کا انحصار ہے!۔

نیچر برابر حرکت اور ایجاد و تخلیق میں سرگرم ہے۔ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی ایک ارادہ ہے۔ ایک عظیم الشان ارادہ! جبار و قہار! نہ کبھی ٹھہرتا نہ کبھی تھکتا۔ اس کا عمل ہر آن جاری اور اس کی صنعت گری ہر آن موجزن! پس نیچر اور خدا کا قانون ایک ہی ہے۔ ہر آن خلق و ایجاد کی سرگرمی اور ابداع و تخلیق کی کارفرمائی! پس ضروری ہے کہ انسان کا بھی یہی دستور ہو۔ ورنہ وہ اپنی اصل سے الگ اور اپنے خالق کا منکر ہو جائے گا۔

جو انسان اپنے اندر قوت ارادی پیدا کر لیتا ہے۔ جوں جوں اس کی قدرت عمل و تخلیق بڑھتی جاتی ہے اس کی راہ نیچر کی راہ سے قریب ہوتی جاتی ہے اور خدا سے اس کی قربت زیادہ ہوتی جاتی ہے، کیونکہ اب اس کے اندر اس کائنات کے قوانین سے مطابقت کی خواہش زیادہ ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مذہب کے اندر ایک خاص کیفیت و حالت کا نام صوفیت ہے اسی طرح اس دنیائے عمل کے اندر بھی ایک مقام اور حالت ہے جس کو صوفیت کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں یعنی کام کے لئے اقدام، کام کی محبت، کام کیلئے جوش طلب اور سرگرمی، اسکے ترتیب و تنظیم کا ولولہ۔ یہ تمام امور ایک مخصوص قسم کی عبادت کے روحانی شعائر ہیں، جو بالآخر اس ذات کی طرف لوٹتے ہیں جو اس کائنات میں عامل اول ہے یعنی ذاتِ خداوندی!

ہمارے اس دعویٰ پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ کاہل اور آرام پسند ہیں اور کائنات کے اس راز سے واقف نہیں ہیں، لازمی طور پر نیچر ان سے انتقام لیتی ہے اور زندگی کی معرکہ گاہ میں ان کو اول تو ذلیل و خوار کرتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ پیس کے بالکل فنا کر دیتی ہے۔

تقریظ و تبصرہ

اسلام اور موجودہ مدنی مسائل - از جناب مولانا حکیم محمد عبدالرؤف صاحب دانا پوری۔ صفحات ۴۸، کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت عمدہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت ۴/

جامعہ ملیہ کے عمدہ کاموں میں سے ایک نہایت مفید کام یہ ہے کہ ہمیشہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے اکابر علم و سیاست کو اپنے یہاں بلا کر ان کے خطبات کا انتظام کرتی ہے اور پھر بغرض افادہ عام ان خطبات کو چھاپ کر شائع کر دیتی ہے۔ یہ خطبہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ہم نے جا بجا سے اس کو دیکھا۔ شروع میں مولف نے بعض تمہیدی امور کی طرف اشارات کئے ہیں جنہیں غیر ضروری اطناب ہے اور بعض باتیں بالکل غیر متعلق ہو گئی ہیں۔ صفحہ ۱۲ سے اصل بحث کا آغاز ہوتا ہے اور حضرت مولف انبیاء کرام کی تعلیمات کی عقلی حیثیت کی توضیح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں

"انبیاء کرام نے فرمایا کہ روحانیت کے عالم کو انسان حواس اور عقل کے ذریعہ سے نہیں جان سکتا۔"

کس طرح جان سکتا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"انبیاء کرام کے بتائے ہوئے قواعد پر عمل کرنے سے ایسا حس پیدا ہو سکتا ہے جس سے انسان روحانیات کا احساس کر سکے...... مثلاً وجدان، کشف، الہام وغیرہ۔"

مصنف کے ان الفاظ پر غور کرنے سے ایک طالب علم کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ "روحانیت کے عالم" سے مولانا کا کیا مطلب ہے؟ اس کے حدود کہاں تک ہیں؟ اس کا تعلق محض عالم غیب کے روحانی اور غیر مرئی اسرار و امور ہی سے ہے یا شرایع و عبادات اور عقائد و معاملات سب اس کی

جہانگیری میں داخل ہیں؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "جان سکنا" کے کیا معنی ہیں؟ کسی شئی کا اجمالی فہم اور اصولی اذعان و اعتقاد۔ یا اُس کی تمام جزئیات و تفصیلات کی حقیقت و ماہیت پر پورا عبور۔

پہلے سوال کا جواب مولف کے مندرجہ ذیل الفاظ سے نکلتا ہے۔

"تخلیق عالم کی کیفیت، توحید کا مسئلہ، روحانیات کا حال، عالم ارواح کی تفصیل، عذاب قبر، حشر و نشر کی کیفیت......" اس سے معلوم ہوا کہ توحید وغیرہ کے مسائل یعنی عقائد بھی ان "روحانیات" میں داخل ہیں جن کو عقل انسانی نہیں سمجھ سکتی۔ بلکہ ایک قدم اس سے بھی آگے بڑھکر تمام عبادات بھی انہی روحانیات کے حکم میں داخل ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۴۳ پر مصنف تحریر فرماتے ہیں "میری ان گذارشات سے واضح ہو گیا کہ مذہبی تعلیمات کی دو قسمیں عقائد اور عبادات عقلی حدود سے باہر ہیں۔ ...... ان پر دلائل عقلی طلب کرنا، یا ان تعلیمات کا انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسا ایک پیدائشی اندھا، ماہتاب اور ستاروں کے وجود سے انکار کرے"۔

مصنف کے نقطہ خیال کی پوری توضیح ان کے الفاظ ذیل سے ہو جاتی ہے:۔

"ایمان بالغیب کا یہی مطلب ہے کہ انبیاء کرام نے عقائد، روحانیات، الٰہیات کے متعلق جو باتیں بتائی ہیں اس کو بلا دلیل قبول کر لیا جائے، حسی یا عقلی دلائل کے ذریعہ نہ انبیاء کی تصدیق کیجا سکتی ہے، نہ تکذیب اس لئے کہ حس اور عقل کے ذریعہ ان چیزوں کا حال کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا جس کی وہ تعلیم دیتے ہیں اور اگر کچھ معلوم ہو سکتا ہے تو وہ بھی اسی طرح کہ انہی کے بتائے ہوئے طریقہ سے روحانی حس پیدا کیا جائے۔ بلا شبہ جس کو یہ حس حاصل ہو جاتا ہے اس کا ایمان علی وجہ البصیرۃ اور کالمعاینہ ہوتا ہے" یعنی علی وجہ البصیرۃ ایمان کی صرف یہ شکل ہے کہ آدمی صاحب کشف و الہام ہو۔ والا فلا۔

"جان سکنے" کی پوری تشریح مصنف نے نہیں کی ہے۔ ان کے بعض بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "جان سکنے" کے معنی ان کے نزدیک یہ ہیں کہ ایک شئے کی پوری حقیقت و ماہیت اور اس کے تمام کنہ و سر کو پالینا۔ اور بعض جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شئے کا اجمالی فہم و ادراک جو اس کے اذعان و اعتقاد کے لئے کافی ہو۔

وہ بھی اس "جان سکنے" میں داخل ہے۔ اگر پہلے کی نفی ہے تو بعض اعتبارات سے یہ بات صحیح ہے اور اگر دوسرے کی نفی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم خدا اور معاد کو محض اس لئے مانتے ہیں کہ ہماری مذہبی کتاب میں ایسا لکھا ہوا ہے۔ ان کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور عبادات و عقائد کی قسم کی تمام باتیں ہم بلا دلیل قبول کرتے ہیں اس لئے کہ حس و عقل کے ذریعہ ان چیزوں کا حال کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ صرف ارباب کشف و الہام بتا سکتے ہیں کہ نماز میں کوئی حکمت و دانش کی بات ہے اور روزہ اچھی چیز ہے۔ و قلیل ما ہم

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ جب ان باتوں کے حسن و قبح کو سمجھنے کا معیار ہماری عقل نہیں ہو تو آخر ہم نے کیوں ان کو باور کیا؟ مصنف اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس لئے کہ پیغمبر نے کہا۔ پھر یہی سوال پیغمبر کے متعلق پیدا ہوا کہ آپ نے پیغمبر کو کیوں مانا؟ اس کا جواب مولف علام یہ دیتے ہیں کہ اس لئے کہ انھوں نے معجزے دکھلائے، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں: "کسی شخص کا بیان کتنا ہی مدلل اور کتنا ہی عاقلانہ ہو یہ اس کی نبوت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔۔ اس لئے انبیاء صادقین اور حضرات مرسلین سے وہ باتیں صادر ہوئی ہیں جن کے علل و اسباب روحانی ہوتے ہیں، ان کا کوئی مادی سبب نہیں ہوتا اور وہ باتیں خارق عادت ہوتی ہیں انہی باتوں کو اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔"

اس کے بعد مصنف نے معجزہ، کرامت، اور شعبدہ وغیرہ کے فروق و امتیازات کی بحث شروع کر دی ہے۔ جہاں تک کہ عقائد و عبادات اسلام کی عقلی حیثیت کا تعلق ہے مصنف کے بحث و نظر کا پورا خاکہ ہم نے قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس پر کسی نقد و نظر کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں نے علم کلام کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے متکلمین بالخصوص اشاعرہ کا عام مسلک یہی ہے اور اسی کو بغیر کسی تحشیہ و آرائش اور نقد و تبصرہ کے مصنف نے اس مقالہ میں پیش کر دیا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے معاملات کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ معاملات کو ان باتوں میں سمجھتے ہیں جو عقل کی گرفت میں آسکتی ہیں چنانچہ انھوں نے نظام حکومت، اقتصادیات

سرمایہ داری اور غربت، ربوا، غلامی وغیرہ جیسے اہم مسائل پر عقلی اور شرعی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض مفید باتیں فرمائی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم بغیر کسی دلیل و برہان کے خدا، رسول توحید، معاد، لوح، کرسی، فرشتے، جنت، دوزخ، روزہ، نماز وغیرہ صدہا چیزیں مانتے ہیں تو انہی کے ساتھ اگر بغیر کسی دلیل عقلی کے چند باتیں اور مان لیں تو کون سی قباحت لازم آجائیگی۔ سود حرام ہے اور غلامی جائز اور اگر اس پر کوئی شخص دلیل مانگتا ہے تو کہدیجئے "مادرزاد اندھے کو حق نہیں ہے کہ سورج اور چاند کے وجود پر دلیل مانگے"۔

معاملات پر مولانا نے جو کچھ لکھا ہے ہم مومنین بالغیب کیلئے تو ان کی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت ان لوگوں کیلئے تھی جن کے علم و اعتقاد کو وقت کے جدید رجحانات و افکار نے بالکل متزلزل کر دیا ہے۔ مگر ہم کو شبہ ہے کہ ان کو ان تشنہ مباحث سے یقین و طمانیت کی کوئی ٹھنڈک مل سکے گی۔ عنوانات نہایت اہم ہیں اور ان سب پر دنیا مذہب کے نقطۂ نظر کو سمجھنا چاہتی ہے لیکن لوگوں کے شبہات اور شبہات کے ساتھ ان کے دلائل نہایت الجھے ہوئے ہیں اور سخت ضرورت ہے کہ ہمارے ارباب علم اب ان چیزوں کا گہرا مطالعہ کریں اور ان پر عالمانہ تنقیدیں لکھیں۔

اصولی مباحث کے علاوہ بہت سی ضمنی باتیں بھی اس کتاب میں ایسی ملتی ہیں جو قابل غور ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ہے "مال کو حیات دنیا کی زینت کہا ہے"۔ بلاشبہ کہا ہے لیکن غالباً تعریف کے موقع پر نہیں کہا ہے۔ "سرمایہ داری کو خدا کا فضل بتایا ہے"۔ سرمایہ داری ایک حدیث العہد اصطلاح ہے۔ جس کو علی الاطلاق کہیں بھی خدا کا فضل نہیں کہا گیا ہے۔ خدا کا فضل مال اور رزق ہے وشتان بینہما۔ مسلمانوں کے اختلافات کے متعلق یہ حسن ظن بھی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ "مسلمانوں میں مذہبی اختلافات بہت ہیں مگر ان اختلافات سے منافرت پیدا نہیں ہوتی"۔ ایک جگہ ہے "اسلام نے نہ حقیقی مساوات کی تعلیم دی ہے نہ اس کو قبول کیا اور جائز رکھا"۔

ان باتوں کے باوجود ہم کارکنان جامعہ کے شکر گذار ہیں کہ ان کی کوششوں سے یہ مفید کتاب وجود میں آئی۔

مقدمہ تاریخ ہند قدیم جلد اول ۔ مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۴۰۰ صفحے، کتابت

وطباعت متوسط۔ کاغذ معمولی۔ قیمت ۸؎۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ عبرت نجیب آباد۔ یو۔ پی۔

مولانا اکبر شاہ خاں صاحب کی یہ مفید کتاب ہم نے جگہ جگہ سے پڑھی۔ اس کتاب میں نہ صرف ہند قدیم کے ہر طرح کے تاریخی واقعات کو یکجا کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بلکہ ان واقعات کی روشنی میں فلسفہ تاریخ پر نہایت عمدہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ انسانی آفرینش۔ قوموں کے نسلی امتزاج ان کے طریق تمدن وطرز معاشرت۔ ان کی اخلاقی تگ وتاز، ان کے روحانی وعلمی ارتقاء اور ان کی مختلف تقسیمات پر نہایت ہی عالمانہ وفلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ پھر ہندوستان کے قدیم باشندوں کے علوم وفنون۔ ان کی مذہبی کتابوں، ان کی زبان، ان کے رسم الخط، ان کے اخلاقی ومعاشرتی قوانین، ان کے روحانی ومذہبی تخیل۔ ان کے سیاسی نظام اور ان کی جنگی روایات پر قدیم ہندوستانی وغیر ہندوستانی مورخین کی شہادتوں سے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ ہند قدیم کے جغرافی حالات سے کہیں بحث نہیں کی گئی ہے حالانکہ کسی ملک کے جغرافی اثرات کو اس ملک کے باشندوں کے دماغی نشوونما، سیاسی عروج اور علمی واخلاقی ارتقاء میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور یہی بحث دراصل فلسفہ تاریخ کی جان ہے۔ تاہم کتاب اس قابل ہے کہ اس سے قدیم ہندوستان کی تاریخ کے سمجھنے میں بڑی مدد لیجا سکتی ہے۔

نظام سلطنت۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۴۲۴ صفحات کتابت وطباعت نہایت ستھری کاغذ سفید دبیز قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ عبرت نجیب آباد۔ یو۔ پی۔

اس کتاب کو مصنف نے اپنی مقدم الذکر کتاب کا دوسرا حصہ قرار دیا ہے۔ شروع میں تقریباً ۸۰ صفحات تک ہستی باری تعالیٰ، عقل انسانی، وحی والہام، رسالت ونبوت، جزاء وسزا، ضرورت مذہب دین فطرت، مذہب وتمدن کے ارتقاء، اختلاف مذاہب، انسانی ارادہ واختیار، مذہب وتمدن کے باہمی تعلق، انسان اور قوانین قدرت، قوانین تمدن اور انسان، الٰہی وغیر الٰہی حکومت کے فرق انسانی آزادی، اور قوانین سلطنت سے فطرت انسانی کے لگاؤ۔ جیسے دقیق مباحث کو مبادی سیاست کی

حیثیت سے نہایت آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دنیا کی اکثر مشہور حکومتوں کے نظام حکومت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے قوانین، مصر قدیم کے قوانین، رومن حکومت اسپارٹا کے آئین، لیکرگس کی اصلاحات، افلاطون کے نظریہ جمہوریت، ارسطو کے فلسفہ ریاست، ایران قدیم کے نظام اخلاق و قوانین تمدن، نوشیروان کے نظام عدل، چینی طرز سیاست، کنفوشس کی سیاسی و اخلاقی تعلیمات، ہندوستان کے قدیم آئین سلطنت، منو مہاراج کے اصول، چانکیہ برہمن، اور مہاراجہ اشوک کے دستور اخلاق، اسلامی طریق سیاست اور اس کے نظام اخلاق کو جامعیت اور صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ضمناً وقت کے مروجہ مباحث بھی آگئے ہیں۔ مثلاً حریت و استبداد کا فرق، قومیت و وطنیت کی حقیقت، ملکیت و دولت، محنت و مزدوری، سرمایہ داری و سود خواری، آبا پرستی، سلطنت و وراثت وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں اسلامی نظام کے تمام جزئیات کی تشریح کی گئی ہے۔ اور اس انداز سے کہ اسلامی نظام کی برتری بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب اپنے موضوع کی وسعت کے لحاظ سے نہایت جامع اور قابل قدر ہے۔ ملک کو مصنف کا شکر گذار ہونا چاہیئے اور اس کتاب کی قدر کرنی چاہیئے۔

مضامین رشید۔ مصنفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۲۲ صفحے کتابت و طباعت بہتر، کاغذ عمدہ جلد نظر فریب۔ قیمت ۸/ ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

یہ کتاب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اٹھارہ مزاحیہ و طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً ملک کے مشہور ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ رشید صاحب اور ان کے مضامین دونوں اب ملک میں اتنی شہرت حاصل کر چکے ہیں کہ انکی تعریف و تعارف میں کچھ لکھنا قارئین کا وقت ضائع کرنا ہے۔ جو لوگ ادبی چیزوں سے ذوق رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو پڑھیں۔ اس سے ایک طرف مکتبہ جامعہ کو فائدہ پہنچے گا اور دوسری طرف پڑھنے والے کے ذوق کی اصلاح کے لئے یہ اکسیر ہے۔ اردو میں جو لوگ مزاحیہ یا طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں ہم کو نہیں معلوم کہ ان میں سے کسی کی چیزیں پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں، مگر رشید صاحب کی ایک ایک سطر پڑھنے کے قابل ہوتی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۹۰۲

دائرۂ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت کتاب الٰہی کی خدمت و اعانت ہے۔ اسکی اعانت کی تین صورتیں ہیں

۱۔ جو حضرات سو روپئے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہوں گے۔ ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپئے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شائع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھکر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ ایڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپئے۔ بیرون ہند کے لئے پانچ روپئے۔ فی پرچہ چھ آنے

عبدالاحد اصلاحی   منیجر دائرہ حمیدیہ   مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

عبدالاحد طابع و ناشر نے اصلاح پریس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں چھاپ کر شائع کیا